فقہائے ہند

جلد چہارم — حصّہ دوم

گیارھویں صدی ہجری

محمّد اسحاق بھٹی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیّہ

یہ ''فقہائے ہند'' جلد چہارم کا حصہ دوم ہے جو گیارھویں صدی ہجری کے 176 فقہائے کرام اور علمائے عظام کے حالات و سوانح پر مشتمل اور ان کی علمی، فقہی اور تصنیفی کاوشوں کو محیط ہے۔ یہ عہد بر صغیر کے تین عظیم الشان بادشاہوں کا عہد ہے جسے تاریخ میں جلال الدین اکبر، نورالدین محمد جہانگیر اور شہاب الدین محمد شاہ جہان کے عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علمی لحاظ سے یہ نہایت پُر ثروت اور زرخیز زمانہ ہے۔ بعض فقہائے کرام تھوڑا بہت ان تینوں بادشاہوں کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کتاب کے حصۂ اول کے مقدمے میں شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دینی و فکری رجحانات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ حصۂ دوم کے مقدمے میں اختصار کے ساتھ نورالدین محمد جہانگیر اور شہاب الدین محمد شاہ جہان کے عہد کا تعارف کرایا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ 'دودمانِ مغلیہ کے یہ حکمران علم و علما سے کس درجہ ربط و تعلق رکھتے تھے اور پھر خود ان کی اپنی کتابِ حیات کس انداز و اسلوب کی ترجمان تھی۔

25.00 روپے

فقہائے ہند

جلد چہارم - حصہ دوم

گیارھویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ، لاہور

بار اوّل	..	..	..	۱۹۷۸ء
تعداد	..	..	..	۱۱۰۰
مطبع	..	..		فالکن پریس، لاہور
ناشر	..	..		محمد اشرف ڈار (معتمد)

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

فہرست مضامین

جہاں گیر

غ

ف

ق

ل

م

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مقدّمہ

اللہ عزوجل کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کی نصرت و توفیق سے "فقہائے ہند" کی جلد چہارم کا حصّہ دوم معزز قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں گیارھویں صدی ہجری کے ایک سو چھیتر (۱۷۶) فقہائے عظام اور علمائے کرام کے حالات و سوانح مندرج ہیں — اس کتاب کے حصہ اول کے مقدمے میں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے بارے میں وہ معلومات درج کیے گئے ہیں جو ہمارے موضوع سے مطابقت رکھتے تھے۔ اب حصۂ دوم کے مقدمے میں جہانگیر اور شاہ جہان کی زندگی کے دینی اور علمی پہلوؤں کی وضاحت کرنا اور یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ دونوں بادشاہانِ ہند علما سے کس قدر روابط رکھتے تھے اور اپنے دور کے اصحابِ علم اور اربابِ فقہ کو کس درجہ اپنی محبت و الفت کا مستحق گردانتے تھے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گیارھویں صدی ہجری میں دودمانِ مغلیہ کے یکے بعد دیگرے تین عظیم الشان حکمران تختِ ہند پر جلوہ افروز ہوئے — ایک جلال الدین محمد اکبر، جو ۹۶۳ھ سے ۱۰۱۴ھ تک اکاون (۵۱) سال دادِ حکمرانی دیتا رہا۔ دوسرے نورالدین محمد جہاں گیر، جس نے ۱۰۱۴ھ سے ۱۰۳۷ھ تک بائیس (۲۲) سال ارضِ ہند پر حکومت کی۔ تیسرے شہاب الدین محمد شاہ جہان، جو ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۶۸ھ تک اکتیس (۳۱) سال تختِ فرماں روائی پر متمکن رہا۔ یہ عرصہ ایک سو چار (۱۰۴) سال کو محیط ہے۔ علمی اعتبار سے یہ ہندوستان کا نہایت ترقی یافتہ دور ہے۔ اس دور میں علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت نے ارتقا کی بہت سی نئی منزلیں طے کیں، فہم و ادراک کے قافلے جدید راہوں کی

تلاش میں نکلے اور علما کی کثیر تعداد نے گلستانِ علم کی آبیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان میں بعض وہ علمائے کرام بھی ہیں جنھوں نے ان تینوں بادشاہانِ ہند کے عہد کا کچھ نہ کچھ حصہ پایا اور مدت تک تصنیف و تالیف اور درس و افادہ کا غلغلہ بلند کیے رکھا۔ علما کی اس جماعت سے ان حکمرانوں کو خاص تعلق خاطر تھا اور وہ حسبِ مراتب ان کی قدر کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حکمرانوں کی خود اپنی حیاتِ مستعار کے شب و روز علم و ادب کے ماحول میں گزرے اور عرفان و ادراک کی فضا میں بسر ہوئے تھے۔ ان سطور میں جو مقدمے کی شکل میں پیش کی جا رہی ہیں، جہاں گیر اور شاہ جہان کی علمی زندگی کی نقاب کشائی کی جائے گی اور ان کے مذہبی و دینی رجحانات کو نمایاں کیا جائے گا۔ نیز علما و فقہا سے ان کے تعلقات کی صراحت کی جائے گی۔ ان شاء اللہ العزیز، و علیہ التکلان۔

لیجیے پہلے جہاں گیر اور پھر شاہ جہان کی زندگی کے دینی و علمی گوشوں کو نظر و بصر کے زاویوں میں لایئے۔ ہم کوشش کریں گے کہ واقعات کی پوری تصویر قارئین کی نگاہوں کے سامنے گھوم جائے۔

جہاں گیر

جہاں گیر، مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کا سب سے بڑا بیٹا اور بابر کی نسل کا چوتھا بادشاہ تھا جو چہار شنبہ کے روز ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ کو نواح آگرہ میں سیکری کے مقام پر ایک تارک الدنیا بزرگ کے گھر میں پیدا ہوا۔ اس بزرگ کا نام شیخ سلیم چشتی تھا، جہاں گیر کی ماں کا شاہی نام مریم زمانی تھا۔ وہ راجہ بہارا مل کی بیٹی تھی اور ہندوستان کے راجپوت خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

جہاں گیر سے پہلے اکبر، اولادِ نرینہ سے محروم تھا۔ اس زمانے میں وہ مذہبی رجحانات کا حامل تھا اور اس کے ذہن و قلب پر اسلامی احکام و اوامر کے اثرات چھائے ہوئے تھے۔ وہ فتح پور سیکری کے مشہور بزرگ شیخ سلیم بن بہاء الدین

چشتی کا مرید تھا اور ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا تھا۔ شیخ سلیم چشتی، شیخ فرید الدین گنج شکر کی اولاد سے تھے۔ اکبر نے شیخ سے بیٹے کی ولادت اور زندگی کی دعا کرائی، اللہ نے دعا قبول فرمائی اور بادشاہ کو بیٹا عطا کیا۔ بیٹے کا نام مرشد کے نام پر سلیم رکھا گیا۔ جہانگیر اپنے تزک کے آغاز میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جس زمانے میں اس کے والد بزرگوار کے دل میں بیٹے کی شدید آرزو کروٹ لے رہی تھی، ان دنوں نواحی آگرہ میں موضع سیکری کے ایک پہاڑ میں شیخ سلیم نامی ایک صاحبِ حال درویش فروکش تھے۔ وہ عمر کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے اور اس نواح کے لوگ ان سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ شہنشاہ اکبر چونکہ بزرگوں کا بڑا معتقد تھا، لہٰذا شیخ سلیم کی خدمت میں بھی جاتا اور ان کی صحبت سے مستفیض ہوتا تھا۔ ایک روز جب کہ شیخ عالمِ بے خودی میں تھے، اکبر نے ان سے پوچھا، میرے کتنے بیٹے ہوں گے۔؟

فرمایا۔ بخشندہ بے منت سہ پسر بہ شما ارزانی خواہد داشت۔

اللہ تعالیٰ تمھیں تین فرزند عطا کرے گا۔

اکبر نے کہا:

نذر نمودم کہ فرزندِ اوّل را بہ دامنِ تربیت و توجہِ شما انداختہ۔ شفقت و مہربانی شمارا حامی و حافظِ او سازم۔

میں نے نذر مانی ہے کہ پہلا بیٹا آپ کے دامنِ تربیت اور التفاتِ توجہ میں دوں گا، اور آپ کی شفقت و عنایت کو اس کا حامی و محافظ بناؤں گا۔

شیخ نے بادشاہ کی یہ پیش کش قبول فرمائی اور کہا

مبارک باشد، باہم ایشاں را ہم نام خود ساختیم۔

مبارک ہو، ہم اس بچے کو اپنا ہم نام بنائیں گے۔

جہانگیر کی ولادت، شیخ سلیم کے گھر میں ہوئی۔ چنانچہ وہ اس سے آگے خود لکھتا ہے:

چوں والدۂ مرا ہنگامِ وضع حمل نزدیک می رسد بخانہ شیخ می فرستند تا ولادتِ من دراں جا واقع گردد، بعد از تولّد نامِ مرا سلطان سلیم نہادند۔

جب میری والدہ کے وضعِ حمل کا وقت قریب آیا تو اُن کو شیخ کے مکان میں بھیج دیا گیا تاکہ میری ولادت وہیں ہو۔ ولادت کے بعد میرا نام سلیم رکھا گیا۔

چوں کہ جہاں گیر کا نام اکبر کے مرشد کے نام پر سلیم رکھا گیا تھا، اس لیے نام کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے باپ نے بیٹے کو کبھی کسی حالت میں بھی نام لے کر نہیں پکارا۔

امّا من از زبانِ مبارک پدرِ خود نہ در مستی و نہ در ہوشیاری شنیدم کہ مرا محمد سلیم یا سلطان سلیم مخاطب ساختہ باشند، ہمہ وقت شیخو بابا گفتہ سخن می کردند۔

لیکن میں نے اپنے باپ کی زبان سے، نہ عالمِ مدہوشی میں، نہ حالتِ سرشاری میں مجھ کو محمد سلیم یا سلطان سلیم کے نام سے پکارتے نہیں سنا۔ وہ ہمیشہ مجھے شیخو بابا کہتے تھے۔

جہاں گیر کی ولادت کے بعد اکبر نے سیکری کو مقامِ مبارک سمجھ کر اپنا دار الخلافہ بنایا اور چودہ پندرہ سال میں اس پہاڑ اور جنگل میں ایک ایسا شہر آباد کر دیا جہاں ہر سو نوع بنوع باغات دکھائی دیتے اور ہر طرف دل کش عمارات نظر آتی تھیں۔ پھر فتحِ گجرات کے بعد اس کو فتح پور سیکری کے نام سے موسوم کیا۔[1]

تعلیم و تربیت

جہاں گیر نے ابتدائی تربیت شیخ سلیم چشتی کے گھر میں پائی اور چار سال چار ماہ چار روز کا ہوا تو چہار شنبہ کے روز ۲۲ رجب ۹۸۱ھ کو تعلیم کے لیے مکتب میں بٹھا دیا گیا۔[2] اس کے اساتذہ میں مولانا محمد سعید ہروی المعروف بہ میر کلاں محدث اور مفتی صدر جہاں پھانی شامل ہیں۔ میر کلاں سے اس نے حدیث کی سماعت

---

[1] تزکِ جہاں گیری، ص ۲، ۳

[2] مقدمہ تزکِ جہاں گیری، ص ۶

کی۔ اس کے ایک معلم و اتالیق قطب الدین محمد خاں تھے، جن کے بارے میں وہ خود لکھتا ہے کہ "آں برگزیدہ دین و دولت خلعتِ امتیاز پوشید"[۳۵] جہاں گیر ترکی زبان کا بھی عالم تھا، یہ زبان اس نے عبدالرحیم خان خاناں سے سیکھی۔ چہل حدیث کا درس اس نے شیخ عبدالغنی کی خدمت میں رہ کر لیا[۳۶]

جلال الدین اکبر نے جہاں گیر کی تربیت کا عمدہ ترین اہتمام کیا اور ملک کے مشاہیر اساتذہ کو اس کی تعلیم پر مامور فرمایا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ شہنشاہ اکبر کا یہ جانشین اپنے دور کا عالم و فاضل شخص تھا، علما و فقہا سے اس کے مخلصانہ مراسم تھے، اصحابِ تصوف و طریقت سے نہایت احترام سے پیش آتا تھا، شعرا و ادبا کی بڑی حوصلہ افزائی کرتا تھا اور اربابِ فن کی اس کے دل میں بدرجہ غایت قدر و منزلت تھی۔ قرآن و تفسیر، حدیث و فقہ، فلسفہ و حکمت اور دیگر مروّجہ علوم سے اس کو گہرا لگاؤ تھا۔ بہترین شاعر بھی تھا۔ اس کے دربار میں شعر و شاعری کی بالالتزام محفلیں جمتیں، شعرا اپنا کلام سناتے اور داد پاتے۔ جہاں گیر ان محفلوں میں شرکت کرتا اور ادبی مباحث میں پوری طرح حصّہ لیتا۔ مشہور شعرا کے بے شمار اشعار اسے زبانی یاد تھے، وہ انھیں مناسب مواقع پر پڑھتا اور اونچے درجے کے نقاد کی طرح ان کے حسن و قبح کو تنقید کی میزان میں رکھتا۔

جہاں گیر کی بغاوت

اکبر نے اگرچہ جہاں گیر کے لیے بہترین تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا، تاہم ایک مرحلے میں باپ بیٹے کے باہمی تعلقات میں سخت کشیدگی پیدا ہو گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۰۰۱ھ میں اکبر کو شدید بیماری نے آگھیرا اور اس نے کرب و اذیت کے اس عالم میں بیٹے پر الزام عاید کیا کہ اس نے سازش کر کے مجھے

---

[۳۵] تزکِ جہاں گیری، ص ۶ [۳۶] ایضاً، ص ۱۰

زہر دے دیا ہے۔ پھر دونوں میں ذہنی بُعد اس وقت نقطۂ عروج کو پہنچا جب ۱۰۰۸ھ میں جہاں گیر نے اکبر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے الہ آباد کے مقام پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اکبر نے بعض ذرائع سے مصالحت کی کوشش کی مگر جہاں گیر اس پر آمادہ نہ ہوا۔ حالات کی رفتار نے ایسا رخ اختیار کیا کہ ۱۰۱۰ھ میں وہ ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ آگرے کی طرف بڑھا، اکبر نے بھی دفاعی کارروائیاں شروع کیں اور اس کا لشکر شاہزادے سے مقابلے کے لیے میدانِ کارزار میں نمودار ہوا۔ لیکن شاہزادہ الہ آباد کی طرف واپس لوٹ گیا اور شاہی لقب اختیار کر کے باقاعدہ دربار قائم کر لیا۔ حالات میں زیادہ پیچیدگی پیدا ہوئی تو اکبر کے مرحوم وزیر بیرم خاں کی بیوہ سلیمہ سلطان بیگم درمیان میں پڑی اور مصالحت کی دوبارہ ایک صورت سامنے آئی، لیکن شاہزادہ اس پر بھی قائم نہ رہا اور جلد ہی پہلی روش اختیار کر لی، اور الہ آباد جا کر پھر اپنا دربار قائم کر لیا۔

واقعات کا تیز رو کارواں اسی نہج پر آگے بڑھتا رہا۔ اس اثنا میں جہاں گیر اس قطعی نتیجے پر پہنچا کہ اکبر کا وزیر ابوالفضل ہی تمام مصیبتوں کا باعث ہے اور وہ اس کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرتا رہتا ہے۔ لہٰذا ابوالفضل کو درمیان سے ہٹانا ضروری ہے، ان دنوں ابوالفضل دکن میں مقیم تھا، اکبر نے ضروری مشوروں کے لیے اسے دارالحکومت میں طلب کیا۔ اس کی اطلاع جہاں گیر کو بھی پہنچ گئی، اسے یقین ہو گیا کہ ابوالفضل شہنشاہ کو میری مزید مخالفت پر آمادہ کرے گا اور معاملہ اور الجھ جائے گا۔ اب اس نے بندیلہ کے ایک سردار نرسنگھ دیو کو اس پر آمادہ کیا کہ جب ابوالفضل تمہارے علاقے سے گزرے تو اسے قتل کر دو، میں تمہیں بہت سی مراعات دوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نرسنگھ دیو کے ملازموں نے ابوالفضل کو قتل کر کے اس کا سر جہاں گیر کے پاس الہ آباد بھیج دیا۔ اس قتل کا اکبر کو بہت افسوس ہوا مگر وہ بیٹے کو

کچھ نہ کہہ سکا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں گیر کو باپ کے مذہبی افکار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس نے کسی موقع پر بھی ان افکار و تصورات کی حمایت نہیں کی جو اکبر کو سب سے زیادہ عزیز تھے۔ بلکہ واقعات کی مختلف کڑیاں ملائی جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکبر کے دینی تصورات کا مخالف تھا۔ اکبر ہندوستان کا بہت بڑا حکمران اور عظیم منتظم تھا، اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر ابوالفضل سے اگرچہ اب اکبر کے تعلقات اچھے نہ رہے تھے اور ابوالفضل کو اس کا شدید احساس بھی تھا تاہم اس کو قتل کر دینا امرِ سہل نہ تھا۔ جہاں گیر کی تعلیم و تربیت چوں کہ علمائے حق کی نگرانی میں ہوئی تھی، اس لیے وہ ان سے متاثر تھا اور اپنے باپ کے دینی افکار اور ابوالفضل اور اس کے باپ شیخ مبارک اور بھائی شیخ فیضی نے اس سلسلے میں جو کردار ادا کیا، اس سے خوب واقف تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ مزید آگے بڑھے، ——— باپ سے اختلاف کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی اور ابوالفضل کے قتل میں بھی یہ راز مضمر تھا۔ ملا مبارک اور فیضی پہلے وفات پا چکے تھے، — ابوالفضل ہی باقی رہ گیا تھا، ہندوستان میں کسی شکل میں اسلامی فضا پیدا کرنے کے لیے اس کو راستے سے ہٹانا ضروری تھا۔

جہاں گیر کی تخت نشینی میں جن امرائے مملکت کا ہاتھ ہے اور جن شرائط پر اُسے حکومت دی گئی، پھر برسرِ حکومت آتے ہی بارہ احکام پر مشتمل جو دستور العمل اس نے جاری کیا، اس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ جہاں گیر مذہبی اور دینی اعتبار سے باپ سے بالکل مختلف تھا اور اس کے دل میں اسلام کی روشنی موجود تھی۔

تخت نشینی اور بارہ احکام

جہاں گیر پنجشنبہ کے روز ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۰۱۴ھ کو چھتیس (۳۶) سال کی عمر

میں اپنے والد جلال الدین اکبر کی وفات کے بعد دارالحکومت آگرہ میں نورالدین محمد جہاں گیر کے نام سے تخت نشینِ ہند ہوا اور برصغیر کی وسیع سلطنت کی زمام اختیار ہاتھ میں لی۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور امرا و وزرا اور ارکانِ سلطنت کو خلعات و انعامات اور ترقیات سے نوازا گیا۔ اس نے عدل و انصاف کے ساتھ کاروبارِ حکومت کا آغاز کیا۔ علامہ سید عبدالحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں:

وافتتح امرہ بالعدل والسخاء وقرب الیہ العلماء وکان صحیح العقیدۃ خلافا لوالدہ[۵۵]۔

جہاں گیر نے اپنا سلسلۂ حکومت عدل و انصاف اور جود وسخا کے ساتھ شروع کیا، علمائے کرام اس سے قرب و تعلق رکھتے تھے اور وہ اپنے باپ (اکبر) کے برعکس صحیح العقیدہ مسلمان تھا۔

جہاں گیر کی معدلت گستری کا یہ عالم تھا کہ اس نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی حکم جاری کیا کہ قلعے کے بُرج پر ایک زنجیرِ عدالت آویزاں کی جائے تاکہ جو فریادی اور مظلوم کسی وجہ سے شاہی دربار تک رسائی حاصل نہ کر سکیں، وہ اس زنجیر کو ہلا دیں تاکہ بادشاہ براہِ راست ان کی فریاد سن سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے حسبِ ذیل بارہ احکام جاری کیے:

۱۔ محصول چنگی اور محصول میر بحری معاف کر دیے جائیں اور جو لگان صوبوں کے جاگیردار اور عمالِ حکومت اپنے ذاتی مفاد کے لیے لوگوں سے لیتے ہیں، وہ ختم کر دی جائیں۔ اپنے اختیارات سے جن تکلیفوں اور مشقتوں میں وہ عوام کو مبتلا کرتے ہیں ان کا سلسلہ فوری طور پر بند کر دیا جائے۔

۲۔ جو راستے آبادیوں سے دُور ہونے کی وجہ سے چوروں اور ڈاکوؤں کی زد میں ہیں اور مسافر ہر وقت خطرے میں گھرے رہتے ہیں، وہاں منزل بہ منزل

---

۵۵ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۰

سرائیں اور مسجدیں تعمیر کی جائیں، کنوئیں کھدوائے جائیں اور ان میں محافظ مقرر کیے جائیں تاکہ راہ گزر امن و امان سے اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔

۳۔ جو لوگ لاوارث فوت ہو جائیں، وہ مسلمان ہوں یا ہندو، ان کی متروکہ دولت سے مسجدیں، سرائیں اور نئے پل تعمیر کیے جائیں، کنوئیں اور تالاب کھدوائے جائیں۔ یا پرانے اور شکستہ پلوں کی مرمت کرائی جائے۔ یہ سب مصارف ان کی دولت کے شرعی مصارف ہوں گے۔

۴۔ ملک میں شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کی فروخت بند کر دی جائے۔

۵۔ سرکاری ملازمین اور سرکاری اہل کار کسی کے گھر میں قیام نہ کریں۔

۶۔ کسی کو ناک، کان کاٹنے کی سزا نہ دی جائے۔ [جہاں گیر کہتا ہے] میں خود بھی بارگاہِ الٰہی میں عہد کرتا ہوں کہ کسی کو یہ سزا نہ دوں گا۔

۷۔ سرکاری زمین کے منتظموں اور جاگیر داروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ رعایا کی زمین پر ظلم و تعدی سے قبضہ کر کے اس پر کاشت نہ کریں۔

۸۔ دیہات کے سرکاری عامل اور منتظم و ملازم وہاں بلا اجازت شادی نہ کریں۔

۹۔ بڑے بڑے شہروں میں شفاخانے قائم کیے جائیں اور ان میں جو طبیب متعین کیے جائیں ان کے اخراجات شاہی خزانے سے ادا کیے جائیں۔

۱۰۔ ہر سال ۱۷ ربیع الاوّل کو جو کہ جہاں گیر کی تاریخِ ولادت ہے، اور ہفتے میں دو روز یعنی جمعرات اور ہفتے کو جانور ذبح نہ کیے جائیں۔

۱۱۔ جلال الدین اکبر بادشاہ کے زمانے کے تمام عہدے دار بدستور سابق برقرار رہیں۔

۱۲۔ تمام قیدی جو مختلف قلعوں اور جیلوں میں محبوس و مقید ہیں، رہا کر دیے جائیں [۵۶]

---

۵۶ تزکِ جہاں گیری، ص ۵

شرع محمدی کے نفاذ و تحفظ کی شرط

تخت نشینی کے بعد جہاں گیر کے یہ بارہ احکام (احکامِ دوازدہ) ملک کے دستور العمل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں وہ ہندوستان میں کسی نہ کسی صورت میں اسلامی احکام نافذ کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو واقعہ ہے کہ اس کو اپنے باپ کے دین سے کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ اس سے تعلق کا اظہار کبھی اپنے چھتیس[۳۶] سالہ دورِ شہزادگی میں کیا اور نہ حکومت کی باگ دوڑ ہاتھ میں لینے کے بعد اس سے وابستگی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ بلکہ "اکبر اینڈ دی جیوٹس" کا مصنف سی، ایچ، پین تو صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ: "جو امرائے سلطنت جہاں گیر کو وارثِ تختِ ہند بنانا چاہتے تھے، ان کی بنیادی شرط یہ تھی کہ بادشاہ اس ملک میں شرعِ محمدی کا نفاذ و تحفظ کرے گا"[۵]

جن امرائے مملکت نے جہاں گیر کو بادشاہِ ہند بنانے میں اہم کردار ادا کیا ان میں شیخ فرید بخاری جسے بعد میں نواب مرتضیٰ خاں کا خطاب ملا، پیش پیش تھا۔ درحقیقت دربار کے دو نامور رکن، اکبر کا جانشین، جہاں گیر کے بیٹے خسرو کو بنانا چاہتے تھے۔ ان دو میں سے ایک اکبر کا مشہور مصاحب عزیز خاں کوکہ تھا جو خانِ اعظم کے لقب سے ملقب تھا، اور دوسرا راجا مان سنگھ تھا۔ خسرو کی بیوی خان اعظم کی بیٹی تھی، راجہ مان سنگھ کا بھی وہ رشتے دار تھا۔ ان دونوں نے خسرو کی تخت نشینی کے لیے کوشش بھی کی۔ لیکن شیخ فرید اور بعض دیگر مسلمان امرا نے اس کوشش کو کامیابی سے ہم کنار نہیں ہونے دیا۔ ان کی تگ و دو سے جہاں گیر ہی اکبر کا جانشین بنا اور انھوں نے جہاں گیر سے دو شرطوں پر پابند رہنے کا وعدہ لیا۔ ایک یہ کہ وہ ملک میں شرعِ محمدی کا نفاذ کرے گا، دوسرے یہ کہ اپنے بیٹے خسرو اور اس کے معاونوں سے کسی قسم کی سرزنش نہیں کرے گا۔

---

[۵] اکبر اینڈ دی جیوٹس، ص ۲۰۴

شاہزادے نے ان شرائط کی پابندی کا حلف اٹھایا اور محافظوں کی خاص تعداد کے ساتھ اپنے باپ کی ملاقات کو گیا۔ ۵۸

بلا شبہ جہاں گیر نے بہت حد تک اپنے وعدے کا ایفا کیا۔ ملک میں اسلام اور علوم اسلامی کو ترقی دی۔ اس کے عہد میں بہت بڑا کام یہ ہوا کہ اکبر کے مذہبی افکار کا کوئی اثر اگر کہیں باقی بھی تھا تو اس کے عہد میں بالکل ختم ہو گیا۔

بیٹوں کی مخالفت

تخت نشین ہونے کے بعد خود جہاں گیر کو بھی بیٹوں کی طرف سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصے بعد ۱۰۱۵ھ میں اس کے بیٹے خسرو نے بغاوت کا اعلان کیا۔ اگرچہ بعد میں مصالحت ہو گئی لیکن جہاں گیر نے بیٹے کے اس گستاخانہ اقدام کو کبھی معاف نہیں کیا۔ چنانچہ ۱۰۳۱ھ میں جب وہ برہان پور میں فوت ہو گیا تو جہاں گیر نے اطمینان کا سانس لیا، کیوں کہ اس کی ایک بڑی پریشانی ختم ہو گئی تھی۔

یہاں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ سکھوں کے پانچویں گورو ارجن دیو نے جہاں گیر کے خلاف بغاوت کے زمانے میں خسرو کی مدد کی اور اسے پناہ دی تھی، جس کی بنا پر شہنشاہ نے اُسے موت کی سزا دی۔ اس واقعہ کے آئندہ سکھ مسلم تاریخ پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

اس سے کئی برس قبل ۱۰۱۶ھ میں جب جہاں گیر کابل میں خیمہ زن تھا، اُسے قتل کرنے کی سازش کی گئی، جسے اس نے ناکام بنا دیا۔ سازش کے چار سرغنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور شہزادہ خسرو کی، جو اس سازش کا اصل محرک تھا، بادشاہ کے حکم سے آنکھیں بے کار کر دی گئیں۔

۱۰۳۲ھ میں جہاں گیر کو اپنے ایک اور بیٹے شہزادہ خرم کی (جو آگے چل کر

---

۵۸ اکبر اینڈ دی جیوئٹس، ص ۲۰۴

شہاب الدین محمد شاہ جہان کے نام سے وارثِ تختِ ہند ہوا)، بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بغاوت کا باعث شہزادہ خرم اور ملکہ نور جہان کے باہمی اختلافات تھے۔ نور جہان سے جہان گیر کی ۱۰۲۰ھ میں شادی ہوئی تھی اور وہ اپنے حُسن و خوبروئی اور عقل و دانش کی بنا پر حکومت کے در و بست پر تقریباً قابض ہوگئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شہزادہ خرم راستے سے ہٹ جائے تاکہ اس کے داماد شہریار کو، جو شاہ جہان کا سوتیلا بھائی تھا، تختِ ہند پر متمکن کیا جا سکے۔ شہزادہ خرم کی بغاوت کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا اور اس نے ملک میں خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس سے شاہی وقار کو بڑا صدمہ پہنچا اور خزانہ تقریباً خالی ہوگیا۔ بغاوت کا یہ سلسلہ تین سال تک چلا، آخر مہابت خاں کی فوجی قوت نے جمادی الاخریٰ ۱۰۳۵ھ میں خرم کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

ان واقعات سے ہمیں حیران اور متعجب ہونے کی ضرورت نہیں، بادشاہوں کی تاریخ ہمیشہ تلوار کے قلم اور خون کی روشنائی سے انسانوں کی ہڈیوں پر رقم کی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں باپ بیٹے کے خلاف سینہ سپر ہے اور کہیں بیٹا باپ کی گردن پر تیغ کی دھار آزما رہا ہے۔ تاریخ کے یہ مختلف موڑ ہیں جو ایک خاص انداز کے ساتھ وہ کاٹتی رہتی ہے۔ ہمیں ان کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، ہم اس ڈھیر میں سے فقط اپنے مطلب کی چند چیزیں تلاش کرنا چاہتے ہیں۔

علمائے کرام سے محبت و عقیدت

جہان گیر سنی العقیدہ بادشاہ تھا اور اس کو علمائے وقت سے بہت ہی محبت و عقیدت تھی، اس کے بائیس سالہ دورِ حکومت میں جون پور، دہلی، لاہور، آگرہ، کشمیر، سیالکوٹ، ملتان، سرہند، برہان پور، ٹھٹھہ وغیرہ بلاد و مصار اور مختلف دیہات و قصبات میں متعدد علمائے کرام موجود تھے اور ان

علاقوں کو فقہا و شعرا، صوفیا و اتقیا اور علما و صلحا کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ ان علما و فقہا میں سے جہاں گیر بالخصوص شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ذاتِ گرامی ان کے علم و فضل کی وسعت پذیری اور تقویٰ و تدین سے بڑا متاثر تھا۔ دہلی میں اپنے چودھویں سالِ جلوس میں ان سے ملاقات بھی کی، جس کا وہ اپنی تزک میں ذکر بھی کرتا ہے[۹]۔ حضرت مجدد الف ثانی کی صحبت کیمیا اثر سے بھی اس نے غیر معمولی روحانی اور مذہبی برکات حاصل کیے۔ ابتدا میں بعض درباری امرا کی فتنہ پرور گفتگو سے متاثر ہو کر وہ حضرت مجدد سے برگشتہ رہا، یہاں تک کہ اشتعال میں آ کر ان کو گوالیار کے قلعے میں نظر بند بھی کر دیا مگر بعد میں انھیں رہا کر دیا تھا اور ان سے بدرجہ غایت محبت و مودّت پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت مجدد کی رہائی کے بارے میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ ایک روز جہاں گیر نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس سے فرما رہے ہیں کہ جہاں گیر! تم نے ایک بڑے آدمی کو قید میں ڈال رکھا ہے۔ خواب دیکھنے کے فوراً بعد وہ بیدار ہوا اور حضرت کی رہائی کا حکم صادر کیا۔ انھیں اپنے پاس بلایا، معذرت طلب کی اور لطف و کرم سے پیش آیا۔ پھر ان کی ذاتِ گرامی سے جہاں گیر کی شیفتگی اور عقیدت مندی یہاں تک پہنچی کہ زیادہ تر انھی کی خدمت میں رہنے لگا۔ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:

بادشاہ از محبانِ شیخ شد، بحدیکہ گاہی آں جناب را از خود جدا نمی کرد، و شہزادہ خرم را داخلِ حلقۂ مریدانِ شیخ نمود، چنانچہ تا عہدِ شاہ جہان و عالم گیر بادشاہان باہمہ علما و وزرا داخل سلسلہ مجددیہ می شدند[۱۰]

[جہاں گیر بادشاہ] کا شمار محبانِ شیخ مجدد میں سے ہوا، یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو

---

۹ دیکھیے: تزکِ جہاں گیری، ص ۲۸۵

۱۰ خزینۃ الاصفیا، ص ۲۸۳

حضرت سے جدا نہ کرتا تھا، شہزادہ خرم کو حضرت شیخ کے حلقۂ مریدین میں شامل کیا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ شاہ جہان اور عالمگیر کے عہد تک شاہانِ ہند اپنے تمام علما و وزرا کے ساتھ سلسلۂ مجددیہ میں داخل ہوتے تھے۔

حضرت مجدد سے جہانگیر کے تعلق و شیفتگی کی یہ نوعیت تھی کہ روزا مغرب کے بعد وہ ان سے ملاقات کرتا اور ان ملاقاتوں اور باہمی مذا کے نتیجے میں اس کے قلب و ذہن دین کی روشنی سے منور ہوئے ــــ حضرت مجدد اپنے صاحب زادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کے نام ا مکتوب میں جن الفاظ میں اس کا اظہار کرتے ہیں، ان کا ترجمہ لائق مطالعہ ہے

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اس طرف کے احوال اوضاع حمد کے لائق ہیں۔ (بادشاہ کے ساتھ) عجیب و غریب صحبتیں گزر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امورِ دینیہ اور اصولِ اسلامیہ میں قطعاً کسی قسم کی سستی اور مداہنت کا دخل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں بھی وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں۔ اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے۔ بالخصوص آج رمضان کی سترھویں شب کو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت، عقل کے عدم استقلال، اور آخرت کے ایمان، اس کے عذاب و ثواب، رؤیت و دیدار کے اثبات، حضرت خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی خاتمیت، ہر صدی کے مجدد، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی اقتدا، تراویح کی سنّیت، تناسخ کے ابطال، جنّوں اور جنیوں کے احوال اور ان کے عذاب و ثواب کے بارے میں بہت کچھ مذکور رہا۔ بادشا بڑی خوشی سے سب باتیں سنتا رہا۔ اس اثنا میں اور بھی بہت سی باتوں کا ذکر ہوا۔ اقطاب، اوتاد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیات وغیرہ کا تذکرہ بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ بادشاہ سب باتیں تسلیم کرتا رہا۔ اور دورانِ گفتگو میں کوئی ایسا تغیر ظاہر نہیں ہوا جو بر ہمی پر دلالت کناں ہو۔ ان واقعات اور ملاقات

میں شاید اللہ تعالیٰ کی حکمت پوشیدہ ہوگی اور کوئی راز مخفی ہوگا۔

الحمد للہ الذی ھدٰنا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدٰنا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق۔

دوسرے یہ کہ قرآنِ مجید بادشاہ کو سورۂ عنکبوت تک ختم کرا چکا ہوں، جب رات کو اس مجلسِ (بادشاہی) سے اُٹھ کر آتا ہوں تو تراویح میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ حفظِ قرآن کی یہ اعلیٰ دولت، اس پراگندہ حالی میں جو عین جمعیتِ قلب ہے، حاصل ہوئی۔ الحمد للہ اولاً و آخراً [۱]

جہاں گیر کے متعدد امراء و وزراء بھی حضرت مجدد کے عقیدت مندوں میں شامل تھے اور ان کے نام انھوں نے مکتوب بھی تحریر فرمائے۔ اس محبت و عقیدت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کے دل میں اسلامی شریعت کی فلاح و بہبود کا جذبہ بیدار ہوا اور اس کے ارکانِ دربار بھی ان سے بہت متاثر ہوئے۔

مشہور ہے کہ جہاں گیر کہا کرتا تھا کہ میرے پاس نجات کی ایک دستاویز ہے اور وہ حضرت شیخ احمد سرہندی کا یہ ارشادِ مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں لے جائے گا تو ہم تیرے بغیر نہ جائیں گے۔

خلافِ شرع رسوم سے نفرت

جہاں گیر کے قلب و ذہن اور فکر و عمل کی دنیا بالکل بدل گئی تھی۔ برِ صغیر کے مسلمانوں میں ہندوؤں اور غیر مسلموں سے میل جول کی وجہ سے جو غیر اسلامی رسوم و عوائد رواج پا گئے تھے، جہاں گیر اس کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس پر دکھ کا اظہار کرتا تھا۔ اس نے اپنے پندرھویں سالِ جلوس میں حضرت مجدد الف ثانی کو قلعہ گوالیار سے رہا کیا، اسی سال وہ کشمیر گیا، وہاں علاقہ راجوڑی کے مسلمانوں کی حالت دیکھی اور ان میں مروّج غلط رسمیں اس کے علم

---

[۱] مکتوباتِ امام ربانی، دفتر سوم، مکتوب ۴۳

میں آئیں تو بادشاہ کو بڑی ذہنی کوفت ہوئی۔ اس کا وہ تزکِ جہاں گیری میں جن الفاظ میں اظہار کرتا ہے، ان کا ترجمہ یہ ہے:

یہاں کے زمینداروں کو "راجا" کہتے ہیں۔ ان لوگوں کو سلطان فیروز نے دائرۂ اسلام میں داخل کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو راجا کہتے ہیں اور ابھی تک زمانہ جہالت کی بدعات کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہ بدعات ان میں پوری طرح جاری اور مستمر ہیں۔ یہاں کسی ہندو عورت کا شوہر مر جائے تو وہ اس کے ساتھ ہی آگ میں جل جاتی ہے، اور مسلمان عورت کا شوہر فوت ہو جائے تو بیوی کو زندہ اس کی قبر میں دفن کر دیتے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ اس علاقے کی ایک عورت کو انہی دنوں اس کے ہم عمر مردہ شوہر کے ساتھ زندہ درگور کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بعض لوگ بیٹی کو پیدائش کے وقت ہی قتل کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگ ہندوؤں سے رشتے داری قائم کرتے ہیں۔ اپنی لڑکیاں ان کو دیتے ہیں اور ان کی لڑکیاں ان سے لیتے ہیں۔ نعوذ باللہ، ان بدعات کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ (اب سرکاری طور پر) حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص اس قسم کی بدعات کا ارتکاب کرے، اسے سزا دی جائے۔[۱۲]

پھر آئندہ برس (سولھویں سالِ جلوس میں) بادشاہ فتح کانگڑہ کا واقعہ بیان کرتا ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کی غیر دینی حالت کو دیکھتا ہے تو سخت افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ کانگڑہ میں پہاڑ کے دامن میں ہندوؤں کا ایک بت خانہ ہے، جسے جوالا مکھی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس بت خانے میں مسلمان بھی جا کر بت پرستی کرتے اور نذرانے پیش کرتے تھے۔ جہاں گیر اپنے تزک میں اس کا ذکر خاصی تفصیل سے کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:

قطع نظر از کفارہ کہ بت پرستی آئین آنہاست، گروہ گروہ از اہلِ اسلام مسافتِ بعید طے نمودہ، نذورات می آرند و پرستشِ ایں سنگِ سیاہ می نمایند۔[۱۳]

---

[۱۲] تزکِ جہاں گیری، ص ۳۲۲

[۱۳] ایضاً، ص ۳۴۰

قطع نظر کفار کے کہ بت پرستی ان کا مذہبی شیوہ ہے، گروہ در گروہ مسلمان بھی دور دراز کی مسافت طے کر کے وہاں آتے ہیں، نذریں پیش کرتے ہیں اور اس سنگِ سیاہ کی پرستش کرتے ہیں۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کی غیر دینی اور خلافِ شرع حرکات کے ارتکاب سے جہاں گیر کو سخت ذہنی اذیت پہنچتی تھی۔

سفرِ کانگڑہ میں علمائے اسلام کی معیت

سولھویں سالِ جلوس میں جہاں گیر فتح کانگڑہ کی غرض سے روانہ ہوا تو علمائے اسلام بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ کون کون علما اس کے ہم رکاب تھے، تاہم اس کا تذکرہ وہ صراحت سے کرتا ہے۔ قلعہ کانگڑہ میں اذان اور شعائرِ اسلام کی بجا آوری کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

متوجہ سیرِ قلعہ کانگڑہ شدم و حکم کردم کہ قاضی و میر عدل و دیگر علمائے اسلام در رکاب بودہ، آنچہ شعارِ اسلام و شرائط دین محمدی است در قلعہ مذکور بعمل آورند۔ . . . بتوفیق ایزد سبحانہ بانگِ نماز و خواندن خطبہ و کشتنِ گاؤ وغیرہ کہ از ابتدائے بنایِ ایں قلعہ تاحال نشدہ بود، ہمہ را در حضور خود بعمل آوردم۔ سجداتِ شکرِ ایں موہبتِ عظمیٰ کہ ہیچ بادشاہے توفیق براں نیافتہ بود بتقدیم رسانیدہ۔ حکم فرمودم کہ مسجدِ عالی درونِ قلعہ بنا نہند۔[۱۲۱]

قلعہ کانگڑہ کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی اور حکم دیا کہ قاضی، میر عدل اور دیگر علمائے اسلام ہم رکاب ہوں تاکہ اس قلعہ میں شعائرِ اسلام اور شرائطِ دینِ محمدی پر عمل کیا جائے . . . چنانچہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی توفیق سے نماز کے لیے اذان کہی گئی، خطبہ پڑھا گیا اور گائے ذبح کی گئی، دیگر احکامِ اسلام پر بھی عمل ہوا۔ یہ وہ امورِ دینی تھے، جن پر قلعے کی تعمیر سے لے کر آج تک اس قلعے میں عمل نہیں ہوا تھا۔ یہ سب امور میں نے اپنے سامنے

---

[۱۲۱] تزکِ جہاں گیری، ص ۳۴۶، ۳۴۷

ادا کرائے۔ اللہ کی اس عنایتِ عظیم پر شکر کے سجدے ادا کیے کہ اس سے قبل کسی بادشاہ کو اس کی توفیق نہ ہوئی تھی۔ اس میں مجھے ہی تقدم حاصل ہوا۔ میں نے حکم جاری کیا کہ قلعے کے اندر ایک عالی شان مسجد تعمیر کی جائے۔

مطالعۂ کتب کا شوق اور مدارسِ دینیہ کی تعمیر

جہاں گیر کو کتب مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ سرکاری کتب خانے کے علاوہ اس کا ایک اپنا شاندار ذاتی کتب خانہ تھا۔ اس کے مہتمم کا نام مکتوب خاں تھا۔ وہ سفر میں بھی ضروری کتابیں ساتھ رکھتا تھا۔ تزکِ جہاں گیری میں یہ واقعہ مرقوم ہے کہ جب بادشاہ گجرات گیا تو وہاں کے مشائخ کو اپنے کتب خانے سے تفسیرِ حسینی، تفسیر کشاف اور روضۃ الاحباب پیش کیں۔

وہ اپنے بارھویں سالِ جلوس کے واقعات کے ضمن میں لکھتا ہے:

مشائخ گجرات را کہ بمشایعت آمدہ بودند مرتبہ دیگر خلعت و خرچی بار اراضی مدد معاش دادہ رخصت فرمودم، و بہ ہریک ازیں ہا کتابے از کتاب خانہ خاصہ مثل تفسیر کشاف و تفسیر حسینی و روضۃ الاحباب مرحمت شد و بر پشتِ آں کتب تاریخ آمدن گجرات و مرحمت نمودن کتاب مرقوم گشت [۱۵]

مشائخِ گجرات میرے پاس آئے تو میں نے ان کے مرتبے کے مطابق انھیں خلعت، مصارف اور مددِ معاش کے لیے اراضی دے کر رخصت کیا۔ ساتھ ہی ان میں سے ہر ایک کو اپنے ذاتی کتب خانے سے تفسیر کشاف، تفسیر حسینی اور روضۃ الاحباب وغیرہ کتابیں پیش کیں، اور ان کتابوں کی پشت پر اپنی گجرات میں آمد اور کتاب دینے کی تاریخ تحریر کی۔

جہاں گیر مدارسِ دینیہ کی تعمیر کا بھی شائق تھا۔ بقول خافی خاں کے اس کے لیے اس نے یہ اہتمام کر رکھا تھا کہ کوئی امیر اور متمول شخص لاوارث فوت ہو جاتا

---

[۱۵] تزکِ جہاں گیری، ص ۲۲۰

تو اس کے مال و اسباب میں سے مدارس اور خانقاہیں تعمیر کراتا تھا۔ تاریخ خان جہان کی روایت کے مطابق اس نے وہ تمام مدارس از سرِ نو آباد کیے جو گزشتہ تیس[۱۶] سالوں سے پرندوں اور چوپایوں کے مسکن بنے ہوئے تھے۔[۱۶]

قرآنِ مجید سے قلبی لگاؤ

جہاں گیر کو قرآنِ مجید سے قلبی لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے اپنے عہد کے ایک عالمِ دین شیخ محمد بن جلال حسینی گجراتی کو قرآنِ مجید کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ ترجمہ لفظی ہو اور الفاظِ قرآن سے ایک حرف بھی زائد نہ ہو۔ نیز تاکید کی کہ ترجمہ آسان اور عام فہم ہونا چاہیے۔ الفاظ اور زبان میں کسی قسم کا تصنع اور تکلف ہرگز نہ ہو۔[۱۷]

معلوم نہیں اب یہ ترجمہ کہیں موجود ہے یا نہیں۔ غالباً یہ پہلا ترجمہ ہے جو برِصغیر کے ایک عالم نے فارسی زبان میں کیا۔

اوراد و وظائف

اس کی ایک تحریر بتاتی ہے کہ وہ اوراد و وظائف کا بھی قائل تھا۔ نیز وہ علما و صلحا کی صحبت میں بیٹھتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

بعلما و دانایانِ اسلامیہ فرمودم کہ مفرداتِ اسمائے الٰہی را کہ در یاد گرفتن آسان باشد جمع نمایند تا آں را وِردِ خود سازم، و در شبہائے جمعہ با علما و صلحا و درویشان و گوشہ نشینان صحبت می دارم۔[۱۸]

میں نے علمائے اسلام اور فقہا کو حکم دیا ہے کہ وہ مفرد اسمائے الٰہی کو جمع کریں، کیوں کہ ان کو یاد رکھنا آسان ہے۔ میں ان کا وظیفہ کرنا چاہتا ہوں۔ جمعرات کو میں علما و صلحا اور درویشوں اور گوشہ نشینوں کی صحبت اختیار کرتا ہوں۔

---

[۱۶] بزمِ تیموریہ، ص ۱۶۸
[۱۷] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۱
[۱۸] تزکِ جہاں گیری، ص ۱۰

ادب و شعر کا ذوقِ بلند

دودمانِ مغلیہ کا یہ بادشاہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ رحم دلی، حلم، نرم مزاجی اور عدل و قسط اس کا خاصہ تھا۔ ظریف الطبع، بہترین شاعر، فصیح البیان اور ذکی و فطین تھا۔ تحریر و تقریر میں کامل مہارت رکھتا تھا۔ تزکِ جہاں گیری اس کی اپنی تصنیف ہے۔ اس کے مندرجات سے پتا چلتا ہے کہ وہ ادبیت و فصاحت میں مرتبۂ کمال پر فائز تھا۔ انتخابِ الفاظ میں نہایت محتاط تھا۔ منظر کشی میں کوئی اس کا حریف نہ تھا۔

تزکِ جہاں گیری کے علاوہ فارسی زبان میں "پند نامہ" کے نام سے اپنے بیٹوں کے لیے ایک رسالہ قلم بند کیا جو چند اوراق پر مشتمل ہے۔

مے نوشی اور افیون خوری

بہت سی خوبیوں کے باوجود جہاں گیر میں کچھ ایسی عادتیں بھی تھیں، جو سراسر غیر اسلامی اور خلافِ شرع ہیں۔ مثلاً وہ مے نوش اور افیون خور تھا، اور اس کا وہ برملا اظہار بھی کرتا ہے۔ اس کے قول و فعل کا تضاد ملاحظہ ہو کہ ایک طرف تو وہ خود اپنے ہی جاری کردہ دستور العمل اور بارہ احکام میں سے چوتھے حکم میں یہ اعلان کرتا ہے:

شراب و دربہرہ و آنچہ از قسم مسکرات منہیہ باشد نہ سازند و نہ فروشند [۱۹]

کہ شراب اور دیگر نشہ آور چیزیں جن سے شریعت میں روکا گیا ہے، نہ تیار کی جائیں اور نہ فروخت کی جائیں

لیکن خود شراب پیتا اور افیون کھاتا ہے۔ حالاں کہ یہ دونوں چیزیں نشہ اور ہیں اور نشہ آور چیزوں سے شریعت نے سختی کے ساتھ روکا ہے۔ زندگی کے آخری دور میں تو وہ کثرت سے مے نوشی کرنے لگا تھا، اور یہی عادتِ بد اس کی موت کا سبب بنی۔

---

[۱۹] تزکِ جہاں گیری، ص ۵

ملکی مصالح

جہاں گیر کے حالات میں اس کی رحم دلی اور منصف مزاجی کا خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے کردار کا یہ پہلو بھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ اُس نے خود اپنے بیٹوں پر سختیاں کیں اور بعض اہم شخصیتوں کی موت کا باعث بنا۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ ذاتی طور پر واقعی نرم دل اور متحمل مزاج تھا، عدل و انصاف میں بھی خاص شہرت کا حامل تھا۔ لیکن اتنے بڑے ملک کے بادشاہ اور حکمران کی حیثیت سے اس پر کچھ نازک ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی تھیں، جو ملک کے سیاسی مصالح کی بنا پر اسے بعض اوقات تشدد پر بھی مجبور کرتی تھیں، اس لیے اگر اس کو کسی پر عملاً سختی اور تشدد کرنا بھی پڑا ہے تو ممکن ہے حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر ایسا کرنا اس کے نزدیک ضروری ہو۔

دورِ جہاں گیری کے علمائے کرام

دورِ جہاں گیری کے علمائے کرام، فقہائے عظام، حکمائے عالی مقام اور شعرائے نامدار کے اسمائے گرامی کی فہرست بہت طویل ہے، ان میں سے جو حضرات ہمارے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے نام اور علمی کارنامے "فقہائے ہند" کی جلد چہارم کے حصہ اول میں بھی مرقوم ہیں اور حصہ دوم میں بھی۔! ان میں حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا تذکرہ تو بار بار آتا ہے ان کے علاوہ جن فضلائے عصر کی فہرست جہاں گیر نامہ وغیرہ نے بہم پہنچائی ہے، ان میں سے چند حضرات یہ ہیں: مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی، ملا عبداللطیف سلطان پوری، علامہ محمود جون پوری، ملا محمد فاضل کابلی، ملا حسن مراغی، قاضی نوراللہ شستری، میر شکراللہ شیرازی، ملا روزبہان شیرازی، میر ابوالقاسم گیلانی، ملا عبدالرحمن گجراتی، ملا نفسہائے شستری، ملا باقر کشمیری، ملا مقصود علی، شیخ محمد یمنی۔[۲۰]

---

[۲۰] جہاں گیر نامہ، ص ۲۷۹

شیخ محمد میر سے عقیدت و تعلق

جہاں گیر کو جن مشائخ کرام اور علمائے عظام سے خاص عقیدت تھی، ان میں لاہور کے شیخ محمد میر بھی شامل ہیں، جنھیں اب میاں میر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جہاں گیر اپنے تزک میں بڑے احترام سے ان کا ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

چوں بعرض رسید کہ در لاہور شیخ محمد میر نام درویشے است ہندی الاصل، بغایت فاضل و مرتاض و مبارک نفس و صاحب حال، در گوشۂ توکل و عزلت منزوی گشتہ از فقر غنی و از دنیا مستغنی نشستہ است۔ بنابریں خاطر حق طلب بے ملاقات ایشاں قرار نہ گیرد و بدیدن ایشاں رغبت افزود۔ چوں بہ لاہور رفتن متعذر بود رقعہ بخدمت ایشاں نوشتہ، شوق باطن را ظاہر ساختم، و آں عزیز باوجود کبر سن و ضعف بنیہ تصدیعہ کشیدہ تشریف آوردہ مدت ممتد تنہا با ایشاں نشستہ صحبت مستوفی داشتہ شد۔ الحق ذات شریف است و دریں عہد بغایت غنیمت و عزیز الوجود۔ ایں نیازمند از خود برآمدہ با ایشاں صحبت داشت و بسا سخنہا بلند از حقائق و معارف استماع افتاد۔ ہر چند خواستم نیازے بگزارنم، چوں پایہ ہمت ایشاں را از اں عالی تر یافتم۔ خاطر باظہار ایں مطلب رخصت نہ داد۔ پوست آہو سفید بہ جہت جائے نماز بایشاں گزرانیدم [۱۲۱]

مجھے جب پتا چلا کہ لاہور میں شیخ محمد میر نام کے ایک درویش سکونت پذیر ہیں، جو اصلاً ہندی ہیں، نہایت فاضل، پسندیدہ خو، شریف النفس اور صاحب حال بزرگ ہیں، توکل و عزلت کی زندگی بسر کرتے ہیں، فقر پر قانع اور دنیا سے بے نیاز ایک گوشے میں بیٹھے ہیں، تو طلب حق کی غرض سے ان سے ملاقات کے بغیر دل میں چین نہ آیا اور ان کی زیارت کا شوق بے قرار کرنے لگا۔ چنانچہ جب لاہور جانا مشکل ہو گیا تو

۱۲۱ھ تزک جہاں گیری، ص ۲۹۰

ان کی خدمت میں رقعہ لکھا اور اپنے باطن کا اشتیاق ظاہر کیا۔ وہ عزیز القدر بزرگ باوجودیکہ کبر سنی کو پہنچ گئے تھے اور جسم پر کمزوری کے آثار نمایاں ہو گئے تھے، تکلیف سے تشریف لائے۔ بڑی دیر تک تنہائی میں ان کی خدمت میں بیٹھنے کا موقع ملا اور خوب صحبت رہی۔ بلا شبہ وہ اونچے مرتبے کی شخصیت ہیں، اور اس عہد میں ان کا وجودِ مسعود انتہائی غنیمت ہے۔ یہ نیازمند خود باہر نکل کر ان سے ملا، ان کی صحبت سے لطف اندوز ہوا، اور حقائق و معارف سے بھرپور باتیں سننے کا بہترین موقعہ میسر آیا۔ ہر چند چاہا کہ کوئی نذر پیش کروں، مگر جب ان کے مرتبے کو اس سے بلند تر پایا تو دل نے اس کے اظہار کی اجازت نہ دی۔ البتہ جائے نماز کی شکل میں سفید ہرن کی کھال پیشِ خدمت کی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں گیر کے دل میں علما و مشائخ کی کیا قدر و منزلت تھی اور وہ کس عقیدت و احترام کے ساتھ ان سے ملتا تھا۔

برِّ صغیر میں انگریز کا قدم

جہاں گیر کا تذکرہ ختم کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برِّ صغیر میں تجارت کی غرض سے انگریز سب سے پہلے جہاں گیر ہی کے عہد میں آئے تھے۔ مختصر الفاظ میں واقعہ یوں ہے کہ ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو برطانیہ کی ملکہ الزبتھ کے عہد میں لندن کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے کا پہلا چارٹر ملا۔ کپتان ولیم ہاکنز ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا انگریز تاجر ہے جس نے ساحلِ ہند پر قدم رکھا۔ ۱۶۰۸ء میں اس کا جہاز ہیکٹر سورت کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ ہاکنز نے جہاں گیر کے دربار میں حاضر ہو کر انگلستان کے بادشاہ جیمز اوّل کا مکتوب اس کی خدمت میں پیش کیا۔ انگریزوں کی پہلی تجارتی کوٹھی ۱۶۰۸ء میں سورت میں تعمیر کی گئی۔ ۱۶۱۳ء میں بادشاہ جہاں گیر نے سورت، کھمبایت، گوگو اور احمد آباد میں کوٹھیاں بنانے کی اجازت دی۔ اسی سال انگریزوں کو سورت میں ایک فیکٹری قائم کرنے اور مغل دربار میں

سفارت کے فرائض انجام دینے کی سند حاصل ہوئی۔ بعدازاں، مچھلی پٹم میں بھی انھوں نے ایک کارخانہ قائم کیا۔ سرطامس رو پہلا سفیر تھا جو شاہِ انگلستان جیمس اوّل کی طرف سے شہنشاہِ ہند جہاں گیر کے دربار میں آیا۔ شاہی دربار میں اس کی بڑی عزت و توقیر کی گئی۔ سفیرِ مذکور چار سال فرائضِ سفارت پر مامور رہا۔ اس اثنا میں اس نے ایک کتاب بھی لکھی، جس میں ہندوستان کے بادشاہ، یہاں کے سیاسی حالات اور دربار کی کیفیات قلم بند کیں۔ اس سے پہلے ولیم ہاکنز بھی ہندوستان میں موجود تھا، وہ بھی بادشاہ سے قریبی روابط رکھتا تھا، اس نے بھی یہاں کے حالات تحریر کیے، جن میں بادشاہ کو ظالم اور سفاک قرار دیا ہے۔ ۱۶۱۵ء میں دو اور انگریز رچرڈ سٹیل اور جان کروتھر، اصفہان جاتے ہوئے دہلی سے گزرے تھے، انھوں نے بھی اپنی ڈائری میں بادشاہ پر سخت تنقید کی ہے اور یہاں کی رعایا کو مفلس لکھا ہے۔

جہاں گیر کے زمانے میں انگریز کے ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آنے، عہدۂ سفارت پر فائز ہونے اور پھر یہاں کے حالات و کوائف کو قلم بند کرنے کا تذکرہ ہم نے چند الفاظ میں اس لیے کیا ہے کہ آئندہ چل کر اس سے برِّ صغیر کی تاریخ کا رخ بالکل بدل گیا اور یہ خطۂ ارض سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے انقلاب و تغیر کے خوف ناک طوفانوں کی زد میں آگیا۔ اگر اللہ نے توفیق عطا فرمائی اور زندگی باقی رہی تو ان واقعات کی تفصیل اس کتاب کی آئندہ جلدوں میں اس کے اصل مقام پر بیان کی جائے گی۔ ان شاء اللہ العزیز۔ علیہ توکلنا والیہ المنیب۔

وفات

بہرحال بادشاہِ ہند نور الدین محمد جہاں گیر میں اگرچہ اچھائیوں کے ساتھ ساتھ بحیثیت انسان کے برائیاں بھی پائی جاتی تھیں لیکن مجموعی اعتبار سے وہ ایک اچھا حکمران تھا اور بہت سے اوصاف اس کی ذات میں سمٹ آئے تھے۔

شہنشاہ جہاں گیر کی موت حالتِ سفر میں واقع ہوئی۔ وہ کشمیر کے دورے پر تھا اور وہاں کے ایک مقام راجوڑی سے بھمبر جا رہا تھا کہ راستے میں چاشت کے وقت ہفتے کے روز ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ کو اٹھاون سال کی عمر پا کر اپنے جلوسِ سلطنت کے بائیسویں برس میں انتقال کر گیا۔ اس کی میت لاہور لائی گئی اور اسی شہر میں اسے دفن کیا گیا۔ مقامِ تدفین کا انتخاب اس کی بیوی نور جہان نے کیا تھا، جہاں اس نے اپنے خرچ سے ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا۔

اس زمانے کے سیاسی حالات کچھ ایسا رُخ اختیار کر گئے تھے کہ بابر کی نسل کے اس چوتھے عظیم بادشاہ کی رسومِ تعزیت شاہی روایات کے مطابق ادا نہ کی گئیں۔

شاہ جہان

شاہ جہان چہار شنبہ کے روز ۲۸ ربیع الاوّل ۱۰۰۰ھ کو لاہور میں پیدا ہوا، اور اس کا نام خرم رکھا گیا۔ شاہ جہان کی رگوں میں بھی جہاں گیر کی طرح راجپوت خون کی آمیزش تھی۔ اس کی ماں کا نام جودھا بائی تھا، اور وہ جودھ پور کے راجہ بھگوان داس کی بیٹی تھی۔ شاہ زادہ چار سال چار ماہ چار دن کا ہوا تو خاندانی روایت کے مطابق حصولِ علم کے لیے مکتب میں داخل کر دیا گیا، اور تحصیلِ علم سے بہرہ مند ہوا۔ لیکن یہ علم و ادراک کی کن منازل پر فائز تھا اور کس عالم سے کیا استفادہ کیا؟ اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ پھر چوں کہ اس کی کوئی تصنیف بھی نہیں ہے، اس لیے اس کی علمی گہرائی کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ بابر کے تزک اور اس کی بعض دوسری علمی سرگرمیوں سے اس کے علم و فضل کی نشان دہی ہوتی ہے، جہاں گیر کا تزک بھی اس کے معلومات کا پتا دیتا ہے۔ اورنگ زیب کے رقعات اس کی فضیلتِ علمی کے شاہد ہیں، لیکن شاہ جہان کے بارے میں ہمارے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے کہ جس سے اس کے مرتبۂ علمی کا اندازہ ہو سکے۔ البتہ اس کے بعض

فرمان بتاتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے مروّجہ علوم میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ اس کا انتخابِ الفاظ اور اسلوبِ کلام عالمانہ اور پُر وقار ہے۔ پھر اس نے اپنے بیٹوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو جس نہج سے تعلیم دلائی، اپنے دور کے مشاہیر علما سے تعلقات استوار کیے اور ان کی قدر افزائی کی، دربار میں جن اہم مباحث کا اہتمام کیا اور ایرانی علما سے خالص فنی اور علمی نوعیت کی بحثوں میں علمائے ہند کو حصہ لینے پر مامور فرمایا، وہ سب واقعات اس کی علمی پختگی اور مذہبی گہرائی پر دلالت کناں ہیں۔

یہاں یہ بات لائقِ تذکرہ ہے کہ جلال الدین اکبر کے دینی افکار بعض لوگوں کی موت کے ساتھ ہی مر گئے تھے۔ اس کی زندگی کا آخری دور تو اس کو ایک اچھے خاصے مسلمان کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اگر بالفرض کوئی بات رہ بھی گئی تھی تو جہاں گیر نے اس کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ اس ضمن میں ہندوستان کے مشہور مورخ سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن کے یہ الفاظ قابلِ مطالعہ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

جہاں گیر، ایک راجپوت شاہ زادی کا فرزند اور متعدد راجپوت شاہ زادیوں کا شوہر تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہنے میں بالکل تامّل نہیں کہ وہ علما کی تعلیمات سے پوری طرح متاثر رہا۔ ایک بار وہ ابوالفضل سے ملنے گیا، دیکھا کہ اس کے گھر پر بہت سے کاتب، کلام پاک اور تفسیر کی کتابت کرنے میں مشغول ہیں۔ ابوالفضل ہی نے اکبر کو یہ یقین دلایا تھا کہ قرآنِ مجید الہامی کتاب نہیں، کلامِ رسول ہے۔ جہاں گیر اپنے باپ کی گم راہی کا سبب ابوالفضل ہی کو قرار دیتا تھا، اس لیے وہ کاتبوں سے لے کر تمام اوراق اکبر کے پاس لے گیا اور کہا کہ ابوالفضل کا مذہب، خلوت میں کچھ اور ہے اور جلوت میں کچھ اور رہا اور اپنی تزک میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ ابوالفضل کو قتل کرانے میں اس کے مذہبی جذبے کو بھی دخل تھا۔ جہاں گیر کے تعلقات حضرتِ مجدد سے شروع میں ضرور خراب رہے، لیکن جب اچھے ہو گئے تو وہ روزانہ ان سے مغرب کے بعد ملاقات کرتا، ان ملاقاتوں سے اس کے قلب کی

تطہیر جس طرح ہوئی ہے، اس کا اعتراف حضرت مجدد صاحب نے اپنے مکتوبات میں کیا ہے۔[۲۲]

جہاں گیر کے بعد جب شاہ جہان کا دور آیا تو حالات قطعی طور سے بدل گئے تھے اور ملک میں خالص اسلامی فضا پیدا ہو گئی تھی، جس کی چند جھلکیاں اختصار کے ساتھ آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہیں۔

بغاوت اور اس کا پس منظر

جہاں گیر اپنے بیٹے شاہ زادہ خرم سے بہت متاثر تھا اور اس کو ہر اعتبار سے بادشاہت کے لائق سمجھتا تھا، اس لیے کہ شاہ زادہ خرم اوائل عمر ہی میں تدبر و شہامت کے جوہر سے آراستہ تھا، بہادری اور شجاعت میں بھی یکتا تھا، اور ان تمام اوصاف سے پوری طرح متصف تھا، جن کا ایک حکمران میں پایا جانا شرطِ اوّلین ہے۔ خرم دکن کی مہم پر گیا اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو جہاں گیر نے اسے شاہ جہان کے خطاب سے سرفراز کیا، جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس کے بعد وہی وارثِ تختِ ہند ہوگا۔ لیکن واقعات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ شاہ جہان کو باپ کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کرنا پڑا۔ ایسا کیوں ہوا اور بیٹے نے باپ کے خلاف اتنا بڑا اقدام کیوں کیا؟ اس کا ایک خاص پس منظر ہے، شاہ جہان کے واقعات کے سلسلے میں جس کی وضاحت ضروری ہے —— اس کو سمجھنے کے لیے ہم اپنے معزز قارئین کا زیادہ وقت نہیں لیں گے، مختصر الفاظ میں اس کی تفصیل یہ ہے:

نور جہان جو جہاں گیر کی چہیتی بیوی تھی، عملاً تمام کاروبارِ سلطنت پر قابض ہو چکی تھی، اور بادشاہ اس کی ہر بات مانتا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں مضبوط کرنے کے لیے ایک کام تو یہ کیا کہ اپنے بھائی آصف خاں کی بیٹی ممتاز محل کو شاہ زادہ خرم کے عقد میں دے دیا۔ دوسرے خود اپنی بیٹی جو اس کے پہلے شوہر شیر افگن

---

[۲۲] ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر۔ ص ۲۲

سے تھی، جہاں گیر کے سب سے چھوٹے بیٹے شہریار سے بیاہ دی۔ شروع شروع میں نور جہاں، شاہ زادہ خرم کی حامی تھی، اس لیے کہ وہ اس کا بھتیج داماد تھا، لیکن دکن کی مہم میں اس نے فوجی نوعیت کے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور بے پناہ فتوحات حاصل کیں، اس سے اس کی جنگی قابلیت کا شہرہ تمام ملک میں پھیل گیا اور دشمن اس سے لرزنے لگے۔ یہ بات بادشاہ کے لیے انتہائی مسرت انگیز تھی اور وہ بہادر بیٹے کی عسکری تدبیروں سے بہت خوش تھا۔ مگر نور جہاں اس سے بگڑ گئی اور اس نے اپنی ہمدردیوں کا سارا وزن شہریار کے پلڑے میں ڈال دیا جو اس کا حقیقی داماد تھا۔ اس نے یہ منصوبہ تیار کرنا شروع کیا کہ شاہ زادہ خرم نظروں سے اوجھل ہو جائے اور اس کی جگہ شہریار کو اورنگِ حکومت پر متمکن کیا جائے۔ اس کے لیے اس نے جہاں گیر کو یہ پٹی پڑھائی کہ قندھار کا علاقہ حال ہی میں فتح کیا گیا ہے، اس کے انتظام و انصرام کی طرف فوری طور پر عنانِ توجہ مبذول کرنا انتہائی ضروری ہے، وہاں کسی بہت ہی قابل اور تجربہ کار جنگی ماہر کو متعین کرنا چاہیے اور میرے نزدیک شاہ زادہ خرم اس کے لیے نہایت موزوں رہے گا، اس کے سوا کوئی دوسرا شخص وہاں کے انتظام پر قابو نہیں پا سکے گا۔ خرم بھی بڑی تیز نگاہ رکھتا تھا اور وہ نور جہاں کے ارادوں کو خوب سمجھتا تھا، چنانچہ بادشاہ نے اس کو قندھار جانے کے لیے کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا، اور ساتھ ہی بادشاہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ نے شاہی لشکر اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیا لیکن شاہ زادے نے حالات کا موازنہ کر کے اپنے آپ کو عساکرِ شاہی کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ سمجھا اور مانڈو کی طرف ہٹ گیا۔ وہاں اس کو کامیابی نہ ہوئی تو دوسری طرف رخ کیا اور بہار اور بنگال کے علاقوں پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔ جہاں گیر نے شاہ زادہ پرویز اور مہابت خاں کو فوج دے کر مقابلے کے لیے بھیجا، تو خرم شکست کھا گیا، کیوں کہ اس بغاوت میں نہ کوئی قابلِ ذکر فوج اس کے ساتھ تھی اور نہ کوئی مشہور اور

نامور جرنیل ہی اس کا حامی تھا۔ وہ تقریباً تنہا تھا۔ پہلے تو مشرقی جانب کو مچھلی بندر کی طرف بھاگا، بعد کو دکن کا رستہ لیا۔ دکن میں ملک عنبر حکمران تھا، اس نے موقعہ غنیمت جان کر خرم کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑی تکریم سے پیش آیا۔ بالآخر جب شاہ زادے نے دیکھا کہ کامیابی کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں تو بادشاہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور معافی کا طالب ہوا۔ بادشاہ نے اس شرط پر معافی دی کہ خرم اپنے دونوں بیٹوں، دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو بطورِ یرغمال کے دربارِ شاہی میں بھیج دے ــــــ خرم نے یہ شرط منظور کی اور باپ بیٹے میں مکمل صلح ہو گئی۔

ان دنوں دکن کا حکمران ملک عنبر تھا۔ اس کی طرف سے بغاوتوں اور شورشوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس کو ختم کرنے کے لیے جہاں گیر نے شاہ زادہ خرم کو ایک لشکر کے ساتھ روانہ کیا اور شاہ جہان کا خطاب مرحمت فرمایا۔ اس خطاب کے معنی اس کی ولی عہدی کے تھے۔ بادشاہ خود بھی اس کے پیچھے دکن پہنچا، مگر اس سے پہلے شاہ جہان اپنے زورِ شمشیر سے ملک عنبر کو شکست دے کر احمد نگر خالی کرا چکا تھا۔ بادشاہ گجرات ہوتے ہوئے آگرہ کو واپس آگیا۔ دو سال بعد ملک عنبر نے پھر سر اٹھایا اور شاہ جہان نے اُسے پھر شکست دی۔ اسی زمانے میں شاہ زادہ خسرو نے، جسے شاہ جہان نے بادشاہ سے سفارش کر کے قید سے رہائی دلائی تھی، وفات پائی۔

شاہ جہان نے دو مرتبہ بغاوت میں ہزیمت اٹھانے کے بعد تیسری مرتبہ پھر باپ کے خلاف اعلانِ بغاوت کیا۔ یہ اس کی آخری بغاوت تھی۔ اب اس نے دارالسلطنت آگرہ پر قبضہ کرنے کا عزم کیا۔ اس کے لیے وہ دہلی کی طرف بڑھا اور دہلی سے نو میل کے فاصلے پر فرید آباد کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ بادشاہ بھی ان دنوں دہلی میں مقیم تھا، چوں کہ شاہ جہان نے یہ اقدام ناگہانی طور پر کیا تھا اور جہاں گیر اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا، اس لیے وہ پہلے تو گھبرایا اور پھر بروقت فوجی امداد پہنچ جانے کی وجہ

سے اس کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ باپ ایک بڑی فوج کے ساتھ بیٹے کی سرکوبی کو نکلا، اُدھر شاہ جہان بھی اپنے لشکر کی معیت میں نمودار ہوا۔ دونوں طرف کی فوجیں تغلق آباد کے مقام پر ایک دوسرے کے مقابلے پر اتریں۔ لیکن شاہ زادے کی فوج کا شیرازہ آناً فاناً منتشر ہو گیا اور وہ خود بھی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس شکست سے شاہ جہان نہایت بددل ہوا، اور اس کو بے پناہ تحیّر اور پریشانی نے آگھیرا۔ آخر راہِ راست اختیار کی اور باپ کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھایا۔

ان تمام بغاوتوں کا پس منظر نور جہاں کا وہ خاص منصوبہ تھا، جس کے تحت وہ اپنے داماد شہریار کو ہندوستان کا بادشاہ بنانے پر تُلی ہوئی تھی، اور جہاں گیر کے تیسرے بیٹے شاہ جہان کو تاج و تخت سے ہر حال میں محروم کر دینا چاہتی تھی۔ یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ شہریار بالکل نالائق تھا اور کاروبارِ حکومت کا قطعی اہل نہ تھا۔ اس کے مقابلے میں شاہ جہان لائق و دانا، عاقل و فہیم اور ہر اعتبار سے سزاوارِ تختِ ہند تھا۔

داور بخش کی عارضی تخت نشینی

جہاں گیر کی وفات کے وقت اس کے دو بیٹے زندہ تھے۔ ایک شاہ جہان جو دکن میں مقیم اور اس کے انتظام میں مصروف تھا، دوسرا شہریار جو لاہور میں جہاں گیر کے پاس تھا اور اس کا چھوٹا بیٹا تھا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا نور جہاں ہر صورت میں شہریار کو ہندوستان کے تخت پر دیکھنا چاہتی تھی، اس لیے کہ وہ اس کا داماد تھا، لیکن نور جہاں کا بھائی آصف خاں، شہریار کی مخالفت پر کمربستہ تھا، وہ شاہ جہان کی بادشاہت کا متمنّی تھا، کیونکہ آصف خاں کی بیٹی ممتاز محل شاہ جہان کے حبالۂ عقد میں تھی۔ آصف خاں نے جہاں گیر کی وفات کے فوراً بعد یہ تدبیر کی کہ داور بخش عرف بلاقی خاں کو جو جہاں گیر کا پوتا اور خسرو کا بیٹا تھا، تخت پر بٹھا دیا تاکہ تختِ ہند حکمران سے خالی نہ رہے اور ادھر دکن میں شاہ جہان کے پاس تیز رو قاصد بھیج دیے کہ وہ جلد سے جلد لاہور پہنچ کر زمامِ حکومت

اپنے ہاتھ میں لے۔ آصف خاں نے شاہ جہان کو یہ بھی کہلا بھیجا کہ عارضی طور پر داور بخش (مرزا بلاقی) کو تخت نشین کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی بلا تاخیر شاہ جہان دکن سے لاہور روانہ ہوگیا، لیکن اس نے فوری طور پر آصف خاں کو ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعے اپنے دستِ خاص سے یہ فرمان لکھ بھیجا:

دریں ہنگام کہ آسمان آشوب طلب و زمین فتنہ جو است، اگر داور بخش پسرِ خسرو و برادرِ او، و شہریار و پسرانِ شاہ زادہ دانیال را آوارۂ صحرائے عدم ساختہ دولت خواہاں را از توزع خاطر و شورش دل فارغ سازند، بہ صلاح و صواب دید قرین تر خواہد بود[۲۳]

یعنی اس وقت جب کہ آسمان آشوب طلب اور زمین فتنہ جو ہے، اگر خسرو کا بیٹا داور بخش اور میرے بھائی شہریار اور فرزندان شاہ زادہ دانیال (طہمورث اور ہوشنگ) کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے تو اربابِ حکومت کے دل اس سے مطمئن ہو جائیں گے۔ یہ کام نہایت احتیاط اور بہتر طریق سے انجام پذیر ہونا چاہیے۔

چنانچہ چہار شنبہ کی شب، ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۰۳۷ھ کو اس حکم کی پوری تعمیل ہوئی اور خاتمہ تزکِ جہاں گیری کے مصنّف کے بقول:

شہریار و طہمورث و ہوشنگ پسران شاہ زادہ دانیال آوارۂ صحرائے فنا ساختند و گلشنِ ہستی را از خس و خاشاک وجود شاں پرداختند[۲۴]

شہریار اور شاہ زادہ دانیال کے فرزندوں طہمورث اور ہوشنگ کو صحرائے فنا میں پھینک دیا گیا اور گلشنِ ہستی ان کے وجود کے خس و خاشاک سے پاک کر دیا گیا۔

اس سے قبل لاہور میں آصف خاں اور داور بخش سے شہریار کی شدید جنگ ہوئی تھی، جس میں شہریار کو شکستِ فاش سے دوچار ہونا پڑا، اسے گرفتار کر کے

۲۳ھ تزکِ جہاں گیری، ص ۴۳۸، ۴۳۹- در بیان "جلوس داور بخش برادرنگِ سلطنت"
۲۴ھ ایضاً، ص ۴۳۹-

قلعۂ لاہور میں نظر بند کر دیا گیا۔ "وشہریار در قلعۂ لاہور متحصن گشتہ، در معنی بزندان در آمد۔"[۲۵]

اس کے بعد کیا ہوا۔؟

اورا بعد از چندے حسب الحکم داور بخش ہر دو چشمش از نور باصرہ معدوم الفراغ ساختند۔

اس واقعہ کے چند روز بعد داور بخش کے حکم سے اس کی دونوں آنکھیں نورِ بصارت سے محروم کر دی گئیں اور حریفوں نے اسے ناکارہ کر دیا۔

یہ حادثہ ۱۰۳۷ھ کو پیش آیا، شہریار نے جو کہ طبع موزوں رکھتا اور ذوقِ شعری سے بہرہ مند تھا، اس پر یہ شعر کہے اور ۱۰۳۷ھ اس کی تاریخ نکالی۔

زِ نرگس گلاب از چہ نتواں کشید   کشیدند از نرگسانم گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ آں   بگو "کور شد دیدۂ آفتاب"
۱۰۳۷ھ

شاہ جہان کی تخت نشینی

بہرحال شاہ جہان ہر ممکن عجلت کے ساتھ لاہور پہنچا اور والد کی وفات سے تین ماہ آٹھ روز بعد ۶ جمادی الاخریٰ ۱۰۳۷ھ کو سینتیس[۳۷] سال کی عمر میں بمقام لاہور ہندوستان کے سریر فرماں روائی پر جلوہ افروز ہوا۔ چند روز لاہور میں قیام کیا، پھر دارالحکومت آگرہ کو روانہ ہو گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ شاہ جہان کی ولادت بھی لاہور میں ہوئی اور تاجِ شاہی بھی اسی شہر میں سر پر رکھا گیا۔

شاہ جہان کی حکومت کا آغاز اگرچہ خوں ریزی سے ہوا اور اس نے اپنے حقیقی بھائی، چچیرے بھائیوں، بھتیجوں اور ان کے ہم نواؤں کو، جن سے کسی وقت بھی مخالفت یا بغاوت کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا، سب کو ایک ایک کر کے ٹھکانے لگا دیا، تاہم اس کا اکتیس[۳۱] سالہ دورِ حکومت بڑے امن و امان کا دور ہے۔ تاریخ کی

---

۲۵ تزکِ جہاں گیری، ص ۴۳۸

ورق گردانی کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ قتل وخوں ریزی عام طور سے بادشاہوں کی فطرت میں داخل رہی ہے اور ہر ایسا شخص ان کے نزدیک معتوب یا کم از کم مشکوک قرار پایا ہے، جس کی نقل وحرکت کو وہ اپنے مخصوص مفاد کے منافی سمجھتے تھے۔ پھر اس کا فیصلہ یا تو ان کی تلوار کرتی تھی یا عمر بھر کی سزائے زندان ——! شاہ جہان نے بھی اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اسی فضا میں تربیت کی منزلیں طے کی تھیں۔ اگر اس نے اپنے رشتے داروں اور عزیزوں پر سختی کا برتاؤ کیا ہے تو ان ہی اثرات کے تحت کیا ہے جو اسے خاندانی طور پر وراثت میں ملے تھے۔ اس کی تفصیلات سے کتب تاریخ بھری پڑی ہیں، لیکن یہ سب باتیں ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ہمارا کام اس کے دورِ حکمرانی کے صرف علمی اور دینی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اپنے عصر کے علماء وفقہا اور مشائخ وصلحا سے اس کے روابط کس قسم کے تھے، اس نے اپنے زمانۂ حکومت میں کون سی ایسی اصلاحات کیں جو اسلامی احکام سے ہم آہنگ تھیں، کن غیر اسلامی رسوم کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اہلِ علم کو کس قدر رومنزلت کا مستحق گردانا۔ آئیے اب خاندانِ مغلیہ کے پانچویں فرماں روائے ہند صاحبِ قرانِ ثانی سلطان ابو المظفر شہاب الدین محمد شاہ جہان کے کاروانِ حیات کے اس پہلو کا جائزہ لیں کہ ہمارا اصل موضوع یہی ہے۔

اعیانِ دولت اور عمّالِ حکومت کے نام فرمان

شاہ جہان زمانۂ شاہ زادگی میں بھی بڑا نیک خصال اور خوش اطوار تھا۔ پابندِ شریعت اور عاملِ کتاب وسنت تھا، علماء ومشائخ کی صحبتوں میں بیٹھتا اور ان سے استفادہ کرتا تھا، بلکہ صحیح روایت کے مطابق وہ حضرت مجدد الف ثانی کے حلقۂ عقیدت میں داخل تھا، بادشاہ بننے کے بعد اس کی ان خوبیوں میں مزید اضافہ ہوا۔ وہ یہ کوشش کرتا کہ کوئی قدم کتاب وسنت کے خلاف نہ اٹھے، اس کی یہ خواہش ہوتی کہ نہ وہ ذاتی طور پر مرتکبِ معصیت ہو اور نہ رعایا کو اس

کے طرزِ عمل سے کوئی تکلیف پہنچے۔ وہ ہرگز برداشت نہ کرتا تھا کہ اعیانِ دولت اور عمالِ حکومت میں سے کوئی کسی کے لیے اذیت رسانی کا باعث بنے۔ وہ حکومت کے ہر محکمے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو کتاب وسنت پر عامل دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ چترِ شاہی سر پر رکھتے ہی اس نے ہر صوبے کے قضاۃ، ارکانِ دولت اور عمالِ حکومت کے نام خطوط لکھے کہ حدود و احکامِ نوامیس الٰہی کا ہر حال میں لحاظ رکھا جائے اور کماحقہٗ اس پر عمل کیا جائے۔ شریعت کے اوامر و نواہی کی اسی طرح پابندی کی جائے جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ہدایت فرمائی ہے۔ دینِ اسلام کے بارے میں ادب و اکرام اور تعظیم و احترام کے تمام تقاضوں کو ہر لمحہ پیشِ نگاہ رکھا جائے۔ اس سلسلے میں کسی نوع کی گستاخی یا سوئے ادب کا ہرگز مظاہرہ نہ کیا جائے۔ مشتبہ چیزوں سے دامن کشاں رہا جائے، دین میں بے روی اور بے اعتدالی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ وہ امور جو بنظر بظاہر ناپسندیدہ اور مکروہ ہیں یا جن میں کسی قسم کا اشتباہ پایا جاتا ہے یا جو افعال اصحابِ بدعت کے اوضاع و اطوار سے ہم آہنگ ہیں، ان سے بہر صورت اپنے آپ کو محفوظ اور دور رکھا جائے۔ اکثر لوگوں نے بدعات کی متعدد اقسام و انواع کو اپنا رکھا ہے، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ انھیں کلی طور پر ترک کر دیں۔

اس سے آگے محمد صالح کنبو لکھتا ہے:

المنۃ للہ تعالیٰ و تقدس کہ اعلیٰ حضرت ظلِ سبحانی صاحبِ قرانِ ثانی از مبداءِ احوال فرخندہ فال تا الحال، بروفقِ احکامِ کتاب وسنت اطاعت و طاعت پیشہ کردہ اند، و طریقہ مطابعت پیروی حضرت رسول صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم پیش گرفتہ [۲۶]

یعنی شاہ جہان بادشاہ نے شروع ہی سے اپنی زندگی کو کتاب وسنت کے

---

[۲۶] عملِ صالح، ج ۱، ص ۲۱۴

احکام کے قالب میں ڈھالا اور اسی روش کو اپنایا، جو مبنی بر اسلام تھی۔ اس کا طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی تھا۔

اس پابندِ شریعت بادشاہ کے عہد میں برِ صغیر میں اسلام کو بڑی تقویت پہنچی اور بدعات و محدثات کا زور ٹوٹا، سجدۂ تعظیمی جو پہلے سے بادشاہ کے لیے مروّج تھا، موقوف ہوا، مقدمات کے فیصلے شرعِ اسلامی کے مطابق ہونے لگے اور علما و مشائخ کی قدر و منزلت میں بے حد اضافہ ہوا۔ اس نے جن امورِ خیر کی ترویج کی اور جن غلط رسوم کا خاتمہ کیا، محمد صالح کنبو لکھتا ہے کہ ان میں سے

"نہی سجدۂ تعظیم است کہ از عہدِ حضرت عرش آشیانی مقرر و معہود شدہ بود۔"[۲۷]

یعنی ایک سجدۂ تعظیمی ہے جو حضرت عرش آشیانی اکبر کے زمانے سے رائج تھا۔

شاہ جہان نے اس سے لوگوں کو منع کر دیا۔

خافی خاں اس سلسلے میں تفصیل سے کام لیتا ہے، وہ بہت سی اور چیزوں کا ذکر بھی کرتا ہے جو پہلے سے رواج پذیر تھیں، اور بادشاہ شاہ جہان نے ان سے روک دیا۔ وہ کہتا ہے کہ شاہ جہان نے ملک کی زمامِ اختیار ہاتھ میں لیتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ بعض نامشروع امور کا سدِّ باب کیا۔ مثلاً بادشاہ کی خدمت میں حاضری کے وقت، یا اس کے پانی نوش کرتے وقت یا کوئی چیز عنایت کرتے وقت سجدہ کرنا ضروری تھا، شاہ جہان نے اس غلط رسم کو ختم کر دیا۔ اس نے زمین بوس ہونے کے بجائے چار مرتبہ سلام کہنے کا حکم جاری کیا۔ علما و فضلا، اصحابِ کمال و اربابِ حال اور فقرا سے کہا کہ وہ بادشاہ سے ملاقات کے لیے آئیں تو صرف سلامِ مسنون یعنی السلام علیکم کہیں۔ رخصت کے وقت سورۂ فاتحہ پڑھیں، اس نے رائج الوقت سکّے، روپے اور اشرفی کے ایک طرف کلمۂ توحید اور خلفائے راشدین کے نام کندہ کرانے اور دوسری طرف اپنا نام لکھنے کا حکم جاری کیا۔ اپنے

---

[۲۷] عملِ صالح، ج ۱، ص ۲۱۵

والد گرامی نور الدین جہاں گیر بادشاہ کے نام کے ساتھ ''جنت مکانی'' کا لقب تحریر کرنے کا حکم دیا اور سنِ جلوس اکبری الٰہی اور سنِ شمسی کے بجائے ماہِ قمری اور سالِ ہجری لکھنے کا فرمان جاری کیا۔[۲۵]

پابندیٔ نماز اور وظائف و اوراد

شاہ جہان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ جہاں گیر کے مرتبے کا عالم تو نہ تھا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برصغیر کا یہ حکمران بڑا نیک، خدا ترس، پرہیزگار اور علم پرور بادشاہ تھا۔ علما سے اس کے گہرے مراسم تھے اور وہ ان کی بدرجہ غایت عزت کرتا تھا، صوفیا و اتقیا سے اس کو بے پناہ محبت تھی۔ اس نے اپنے دور میں اسلام اور علم کی جو خدمت کی، اس سے قبل کسی مغل حکمران کو اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے اپنے اوقاتِ شب و روز کو مختلف امور کی انجام دہی کے لیے باقاعدہ تقسیم کر رکھا تھا۔ اس میں سے ایک بڑا حصہ یادِ خدا اور نماز کے لیے وقف تھا۔ ''عملِ صالح'' کے درباری مصنف محمد صالح کنبو نے جن الفاظ میں اس کی تفصیل بیان کی ہے، ان کا ترجمہ یہ ہے:

شاہ جہان نہایت عمدہ اوصاف کا حامل بادشاہ تھا۔ اس کے اوقات غفلت اور بے پروائی سے پاک اور غلط امور سے مبرا تھے۔ اس نے اپنے اوقاتِ لیل و نہار کو اس انداز سے منقسم کر رکھا تھا کہ طلوعِ فجر سے دو گھڑی پیشتر بیدار ہو جاتا اور اللہ کے ذکر میں مصروف ہو جاتا۔ یہ وہ وقت ہے، جو اللہ کی رضا کے لیے مخصوص ہے اور اس میں عباداتِ الٰہی بہت بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ جو شخص اس وقت اپنے معبودِ حقیقی کو پکارتا ہے، اللہ اس کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ اس مبارک ساعت میں بادشاہ اس مسجد میں چلا جاتا جو اکبر آباد (آگرہ) کے ایک کونے میں تعمیر کی گئی تھی، نماز کے وقت تک وہ قبلہ رو ہو کر مصلے

---

[۲۵] منتخب اللباب حصہ اول، ص ۳۹۷

پر بیٹھا رہتا اور اللہ کی عبادت کرتا۔ (و روی توجہ بمسجدے کہ در خلوت گاہ خطۂ اکبر آباد تعمیر پذیرفتہ آوردہ تا رسیدن وقتِ نماز رو بقبلہ بر سجادۂ طاعت می نشینند)۔ نمازِ فجر کا وقت ہو جاتا تو پہلے دو رکعت سنت ادا کرتا، پھر باجماعت فرض پڑھتا۔ بعد ازاں اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتا[29]۔ اس سے فارغ ہوتا تو کاروبارِ سلطنت کی طرف عنانِ توجہ مرتکز کرتا، عمالِ حکومت کو ضروری مشورے دیتا اور ان کے مفوضہ فرائض کی انجام دہی کے بارے میں احکام صادر کرتا۔ فوج کا معائنہ کرتا اور اہل کاروں کے نام احکام و ہدایات جاری کرتا۔ ظہر کے وقت تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ ظہر کی نماز باجماعت مسجد میں پڑھتا۔ کھانا کھاتا اور قیلولہ کرتا[30]۔ عصر کی نماز بھی جماعت کے ساتھ پڑھتا[31]۔ علما کی مجلس منعقد کرتا اور پیش آئند مسائل کے بارے میں ان سے مشورے لیتا۔ مغرب کی نماز کے بعد اس کا وقت دینی اور دنیوی امور میں صرف ہوتا۔ (بعد از انقضائے وقتِ مغرب اوقاتِ اشرف بکارِ دین و دنیا صرف می نمایند[32]) نمازِ عشا جماعت کے ساتھ ادا کرتا اور پھر محل میں چلا جاتا۔ (نمازِ عشا بجماعت ادا نمودہ بمحل تشریف می برند[33])

شاہ جہان جب خواب گاہ میں جاتا، وہ دن کا وقت ہوتا یا رات کا، فصیح البیان اور شیریں کلام لوگ اس کے ساتھ ہوتے، جو اسے کتبِ سیر و تواریخ سے انبیا و اولیا، صحابہ و تابعین، ملوک و وزرا، حکما و علما اور عظیم المرتبت حضرات کے واقعات و حالات سناتے۔ گزشتہ بادشاہوں کے دستور العمل سے بھی اسے آگاہ کرتے۔ یہ واقعات وہ پردے کے پیچھے بیٹھ کر بیان کرتے۔ (در پس پردۂ خواب گاہ[34]) اس کا مطلب یہ ہے کہ محل کی خواتین بھی یہ باتیں سنتی تھیں۔

---

[29] عملِ صالح، ج ۱، ص ۲۰۱، ۲۰۲

[30] ایضاً، ص ۲۰۷

[31] ایضاً، ص ۲۰۸

[32] ایضاً

[33] ایضاً، ص ۲۰۹

[34] ایضاً

شاہ جہان کا درباری مؤرخ عبدالحمید لاہوری تو اس کے تدیّن و تقویٰ کی انتہائی تعریف کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ وہ ہر وقت باوضو رہتا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"اوقات شبا روزی آں قدوۂ اصحاب طہارت بوضو می گزرد"[۳۵]

وہ مزید لکھتا ہے:

در ادای صلوٰۃ و صیام مکتوبہ بہ نہجے کہ در کتب فقہیہ حنفیہ واقع شدہ نہایت اہتمام بہ کار می دارند[۳۶]

وہ فرض نماز روزہ اسی طریقے سے اہتمام کے ساتھ ادا کرتا تھا، جس طرح کہ فقہ حنفیہ کی کتابوں میں مرقوم ہے۔

عدل و انصاف

دورمانِ مغلیہ کا یہ بادشاہ نہایت عادل اور منصف تھا۔ اس کے عہد میں ملک کے تمام صوبوں میں امن و امان قائم تھا۔ کسی صوبے یا علاقے کے عامل اور اہل کار کو کسی شخص پر ظلم و تعدی کی جرأت نہ تھی۔ یہ مشکل تھا کہ کوئی مجرم سزا سے بچ جائے۔ بادشاہ عدل و انصاف کا دلدادہ تھا۔ رعایا خوش حال تھی اور کوئی کسی کو ہدفِ ستم نہ ٹھہرا سکتا تھا۔ جمیع خلائق کہ ودیعتِ کبریٰ خالق اند در مہدِ امن و امان مرفہ الحال باشند[۳۷]

محمد صالح کنبو کی طرح "بادشاہ نامہ" کا مصنف عبدالحمید لاہوری بھی شاہ جہان کا درباری مؤرخ تھا۔ وہ اس کی انتہائی تعریف کرتا ہے۔ اس کی پابندیٔ شریعت اور نیکی کا زور دار الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے۔ ایک مقام پر لکھتا ہے:

سنتِ سنیۂ الٰہی براں جاری است کہ ہرگاہ کارِ دین رو بہ اندراس نہد و شعارِ اسلام رخ بہ انطماس۔ بتائیدِ ایزدی یکے از بندگانِ سعادت اندوز

---

۳۵ بادشاہ نامہ، ج ۱، ص ۱۴۷ ۳۶ ایضاً

۳۷ عملِ صالح، ج ۱، ص ۲۱۰

بروئے کار آید تا بہ آبیاریٔ مساعی جمیلہ گردِ فتور از ساحتِ اسلام فرونشاند و بدستیاریٔ دین پروری و دیانت وری اساسِ شریعت را مشیّد گرداند، وچوں معابدِ اسلام رو بہ انہدام نہادہ بود و مبانیٔ شریعت رُخ بہ انعدام، ایزدِ کارساز ایں بادشاہِ اسلام نوازِ کفر گداز را اورنگ آرائے اقبال گردانید۔ بنیادِ اسلام را چناں محکم و مرصوص ساخت کہ تا روزِ نشور گردِ فتور بر دامن دوام نہ نشیند[۳۸]

اللہ کا یہ قانون برابر جاری وساری ہے کہ جب احکامِ دین رو بزوال ہو جائیں اور شعائرِ اسلام محو ہونے لگیں تو تائیدِ ایزدی حرکت میں آتی ہے اور بندگانِ سعادت اندوز میں سے کوئی ایسا بندہ ظہور میں آجاتا ہے جو اپنی مساعیٔ جمیلہ سے اسلام کے رُخِ انور پر مختلف فتنوں کی پڑی ہوئی گردو غبار کو صاف کر دیتا ہے، اور اساسِ شریعت کو مستحکم و مضبوط بنانے کے فرائض انجام دیتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں بھی جب معابدِ اسلام منہدم ہونے لگے اور شریعت کی بنیادیں ہلنے لگیں تو نصرتِ خداوندی نے اس اسلام نواز اور کفر گداز بادشاہ کو تختِ حکمرانی عطا فرمایا، جس نے اسلام کی بنیاد کو اس طرح محکم و مرصوص بنا دیا کہ تا روزِ قیامت اس کے دامن تک فتنہ و فتور کی گرد نہیں پہنچ سکے گی۔

یہ شاہ جہان کے ایک درباری مؤرخ کے الفاظ ہیں، جو اس میں ایک "مجددِ دین" کے اوصاف کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ الفاظ یقیناً مبالغہ سے خالی نہیں، کیوں کہ درباری مؤرخ اور شاہی مصنف، حکمران کے لیے ہمیشہ اِسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے آئے ہیں۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہ جہان بحیثیتِ مجموعی بڑے اونچے کردار کا بادشاہ تھا، وہ نماز روزے کا پابند اور اسلام کی ترقی کا خواہاں تھا، دینی احکام واوامر پر خود بھی کاربند رہتا اور ارکانِ دولت کو بھی اس کا پابند دیکھنا چاہتا تھا، ملک کی مضبوطی اور رعایا کی خوش حالی اس کا مطمحِ نظر تھا، علماء و مشائخ کا قدردان تھا، ملک کے دور دراز حصوں سے بھی

---

[۳۸] بادشاہ نامہ، ج ۱، ص ۱۳۸

اگر اس کے علم میں یہ بات آجاتی کہ وہاں بدعات و محدثات اور خلافِ شرع رسوم و عوائد نے قدم جما لیے ہیں تو ان کو ختم کرنے کی کوشش کرتا اور اپنی قلمرو سے غلط چیزوں کو مٹانے میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتا۔ چند واقعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ وہ واقعی "بادشاہِ دین پناہ" تھا۔ غیر اسلامی امور کا قلع قمع کرنا اور اسلام کی ترقی کے ذرائع بروئے کار لانا اس کے مقاصدِ حیات میں داخل تھا۔

ایک نہایت قبیح رسم کا خاتمہ

خدمتِ شاہی میں عرض ہوا کہ علاقہ بھمبر[۳۹] کے مسلمان اپنی جہالت کی بنا پر ہندوؤں کو لڑکیاں دیتے اور ان سے لڑکیاں لیتے ہیں۔ ان کے درمیان یہ طے پایا ہے کہ جو ہندو لڑکی اپنے مسلمان سسرال میں مرے وہ دفن کی جائے اور جو مسلمان لڑکی ہندوؤں کے گھر فوت ہو، اسے جلایا جائے۔ اس اطلاع پر دربارِ شاہی سے یہ حکم ہوا کہ جس ہندو کے گھر میں مسلمان عورت ہو، اگر وہ ہندو اسلام قبول کر لے تو اس مسلمان عورت سے اس کا نکاح دوبارہ پڑھا جائے، ورنہ مسلمان عورت کو اس سے الگ کر دیا جائے۔ چنانچہ "جوکو" نام کا ایک زمیندار جس سے یہ فعل سرزد ہوا، اپنے تمام قبیلے کے ساتھ مسلمان ہوا، اور اسے "راجا دولت مند" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ بادشاہ نے اس رسمِ قبیح کو ختم کرنے کا حکم دیا اور مسلمانوں کی جہالت دور کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے قاضی اور معلم مقرر کیے تاکہ وہاں احکامِ شریعت پر عمل کیا جائے اور شرعی عبادات انجام دینے کے صحیح طریقے بروئے کار لائے جائیں[۴۰]۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو۔

---

[۳۹] یہ علاقہ اب آزاد کشمیر میں واقع ہے۔

[۴۰] بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۵۷۔

ہندوؤں کے قبضے سے مسلمان عورتوں کی رہائی اور مساجد کی واگزاری

جب بادشاہ کی سواری پنجاب کے قصبہ گجرات میں پہنچی تو وہاں کے سادات و مشائخ نے عرض کیا کہ یہاں کے بعض ہندوؤں نے مسلمان عورتوں کو اپنے گھروں میں ڈال رکھا ہے۔ (ان کے الفاظ یہ ہیں: برخے از کفارِ نابکار حرائر و امائے مومنہ در تصرّف دارند) اور ان میں سے بعض تو یہاں تک سرکشی پر اُتر آئے ہیں کہ انھوں نے مسجدوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس پر بادشاہ نے شیخ محمد گجراتی کو جو علوم رسمیہ کے عالم اور نومسلموں کے داروغہ تھے، حکم دیا کہ واقعہ کے ثبوت کے بعد مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضے سے آزاد کرائیں اور مسجدوں اور غیر مسلموں کی عمارتوں کو علیحدہ علیحدہ کرائیں۔ چنانچہ شیخ مذکور نے ستّر مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضے سے نکالا اور جہاں جہاں ہندوؤں نے مسجدوں پر ناجائز تسرف کر رکھا تھا، تحقیق کے بعد انھیں واگزار کرایا، اور غیر مسلموں سے جرمانہ وصول کرنے کے بعد مسجدوں کو بحال کیا[۱۴۱]

اسی طرح خافی خاں لکھتا ہے:

صوبہ کابل کی ایک انتہائی مذموم رسم ختم کرنے کا حکم

صوبہ کابل کی خبروں اور وہاں کے گورنر لشکر خاں کی اطلاع سے پتا چلا کہ افغان آئینِ شرع کی بالکل پیروی نہیں کرتے۔ بلکہ انھوں نے ایک گمراہ پیر کے احکام کو (نعوذ باللہ) آیت و حدیث کا درجہ دے کر ملحدوں کے طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ وہ بیویوں سے شرعی طور پر نکاح نہیں کرتے، بلکہ ایک گائے یا بیل ذبح کر کے اپنے ہم مشربوں کی ضیافت کرتے ہیں اور اس کے بعد بغیر کسی عقدِ نکاح کے ازدواجی تعلقات شروع کر دیتے ہیں۔ عورت کو طلاق دینا مقصود ہو تو وہ تین سنگریزے عورت کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور اس کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ بیوہ عورتیں

---

[۱۴۱] شاہ نامہ، ج ۲، ص ۵۷، ۵۸

ان کے رواج سے مطابق ترکے میں داخل ہیں اور میت کے وارث کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ چاہے تو اُن سے نکاح کرلے اور چاہے تو کسی کو ہبہ یا فروخت کردے۔ جو بدنصیب مسافر اس سرزمین میں جا پہنچتا ہے، اسے یہ لوگ حلال شکار قرار دیتے ہیں اور اُسے فروخت کرکے آمدنی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ یہ لوگ میت کے ورثے میں سے بیٹیوں کو کوئی حصّہ نہیں دیتے اور قتل و انتقام اور رہزنی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کو بہت بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد بادشاہ کی طرف سے حکم ہوا کہ "احکام تورہ و شریعت" کے مطابق ان لوگوں کو زجرو تنبیہ کی جائے، چنانچہ بڑی سختی کے بعد جس میں کئی مرتبہ فساد و بلوے کی نوبت آئی، آہستہ آہستہ ان لوگوں کی بدعتیں کم ہوئیں، لیکن بالکل رفع پھر بھی نہ ہوئیں ——— اور خافی خاں اس واقعہ کے پانچ سال بعد لکھتا ہے: چنانچہ تاحال آثار آں بدعتہائے مذموم دراں قوم باقیست [۴۲] (اب بھی ان مذموم بدعتوں کے آثار اس قوم میں باقی ہیں)۔

ہگلی کے فرنگیوں کی گوشمالی

آج سے کم و بیش ~~بتیس~~ سنتیس [۳۵] سال پیشتر ملک کی ارائیں برادری کے ترجمان ہفت روزہ "الراعی" (لاہور) میں "پابندیٔ شریعت اور شاہ جہان" کے عنوان سے پروفیسر علم الدین سالک مرحوم کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے شاہ جہان کی اسلامی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے "بادشاہ نامہ" کی جلد اوّل کے حصّہ اوّل کے حوالے سے ہگلی کے فرنگیوں سے متعلق ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ پروفیسر صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

۱۰۴۲ھ میں ہگلی کے فرنگیوں نے بنگال میں بڑا اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ نہ صرف وہاں کے سیاسی معاملات میں مداخلت کرتے تھے بلکہ لوگوں کو زبردستی عیسائی بھی بناتے تھے اور اپنے مذہب کی تبلیغ میں بے حد سختی سے کام لیتے تھے۔ دولت کا لالچ دے کر لوگوں کو ورغلاتے اور مسلمانوں کے ساتھ نہایت برا سلوک روا رکھتے تھے۔ یہ حالات شاہ جہان کے علم میں شہزادگی کے زمانے میں آئے

۴۲۔ منتخب اللباب، حصّہ اول، ص ۴۲۳، ۴۲۴

تھے، اور جیسا کہ عمل صالح اور بادشاہ نامہ سے معلوم ہوتا ہے، شاہ جہان اسلام کا جھنڈا بلند کرنے اور کفر کو مٹانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے عزم کر لیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے بادشاہ بنا دیا تو وہ ان دیار کو ان گمراہ لوگوں سے ہمیشہ کے لیے پاک کر دے گا۔ چنانچہ تخت نشینی کے بعد جب اُسے موقع ملا تو اس طرف توجہ مبذول کی اور ہگلی کے نصرانیوں سے ان کے غیر آئینی رویے کے بارے میں باز پرس کی۔ اس نے ۱۰۴۲ھ میں تربیت خاں کو تحقیقِ حالات کے لیے بنگال بھیجا۔ مگر ہگلی کے فرنگیوں نے مصالحت کی طرف ہاتھ بڑھانے کے بجائے فسادات کو دعوت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک معمولی جھڑپ کے بعد ان کا سارا زور ٹوٹ گیا اور بہت سے فرنگی قید کر لیے گئے۔ یہ فرنگی ۱۱ محرم ۱۰۴۳ھ کو عنایت اللہ، قاسم خاں اور بہادر خاں کمبو کی نگرانی میں بنگالہ سے پایۂ تخت (آگرہ) میں لائے گئے۔ ان کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ ان کے پاس بت بھی تھے، جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ یہ سب لوگ بادشاہ کے حضور پیش کیے گئے۔ بادشاہ نے اربابِ شریعت کی طرف رجوع کیا اور کہا کہ انھیں اسلام کی دعوت دی جائے اور اسلامی احکام سے روشناس کرایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے تو اسلام قبول کر لیا مگر زیادہ افراد نے انکار کر دیا۔ جن لوگوں نے انکار کیا تھا، انھیں اس زمانے کے آئین کے مطابق امرائے دولت میں تقسیم کر دیا گیا۔

بدعات کا خاتمہ اور ٹیکسوں کی معافی

۱۰۴۳ھ کو شاہ جہان کشمیر گیا، اس زمانے میں وہاں کا ناظم اعتقاد خاں تھا، بادشاہ کو معلوم ہوا کہ اعتقاد خاں رعایا پر بے حد جبر و تشدد کر رہا ہے۔ اس نے ملک میں بہت سی بدعتیں جاری کر رکھی ہیں، پھل دار درخت ضبط کر لیے ہیں، باغ اور جنگل اپنی تحویل میں لے لیے ہیں، زعفران کی چنائی میں لوگوں سے بیگار لیتا اور انھیں پریشان کرتا ہے۔ یہ باتیں سن کر شاہ جہان نے اعتقاد خاں کو منصب نظامت سے علیحدہ کر دیا اور اس کی جگہ ظفر خاں احسن کو کشمیر کا ناظم مقرر کیا اور حکم دیا کہ اعتقاد خاں کے الزامات کی فہرست تیار کر کے پیش کی جائے۔ جب فہرستِ الزامات سامنے آئی تو بادشاہ نہایت حیران اور خفا ہوا۔ اُس نے اعتقاد خاں کے زمانے کی رائج کردہ

تمام بدعات منسوخ کر دیں اور عوام کی آگاہی کے لیے ایک فرمان تیار کیا، جس کے الفاظ پتھر پر کندہ کیے گئے اور اسے جامع سکندری کے دروازے پر نصب کیا گیا۔ یہ فرمان شاہ جہان کی معدلت گستری، رعایا پروری، رحم دلی اور عوام کے حقوق کے تحفظ کی بیّن دلیل ہے۔ اس کے ابتدائی الفاظ قابلِ مطالعہ ہیں جو درجِ ذیل ہیں:

"ہماری سلطنت کا مقصد خلقِ خدا کی حاجت روائی ہے۔ علاقہ کشمیر میں بعض اس قسم کے امور کا ارتکاب ہو رہا تھا جو رعایا کے لیے موجبِ آزار اور باعثِ تکلیف تھے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ ان تمام امور کو منسوخ سمجھا جائے"

۱۔ اس فرمان کی رُو سے زعفران چننے کے لیے لوگوں سے جو بیگار کی جاتی تھی، وہ حکماً بند کر دی گئی اور حکم ہوا کہ آئندہ سے مناسب اجرت پر مزدوروں سے کام لیا جائے۔

۲۔ رعایا کے لوگ سرکاری جنگلات سے ایندھن کاٹا کرتے تھے، اس کے لیے انھیں دو درم کے خروار دینا پڑتے تھے، اعتقاد خاں نے یہ رقم دگنی کر دی تھی۔ اب یہ ٹیکس بالکل معاف کر دیا گیا ہے۔

۳۔ اعتقاد خاں کے دورِ نظامت میں مانجیوں کو، وہ بوڑھے ہوں یا جوان، یا کم سن بچے، پچھتر درم سالانہ ادا کرنا پڑتے تھے، حالانکہ اس سے پہلے مانجیوں کے درمیان عمر کا امتیاز تھا۔ جوانوں سے ساٹھ، بوڑھوں سے بارہ اور بچوں سے چھتیس درم لیے جاتے تھے۔ شاہ جہان نے اعتقاد خاں کے اس نئے ٹیکس کو موقوف کر کے پہلا طریقہ بحال کر دیا۔

۴۔ ارضِ کشمیر کے وہ دیہات، جن کی شال کی پیداوار چار سو خروار سے زیادہ تھی، اور جن سے اعتقاد خاں ٹیکس وصول کرتا تھا، انھیں ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

۵۔ کشمیر کے صوبے دار (گورنر) ان افراد کو ملازم رکھتے تھے، جو لوگوں کے باغات میں جاتے اور بہترین پھلوں کی تلاش میں رہتے تھے، جس باغ میں اچھا پھل

دیکھتے، اسے صوبے دار کے لیے محفوظ کر لیتے۔ اس ظلم کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے پھلوں کی کاشت بند کر دی۔ اب اس سلسلے کو حکماً بند کر دیا گیا، کوئی ناظم اور گورنر اس حرکت کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا[۴۴]

پروفیسر علم الدین سالک مرحوم کے پینتیس[۴۵] سال پیشتر کے تحریر کردہ مضمون کی رو سے شاہ جہان کا یہ فرمان اب تک کشمیر کی جامع مسجد سری نگر کے دروازے پر نصب ہے اور اس کے عدل و انصاف کی شہادت دے رہا ہے۔

بادشاہ کا فرض

شاہ جہان قدیم بادشاہوں کے واقعات سننے اور پڑھنے کا بہت شائق تھا، وہ ان کے غلط واقعات سے عبرت حاصل کرتا اور صحیح واقعات کو اپنے لیے مشعلِ راہ قرار دیتا۔ جب اس کے سامنے سلاطینِ روم، شاہانِ قزلباش، ملوکِ ایران اور فرماں روایانِ توران کے واقعات بیان کیے جاتے تو وہ لرز اٹھتا اور اس کے چہرے پر خاص قسم کے تاثرات نمایاں ہو جاتے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کسی بادشاہ کی کمزور رعایا اطمینان اور امن سے زندگی نہیں بسر کر سکتی تو وہ بادشاہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے، حکومت کا منصبِ جلیلہ اس سے چھین لینا چاہیے، وہ اس کا حق دار نہیں ہے ـــــ بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ رعایا کے ہر پہلو پر نظر رکھے اور ان کے حقوق کی پوری پوری نگاہ داشت کرے۔

اللہ کی عبودیت کا اقرار

پروفیسر علم الدین سالک نے اپنے مطبوعہ مضمون ("الراعی"۔ لاہور) میں شیر خاں لودھی کی "مرآۃ الخیال" (صفحہ ۴۸) کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب شاہ جہان کا تختِ طاؤس تیار ہو گیا اور وہ اس پر بیٹھا تو فوراً نیچے اتر آیا۔ خشوع و خضوع سے دو

---

[۴۴] منتخب اللباب، ج ۱، ص ۱۵۰ ـــــ عملِ صالح، ج ۲، ص ۶۴ ـــــ بادشاہ نامہ، ج ۱ حصہ دوم، ص ۵۷، ۵۸

رکعت نفل ادا کیے اور دیر تک سجدے میں پڑا رہا۔ سجدے سے سر اٹھایا تو حاضرینِ دربار سے مخاطب ہو کر کہا

"فرعون کا تخت آبنوس اور ہاتھی دانت کا تھا، اس نے اس پر بیٹھ کر خدائی کا دعویٰ کیا۔ اے حاضرینِ دربار! تم اس پر گواہ رہنا کہ میں اس مرصع تخت پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ عبودیت کا اقرار کرتا ہوں۔"

شاہ جہان کی زندگی کے اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں، جو عمل صالح، بادشاہ نامہ، منتخب اللباب اور دیگر کتبِ تاریخ میں مرقوم ہیں، جی چاہتا ہے کہ اس عادل اور دین پناہ بادشاہ کے اکتیس سالہ دورِ حکومت میں پھیلے ہوئے مزید واقعات حوالۂ قرطاس کیے جائیں مگر تنگ دامانیٔ صفحات بار بار قلم کا دامن کھینچتی اور تفصیلات کی وادی میں جانے سے روکتی ہے۔

دورِ شاہ جہان کے علما و مشائخ

دورِ شاہ جہان میں متعدد علما و مشائخ اور فقہائے عظام دیارِ ہند میں رونق افروز تھے اور مختلف بلاد و قصبات میں ان کے درس و افادہ کی مسندیں آراستہ تھیں۔ اس کتاب میں بہت سے مقامات پر اُن کا تذکرہ قارئینِ کرام کے مطالعہ میں آئے گا۔ شاہ جہان کے وزرا میں بھی جیّد علما شامل تھے، جن میں ایک علامی محمد افضل تھے، جو معقولات و منقولات کے جلیل القدر عالم تھے اور معاملاتِ سلطنت میں بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ شاہ جہان ان پر بڑا اعتماد کرتا تھا اور وہ فطانت و فراست میں یگانۂ روزگار تھے، ان کے بعد علامی سعد اللہ خاں چنیوٹیؒ کو اس منصبِ رفیع پر فائز کیا گیا، وہ بھی خطۂ ہند کے وسیع العلم بزرگ تھے اور ان کے علوم و معارف کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ معقول و منقول کی تفصیلات و جزئیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کے حالات علیحدہ باب کے متقاضی ہیں، افسوس ہے، ہم ان کے کوائفِ زندگی کتاب کے اصل مقام پر، [سن کی ذیل میں] قلم بند نہ کر سکے۔ اس سہو پر ہم اپنے معزز قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ وہ فراوانیٔ علم و فضل کے ساتھ ساتھ انتظامِ مملکت اور جنگ و حرب کا بھی

وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ یورپین مؤرخین بھی ان کی تعریف پر مجبور ہیں، چنانچہ الفنسٹن لکھتا ہے کہ "ہندوستان میں جتنے وزرا گزرے ہیں، سعد اللہ خاں ان سب سے زیادہ لائق اور راست باز تھا"

بہرحال عہدِ شاہ جہانی کے علمائے کرام کی وسیع فہرست میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں:

شیخ میاں میر محمد سیوستانی لاہوری، سید محمد بخاری، شیخ بلاول قادری، مولانا محب علی سندھی، خواجہ خاوند محمود، ملا خواجہ بہاری، شیخ صادق برہان پوری، میاں شیخ پیر محمد، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مفتی نور الحق دہلوی، میر شکر اللہ شیرازی، علامی سعد اللہ خاں، ملا شفیعائی یزدی، ملا محمد فاضل بدخشی، مولانا عبدالسلام لاہوری، علامہ محمود جون پوری، مولانا عبداللطیف سلطان پوری لاہوری، مولانا محمد یعقوب لاہوری، مولانا عوض وجیہہ سمرقندی، مفتی عبدالسلام دیوی، مولانا ابوالفتح ملتانی۔

شجاعت اور فتوحات

تیمور کے خون میں شجاعت کی گرمی کے اثرات نمایاں طور سے نظر آتے ہیں۔ شاہ جہان اس وراثتِ تیموری کا بہت بڑا حصے دار تھا۔ بابر سے شاہ جہان تک پوری نسلِ تیموری بہادری اور شجاعت کا مرقع ہے، جس میں کسی ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنا مشکل ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں بڑی فتوحات ہوئیں، اس نے کئی علاقائی سلطنتوں کو مسخر کیا، بہت سے اہم مقامات پر فوج کشی کی اور متعدد نئے صوبوں پر علمِ مغلیہ لہرایا۔ ان واقعات کی تفصیلات جو تاریخ نے بہم پہنچائی ہیں اگرچہ بڑی تحیر انگیز اور سبق آموز ہیں مگر ہمارے موضوع سے خارج ہیں، اس لیے ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔

علمی، ثقافتی اور تہذیبی ترقی

شاہ جہان کے عہد میں بے شک اکبر کی طرح سرکاری اہتمام میں کتابوں کی تصنیف و تراجم کی طرف توجہ نہیں دی گئی، مگر علما نے اپنے طور پر بہت کتابیں لکھیں اور بے حد علمی کام کیا۔ بہت سے حواشی و تعلیقات شاہ جہان کے نام معنون کیے اور اس

میں اس نے علما کی بے حد حوصلہ افزائی کی۔ پھر خود اس نے جو ثقافتی اور تہذیبی نقوش برصغیر کی سرزمین میں ثبت کر دیے ہیں، وہ ہمیشہ اس کی رفعتِ ذہن و فکر کی شہادت دیتے رہیں گے۔ مثلاً آگرے کا تاج محل، دہلی کی جامع مسجد، لال قلعہ، تختِ طاؤس لاہور کا شالیمار باغ، اس کی ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کے عظیم شاہ کار ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے اس وسیع خطۂ ارض میں بے شمار مسجدیں واگزار کرائیں، ہندوؤں کی نئی عبادت گاہوں کی تعمیر پر موقع و محل کے اعتبار سے مناسب حد تک پابندیاں عائد کیں اور ان کے غرور و پندار کا زور توڑنے کی کوشش کی، تاکہ اس کے دادا جلال الدین اکبر کے زمانے سے جو سلسلہ چلا آ رہا تھا، وہ اپنے جائز اور مقررہ حدود سے آگے نہ بڑھ پائے۔

معزولی اور وفات

شاہ جہاں، اکتیس۳۱ سال حکومت کرنے کے بعد شعبان کی آخری تاریخ ۱۰۶۸ھ کو تختِ فرماں روائی سے الگ ہوا اور شروع رمضان میں قلعۂ آگرہ کو اس نے اپنا مسکن ٹھہرایا۔ معزولی سے آٹھ سال بعد دوشنبہ کے روز ۲۶ رجب ۱۰۷۶ھ کو اسی قلعہ میں قیدِ حیات سے رہائی پائی۔ اس کا یہ آٹھ سال کا عرصہ تلاوتِ قرآنِ مجید، اور اوراد و وظائف اور بعض جید علمائے کرام کی صحبت میں گزرا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

شاہ جہاں کے آخری دورِ حیات کا تعلق چوں کہ اس کے بیٹے اورنگ زیب عالم گیر سے ہے، اس لیے اگر اللہ نے توفیق دی اور زندگی عطا فرمائی تو اس کے ضروری کوائف "فقہائے ہند" کی جلد پنجم کے مقدمے میں اورنگ زیب عالم گیر کے حالات کے ضمن میں بیان کیے جائیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔ اللھم وفقنی لما تحب وترضی۔ وما توفیقی الا باللہ العظیم۔

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

۲۳ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۸ھ

۳۱ مئی ۱۹۷۸ء

گیارھویں صدی ہجری

حصّہ دوم

ع

ا۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی برصغیر پاک و ہند کے آسمانِ علم و فضل کے درخشندہ ستارے تھے۔ انھوں نے مسندِ تدریس تو عہدِ جہانگیری ہی میں آراستہ کرلی تھی لیکن شہرت و ناموری کی منزلیں عہدِ شاہ جہانی میں طے کیں۔ ان کی تصنیفات کو عالمِ اسلامی میں نہایت قدر و اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ساڑھے تین سو سال کا طویل عہد گزر جانے کے باوجود ان کی فضیلت و عظمت کا جھنڈا آج بھی پوری شان و شوکت کے ساتھ علمی دنیا میں لہرا رہا ہے۔

ولادت

مولانا ممدوح ۹۸۰ھ کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ عہدِ عالم گیری کے معروف مؤرخ بختاور خان (متوفی ۱۰۹۴ھ) نے مرآۃ العالم میں ان کی تاریخ ولادت لفظ **حفظ** میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "تاریخ تولدش لفظ حفظ گفتہ اند۔" [ح ۸ ف ۸۰ ظ ۹۰۰] بعض لوگوں نے ۹۶۸ھ بھی تحریر کی ہے، جسے بختاور خاں کے مقابلے میں صحیح نہیں ٹھہرایا جاسکتا، کیونکہ بختاور خاں مولانا سیالکوٹی کے فرزند مولانا عبداللہ لبیب کے ہم عصر تھے اور ان کو نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ظاہر ہے، انھوں نے مولانا سیالکوٹی کی زندگی سے متعلق معلومات خود مولانا عبداللہ لبیب سے حاصل کی ہوں گی، جنھیں بہرحال صحیح اور مستند مانا جائے گا۔ مولانا کے والد کا نام شمس الدین تھا، جیسا کہ عام طور پر

وہ اپنی تصنیفات کے شروع میں ان الفاظ میں اس کا ذکر کرتے ہیں :

فیقول العبد المسکین عبد الحکیم بن شمس الدین -

حصولِ علم

مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی نے مولانا کمال الدین کشمیری سے اخذِ علم کیا۔ مولانا کمال الدین کا سلسلۂ درس پہلے کشمیر میں جاری تھا۔ بعد کو سیالکوٹ منتقل ہو گئے تھے، اور اسی شہر کو اپنا مرکزِ درس و افادہ قرار دے لیا تھا۔ مولانا کمال الدین اپنے عصر کے جیّد اور فحول علما میں سے تھے، پیکر زہد و تقویٰ اور عالمِ باعمل تھے۔ علومِ عقلیہ و نقلیہ پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ مولانا کمال الدین کے زمانے میں کشمیر کا گورنر حسین نامی ایک شخص تھا۔ ۹۷۱ھ میں وہ کسی وجہ سے حسین سے ناراض ہو کر سیالکوٹ آگئے تھے۔ طویل عرصہ تک وہاں تدریس و تعلیم میں مصروف رہے۔ باشندگانِ لاہور کو بھی ان کی تدریس سے بہرہ اندوز ہونے کے مواقع میسر آئے اور یہاں بے شمار تشنگانِ علوم نے استفادہ کیا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے بھی ان سے تحصیل کی اور علامی سعد اللہ خاں نے بھی، جو بعد میں شاہ جہان کے وزیر مقرر ہوئے، ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مولانا کمال الدین نے ۱۰۱۷ھ کو لاہور میں وفات پائی۔ ان کے ایک بھائی مولانا جمال الدین کشمیری تھے، وہ بھی وقت کے صاحبِ علم اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔

تذکرہ نگاروں نے اگرچہ مولانا کمال الدین کشمیری کے علاوہ مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی کے کسی اور استاذ کا ذکر نہیں کیا، تاہم بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دیگر اساتذہ سے بھی اخذِ علم کیا تھا۔ چنانچہ سید احمد قادری نے شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے تلامذۂ حدیث کے ضمن میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے رسالہ انسان العین کے حوالے سے لکھا ہے کہ غالباً مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی بھی شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے تلمیذ تھے۔[۱]

شاہ ولی اللہ نے اپنی تصنیف "انسان العین فی مشائخ الحرمین" میں اپنے ان

---

[۱] تذکرہ شیخ عبد الحق محدث، ص ۱۵۸

بعض اساتذہ کا ذکر کیا ہے، جن سے انھوں نے اسنادِ حدیث حاصل کیں، ان میں شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی بھی شامل ہیں، ان کے حالات لکھتے ہوئے وہ فرماتے ہیں

خرقہ و اجازت از بزرگان بسیار گرفت . . . ازاں جملہ شیخ عبداللہ لاہوری، در سبب ملا عبدالحکیم سیالکوٹی از وے روایت کند - عن شیخ عبداللہ اللبیب عن مولانا عبدالحکیم، و کتب شیخ عبدالحق محدث دہلوی بہمیں واسطہ از مولانا عبدالحکیم روایت کند و وے از شیخ عبدالحق اجازۃً و روایۃً۔[۲]

شاہ ولی اللہ صاحب کے اس بیان سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا، وہاں یہ حقیقت بھی منقح ہو جاتی ہے کہ خود شاہ صاحب بھی مولانا سیالکوٹی کے شجرۂ نسبِ علمی میں شامل ہیں۔ یعنی ان کی سندِ علمی اس طرح ہو گی —— شاہ ولی اللہ دہلوی نے شیخ ابو طاہر محمد سے، انھوں نے شیخ عبداللہ لاہوری سے، انھوں نے شیخ عبداللہ لبیب سے اور انھوں نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے تحصیل کی۔

مسندِ درس و تدریس

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا سیالکوٹی نے لاہور میں مسندِ درس کو رونق بخشی اور ان کی علمی شہرت دور دراز کے علاقوں تک پہنچی، جس سے متاثر ہو کر کثیر تعداد میں علماء و طلبا ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہونے لگے - لالہ سجان رائے بٹالوی ان کے فیضانِ علم کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

وطلبۂ علم از ممالکِ دور و نزدیک در مدرسۂ متبرکۂ ایشاں رسیدہ فیض یاب شدند۔[۳]

یعنی طلبائے علم دور و نزدیک کے ممالک سے ان (مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی) کے مدرسہ مبارکہ میں پہنچتے اور دولتِ علم سے فیض یاب ہوتے تھے۔

لاہور کے جس مدرسے میں مولانا نے درس و افادہ کا آغاز کیا، یہ وہی مدرسہ تھا جو

---

[۲] انسان العین فی مشائخ الحرمین ص ۱۹۸، ۱۹۹ [۳] خلاصۃ التواریخ - ص ۷۳

مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے قائم کیا تھا اور یہ اس زمانے کا عظیم الشان مدرسہ تھا، اس میں مولانا موصوف کا تقرر سرکاری طور پر عمل میں لایا گیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق اسی مدرسے کے دورِ تدریس میں وہ "فاضل لاہوری" کے عظیم لقب سے ملقب ہوئے[۵۴] سلم العلوم کے نامور شارح ملا حمد اللہ، ان کا قول پیش کرتے وقت انھیں، قال الفاضل اللاھوری، کے پُر شکوہ الفاظ سے یاد فرماتے ہیں — اس مدرسے میں وہ خاصی مدت تک مصروفِ تدریس رہے اور اس اثنا میں ان سے متعدد علما و طلبا نے استفادہ کیا۔

مولانا عبدالحکیم، سیالکوٹ۔ کر اس [illegible] سے کی مسندِ تدریس پر بھی فائز رہے، جس میں ان کے مرحوم استاذ مولانا کمال الدین طلبا کو مستفید کرتے رہے تھے۔ مولانا کشمیری کی وہ مسجد جو اُن کی عظیم دینی درس گاہ تھی، اب بھی سیالکوٹ میں موجود ہے، اور ان کے لائق شاگرد مولانا عبدالحکیم کے مدرسے کے کچھ آثار بھی ہنوز باقی ہیں۔

ایک زمانے میں مولانا سیالکوٹی کو اکبر آباد (آگرہ) کے اس سرکاری مدرسے میں مدرّسِ اعلیٰ کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا، جس کی بنیاد جلال الدین اکبر نے رکھی تھی۔ اس مدرسے میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور مشہور شاعر قدسیؔ ایک ہی وقت میں فرائضِ درس و تدریس انجام دیتے تھے۔[۵۵]

عہدِ جہاں گیری میں

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی علمی شہرت اگرچہ عہدِ جہاں گیری میں بھی حلقۂ اہلِ علم میں کافی پھیل گئی تھی، مگر اس کا دائرہ محدود تھا، کیوں کہ اس زمانے میں مولانا عزلت و انزوا کی زندگی بسر کر رہے تھے اور خاموشی سے خدمتِ علم میں مصروف تھے۔ سرکاری حلقے ان کی آواز سے آشنا نہ تھے۔ جہاں گیر کے عہد میں ان کا اسمِ گرامی اس عصر کے فضلا میں تو شامل تھا، جیسا کہ "اقبال نامہ جہاں گیری" میں ان کا نام "ذکر فضلا کہ معاصر زمان اشرف بودند"

---

[۵۴] ملاحظہ ہو روضۃ الادبا۔ ص ۱۴۳ [۵۵] رودِ کوثر۔ ص ۳۹۱

کی ذیل میں درج ہے، لیکن دار السلطنت سے دور، سیالکوٹ میں اقامت گزین ہونے کی وجہ سے بادشاہ ان کے مرتبۂ علم سے واقف نہ تھا- اس کی شہادت عبد الحمید لاہوری کے ان الفاظ سے ملتی ہے :

دراایامِ سعادت فرجام حضرت جنت مکانی بضروریاتِ معیشت درساختہ عزلت گزین بود[۶]

یعنی سلطان جہاں گیر جنت مکانی کے عہدِ حکومت میں وہ اپنی معاشی ضرورتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے عزلت گزین ہی رہے۔

فرحت الناظرین میں محمد اسلم پسروری نے بھی یہی لکھا ہے کہ جنت مکانی جہاں گیر کے زمانے میں مولانا عبد الحکیم معاشی لحاظ سے قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

دراایام جنت مکانی بکم وبیش ساختہ بقناعت می گزرانید[۷]

عہدِ شاہ جہان میں

ہندوستان کے تختِ حکومت پر شاہ جہان متمکن ہوا تو مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی کی قدرومنزلت میں بے پناہ اضافہ ہوا- وہ کئی مرتبہ دہلی گئے، بارہا دربارِ شاہی میں پہنچے اور ہر مرتبہ گراں قدر عطایا و ہدایا سے سرفراز ہوئے۔ شاہ جہان ان کی اس درجہ قدرومنزلت کرتا تھا اور اس کے عہد میں ان کو اتنا عروج حاصل تھا کہ اس نے دو مرتبہ ان کو سونے اور چاندی سے تلوایا اور دونوں مرتبہ چھ چھ ہزار روپے کے برابر ان کا وزن ہوا، اور بادشاہ نے یہ ساری رقم مولانا کی نذر کر دی -اس نے مولانا کے وطن سیالکوٹ میں کئی دیہات بھی بطور جاگیر ان کی خدمت میں پیش کیے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہایت اطمینان وسکون کی زندگی بسر کرنے لگے اور معاشی تفکرات سے آزاد ہو کر تصنیف وتالیف میں مصروف ہو گئے۔ وہ اپنے زمانے کے واحد عالمِ دین تھے جنھیں بادشاہ کی جانب سے ایک لاکھ روپے سالانہ ملتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو رفعتِ شان اور منفرد مقام اللہ

---

[۶] بادشاہ نامہ- ج ۱، حصہ ۲، ص ۳۴۱ [۷] فرحت الناظرین - ص ۷۳

کے فضل سے ان کو حاصل ہوا، سرزمین ہند میں اور کسی عالم دین کو اُس دَور میں حاصل نہیں ہوا۔

لم یبلغ احد من علماء الھند فی وقتہ ما بلغ من الشأن والرفعۃ ولا انتھی واحد منھم الی ما انتھی الیہ جمیع الفضائل عن بد وحاذ العلوم والفرد [۵۸]

علمائے ہند میں جس شان و رفعت کو وہ [مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی] پہنچے، ان کے عصر میں دوسرا کوئی نہیں پہنچا اور جن فضائل سے وہ متمتع ہوئے، اور کوئی شخص نہیں ہوا۔ انھوں نے علوم کو سمیٹ لیا اور اس میں انفرادیت حاصل کی۔

محمد صالح کنبو نے بھی ان کے علم و فضل اور وسعتِ معلومات کی بے حد تعریف کی ہے اور شاہ جہانی دور میں ان کو جس عز و شرف کا مستحق گردانا گیا، اس کا شان دار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے [۵۹]

وسعتِ علم و فضل اور قبولیتِ عامہ

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی وسعتِ علم کے تمام متقدمین و متاخرین تذکرہ نویس معترف ہیں اور ان کی فضیلت و عظمت اور تحقیق و کاوش کا واضح الفاظ میں اقرار کرتے ہیں۔ متقدمین مؤرخین میں سے بعض کے اقتباسات اختصار کے ساتھ پہلے دیے جا چکے ہیں۔ متاخرین میں سے میر سید غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

علامۂ زماں و افتخارِ زمانیاں است۔ الحق در جمیع فنونِ درسی مثل او از زمینِ ہند برنہ خاست۔ آثارِ دانش بایں کیفیت و کمیت و حسن قبول بر صفحۂ روزگار نہ گزاشت [۶۰]

وہ [مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی] علامۂ زمان اور فخرِ اہل زمان ہیں۔ بلاشبہ تمام اصنافِ علومِ درسیہ میں انھیں جو دسترس حاصل تھی، اس میں سرزمینِ ہند میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ ان کے

---

[۵۸] خلاصۃ الاثر۔ ج ۲، ص ۳۱۸

[۵۹] تفصیل کے لیے دیکھیے: عمل صالح الموسوم بہ شاہ جہان نامہ۔ ج ۳، ص ۲۹۴، ۲۹۵

[۶۰] مآثر الکرام دفتر اوّل، ص ۱۹۳

ر و دانش کی کیفیت و کمیت اور دنیا میں حسنِ قبول کے اعتبار سے کوئی ان کا ثانی نہیں گزرا۔

آزاد بلگرامی آگے چل کر ان کی علمی فیض رسانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

و عرصۂ جہان را بہ لوامع فیض مملو ساختہ[۱۱]

انھوں نے خطۂ ارض کو اپنے فیضِ علم و فضل کی ضیا پاشی سے بھر دیا۔

جب شاہ جہان نے انھیں نقد روپے اور کئی گاؤں بطور جاگیر عطا کیے تو ان کی فکرِ معاش کا مسئلہ ختم ہو گیا اور وہ اطمینانِ قلب اور سکونِ ذہن سے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں منہمک ہو گئے۔ آزاد بلگرامی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ملا بہ بحضورِ خاطر و فراغ مال در وطنِ مالوف اقامت داشت و تخم علم و فضل در سرزمین سینہ ہا و سفینہ ہا می کاشت۔ تصانیفِ او در بلادِ عرب و عجم سائر و دائر است۔[۱۲]

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے مالی پریشانیوں سے نجات حاصل کر کے دل کے کامل سکون کے ساتھ اپنے وطنِ مالوف سیالکوٹ میں اقامت اختیار کر لی اور لوگوں کے قلب و نظر کی زمین میں علم و فضل کی تخم ریزی میں مصروف ہو گئے۔ ان کی تصانیف بلادِ عرب و عجم میں متداول و متعارف ہیں۔

اس کا ثبوت حافظ عبدالرحمٰن امرتسری کے ان الفاظ سے بھی ملتا ہے، جو انھوں نے اپنے سفر نامہ میں تحریر کیے ہیں:

"عراق، شام اور استنبول کی متعدد درس گاہوں میں، مجھے آپ کی تصانیف، داخلِ درس دیکھنے کا موقع ملا۔ ہندوستان سے باہر بلادِ اسلامیہ میں علمی حیثیت سے جو شہرت مولوی عبدالحکیم صاحب کو حاصل ہوئی، اُسے کوئی مصنف حاصل نہیں کر سکا[۱۳]

مولوی رحمان علی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی علامۂ زمان سر آمد اقران خود[۱۴]

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، علامۂ عصر اور اپنے معاصرین میں سب سے فائق تر تھے۔

---

[۱۱] ماثر الکرام دفتر اول۔ ص ۱۹۳
[۱۲] ایضاً
[۱۳] سیاحت نامہ۔ ص ۵۹
[۱۴] تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۱۰

مولانا عبدالحی حسنی لکھنوی فرماتے ہیں کہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی، اپنے استاذ مولانا کمال الدین شمیری کے فیضِ صحبت سے علم وفضل کے اونچے مرتبے کو پہنچ گئے تھے:

وصار عجباً فی استحضار المسائل وقوۃ المعارضۃ وکثرۃ الدرس والافادۃ[۱۵]

انھوں نے استحضارِ مسائل، قوتِ بحث اور کثرتِ درس وافادہ میں بہترین مقام حاصل کرلیا تھا۔

وہ مزید فرماتے ہیں کہ مولانا سیالکوٹی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہتے تھے اور ان کی تصنیفات کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی:

ویدرس ویصنف وتصانیفہ کلھا مقبولۃ عند العلماء محبوبۃ الیھم ولاسیما عند علماء بلاد الروم یتنافسون فیھا وھی جدیرۃ بذلک[۱۶]

مولانا عبدالحکیم فرائضِ تدریس انجام دیتے اور مصروفِ تصنیف رہتے تھے اور ان کی تمام تصانیف حلقۂ علما میں مقبول ہیں اور وہ انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بالخصوص بلادِ روم سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام ان کی تصانیف سے ایک دوسرے سے بڑھ کر رغبت رکھتے ہیں۔ اور یہ تصانیف اس قدر افزائی کی مستحق بھی ہیں۔

بہرحال اپنے عہد کے علمائے عظام میں مولانا سیالکوٹی بڑے بلند مرتبے کے حامل تھے۔ اہم مسائل سے متعلق تمام ہندوستان میں ان کا فتویٰ جاری تھا اور کوئی اس سے جراَتِ انکار نہیں کرسکتا تھا، حتیٰ کہ بادشاہِ ہند اور عمالِ حکومت بھی ان کے فرمانِ شرعی سے انحراف نہ کرتے تھے۔

مفتی غلام سرور لاہوری اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

علمائے ہند را بر قول وفعل وے جائے اعتراض وحکامِ عہد را از حکمِ شرع کہ بفتویٰ وے جاری شدے، جائے انکار واعتراض نبودے[۱۷]

---

[۱۵] نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۱۰ [۱۶] ایضاً۔ ص ۲۱۱

[۱۷] خزینۃ الاصفیا۔ ص ۹۸۴، ۹۸۵

ہندوستان کے علما کو ان کے قول وفعل پر مجال اعتراض نہ تھی اور حکامِ وقت کو ان کے صادر کردہ احکامِ شرعی سے جو بصورتِ فتویٰ جاری کیا جاتا، انکار و اعراض کی گنجائش نہ تھی۔

محمد بن فضل اللہ محبی کا کہنا ہے کہ سلطانِ ہند شاہ جہان انھی کے مشورے سے احکام جاری کرتا تھا:

کان رئیس العلماء عند سلطان الهند خرم شاه جهان لا یصدر الا عن رایه۔[18]

فرماں روائے ہند سلطان خرم شاہ جہان ان کو علما کے سربراہ قرار دیتا تھا اور ہر حکم ان کی رائے سے جاری کرتا تھا۔

اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے جو "سٹڈیز ان دی ہسٹری آف گجرات" کے حوالے سے ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے "ہسٹری آف مسلم سویلیزیشن ان انڈیا اینڈ پاکستان" میں نقل کیا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے گجرات کے زمانۂ گورنری میں احمد آباد کے ایک ناجائز تعمیر کردہ جین مندر کو گرا کر مسجد بنانے کا حکم دیا تھا۔ لیکن جب دارا شکوہ گجرات کا گورنر بنا تو اس نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے فتوے کے مطابق شاہ جہان کے حکم سے یہ عمارت دوبارہ بحیثیت مندر واگزار کر دی۔[19]

اس فتوے سے مولانا سیالکوٹی کی رواداری، وسعتِ علم اور وسعتِ فکر و نظر کا پتا چلتا ہے۔

ہم عصر علما سے علمی مباحثے

عہدِ شاہ جہان میں خطۂ ہند کو علما و فضلا کے عظیم مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ شاہ جہان کی محبتِ علم و علما اور صفتِ جودت و سخا کا شہرہ سن کر ایران و روم کے اصحابِ علم اور اہلِ فضل بھی کثیر تعداد میں واردِ ہند ہو گئے تھے اور ان میں سے بیشتر کا تعلق و انسلاک

---

[18] خلاصۃ الاثر۔ ج ۲، ص ۳۱۹

[19] ملاحظہ ہو ماہنامہ "ثقافت" (لاہور)، بابت اپریل ۱۹۶۷ء، ص ۷

براہ راست شاہ جہان اور شاہی دربار سے ہو گیا تھا۔ وہ زمانہ چوں کہ ہندوستان میں علومِ عقلیہ کی ترویج و ترقی کا زمانہ تھا، اس لیے مختلف عقلی موضوعات پر علما و فضلا کے درمیان مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ خود بادشاہ ان علما کی علمی مجالس میں شامل ہوتا اور ان کے مباحثوں میں دلچسپی لیتا تھا۔

ایران سے واردِ ہند ہونے والی جماعتِ علما میں ایک بزرگ مُلّا شفیعا تھے، جو بہت بڑے عالم اور مشہور ایرانی فاضل تھے۔ انھیں ملّا شفیعا یزدی کہا جاتا تھا۔ ان کا اصل نام محمد شفیع اور لقب دانشمند خاں تھا۔ یہ لقب ان کے علم و فضل کی بنا پر انھیں شاہ جہان بادشاہ کی طرف سے ملا تھا۔ فرحت الناظرین کے مصنف محمد اسلم پسروری ان کے حالات بیان کرتے ہوئے، انھیں "یگانۂ آفاق و سرآمدِ علمائے خراسان و عراق" قرار دیتے ہیں۔[۲۰]

ملّا شفیعا یزدی، شاہ جہان کے عہد میں درحقیقت تجارت اور سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ مختلف ذرائع سے جب بادشاہ تک ان کے علم و فضل کی شہرت پہنچی اور یہ معلوم ہوا کہ وہ خراسان و عراق کے یگانۂ روزگار علما اور ممتاز فضلا میں سے ہیں تو ان سے ملاقات کا اشتیاق پیدا، لیکن اس اثنا میں ملّا شفیعا اپنا کام مکمل کر کے اور جس غرض سے یہاں آئے تھے، اس سے فارغ ہو کر عازمِ وطن ہونے والے تھے اور واپسی کے ارادے سے بندرگاہ سورت میں پہنچ گئے تھے۔ بادشاہ نے بہت ہی خواہش اور اعزاز و اکرام کے ساتھ انھیں دربار میں طلب کیا اور ان کے امتحان اور مناظرے کے لیے سردارِ علما مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو دعوت دی۔ دونوں فضلائے عصر ایک دوسرے کے مقابلے پر اترے اور إياك نعبد و إياك نستعين کی تفسیر پر بحث شروع ہوئی۔ شاہ جہان کے فاضل وزیر علامی سعد اللہ خاں حَکَم قرار پائے۔ بڑی علمی گفتگو ہوئی، دونوں نے دلچسپ تفسیری اور فنی نکات بیان کیے۔ فرحت الناظرین کے لائق مصنف نے طوالت

---

[۲۰] فرحت الناظرین۔ ص ۱۴۴

کی وجہ سے مناظرے کی تفصیلات حذف کردی ہیں اور فریقین کے سوال و جواب ضبطِ تحریر میں لانے سے گریز کیا ہے۔

مختصر یہ کہ بادشاہ نے ملا شفیعا کے طرزِ گفتگو سے متاثر ہو کر، ان کو ملازمانِ شاہی کے زمرے میں شامل کیا اور پھر ان پر بہت سی نوازشیں کیں اور انھیں دانش مند کے خطاب سے سرفراز کیا۔

ماثر الامرا میں بھی مختصر الفاظ میں اس مناظرے کی روداد بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان دونوں عالموں کے درمیان ایاك نعبد و ایاك نستعین کی واؤ عطف کے بارے میں بڑی طویل گفتگو ہوئی۔ علامی سعد اللہ خاں نے حکم کے فرائض انجام دیے بالآخر دلائل کے اعتبار سے دونوں برابر رہے — علامی سعد اللہ خاں کہ در علم علم بود، ممیز گشت و آخر ہر دو برابر ماندند [۲۱]

صاحبِ فرحت الناظرین محمد اسلم پسروری کے بقول: در تفسیر آیۂ کریمہ (ایاك نعبد و ایاك نستعین) مباحثہ کردند و سخنانِ بلند و نکاتِ دلپذیر ازاں ہر دو دانشمند تحریر بمنصۂ ظہور امد۔

ملا شفیعا یزدی کے علاوہ اور بھی متعدد علما کے نام تذکروں میں مسطور ہیں، جن سے مولانا سیالکوٹی کی بعض علمی مسائل میں بحثیں رہتی تھیں، ان میں ایک ملا محمد فاضل تھے جو بڑے عالم، فقیہ اور مشہور مناظر تھے۔

ملا فاضل محمد بود دانشمند، مدقق بود، و بہ جدل و بحاثے اشتہار یافتہ، اکثر حواشیِ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی را ردمی نوشت [۲۲]

ملا فاضل، فقیہ مصنف اور گہرے علم و فکر کے مالک تھے۔ بحث و مجادلہ میں بڑے مشہور تھے۔ انھوں نے ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کے اکثر حواشی کا رد تحریر کیا ہے۔

[۲۱] دیکھیے: فرحت الناظرین (تعلیقات) - ص ۹۵، ۹۶ - نیز ملاحظہ ہو - ماثر الامرا - ج ۲، ص ۲۴

[۲۲] تاریخ کشمیر اعظمی - ص ۱۴۴

مولانا محمد میاں مرحوم نے اپنی تصنیف "علمائے ہند کا شاندار ماضی" میں "ملفوظاتِ عزیزیہ" کے حوالے سے مولانا عبدالحکیم اور ملّا فاضل کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے، جو درج ذیل ہے:

ملّا محمد فاضل بدخشاں میں پیدا ہوئے۔ علومِ عقلیہ و نقلیہ میں کامل و مکمل ہو کر شاہ جہان بادشاہ کے پاس پہنچے اور مطالبہ کیا کہ "ملک العلما" کا منصب اور خطاب مجھے مرحمت فرمایا جائے۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اس عہدہ و منصب پر فائز تھے۔ شاہ جہان نے کہا، آپ دونوں صاحب مناظرہ کر لیں، جس کو زیادہ قابل سمجھوں گا، اس کو "ملک العلما" بنا دوں گا۔ ملّا محمد فاضل صاحب نے بذاتِ خود مولانا عبدالحکیم صاحب سے مناظرہ کرنے میں اپنی ہتک سمجھی۔ فرمایا کہ میرا کوئی شاگرد مولانا سے مناظرہ کرے گا۔ یہ کہہ کر دربارِ شاہی سے رخصت ہوئے اور سیدھے ہرات پہنچے۔ وہاں ابھی مرزا زاہد اپنے والد سے صَرف پڑھا کرتے تھے۔ ملّا فاضل نے ذکی اور ذہین سمجھ کر ان کے والد صاحب سے اجازت چاہی کہ وہ خود ان کو تعلیم دیں گے۔ چنانچہ بہت تھوڑے عرصے میں مرزا زاہد کو عالم و فاضل کر کے اپنے ہمراہ دربارِ شاہ جہان میں لائے اور فرمایا۔ یہ میرا شاگرد حاضر ہے، جو ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے مناظرہ کرے گا۔ مولانا سیالکوٹی نے پہلی نظر میں تاڑ لیا کہ مرزا زاہد صاحب "صَرف" میں کچے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے ہی فرمایا، اس بچے سے صَرف کے صیغوں کے سوا اور کیا پوچھ سکتا ہوں، اور پھر شافیہ کی ایک عبارت کا مطلب پوچھا۔ وہ عبارت مرزا زاہد کے ذہن میں نہ تھی۔ بولے، کتاب دیکھ لوں۔ مولانا عبدالحکیم صاحب نے فوراً فرمایا۔ ابھی تک کتاب کی ضرورت ہے؟ الغرض ملّا فاضل اس مرتبہ بھی شکست کھا کر بے نیلِ مراد واپس ہو گئے۔[۲۳]

بلخ کے ایک فاضل بزرگ، بقول محمد صالح کنبو "جلوہ طرازِ حسنِ کلام، فاضل عالی فطرت والا مقام" مولانا عوض وجیہہ سے بھی بعض مسائل کے سلسلے میں مولانا عبدالحکیم کی گفتگو اور سوال و جواب کا ذکر بعض تذکروں میں ملتا ہے۔[۲۴]

---

۲۳ علمائے ہند کا شاندار ماضی ۔ ج ۱، ص ۲۶۶، ۲۶۷

۲۴ ملاحظہ ہو: "معارف"۔ اعظم گڑھ۔ بابت مارچ ۱۹۶۳ء

مولانا سیالکوٹی کے ایک اور معاصر کشمیر کے ملا ابوالحسن المعروف بہ شاہم بابا تھے۔ جو تحقیقِ علوم میں اپنے عہد کے عدیم المثال عالم تھے۔ بیضاوی کی عبارتوں کی عبارتیں قرآن کی طرح پڑھتے تھے۔ وہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حریف تھے اور بعض مسائل میں ان کے نقطۂ نظر کی تردید کرتے تھے۔ اپنے زمانے کے علما کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

واکثر مذکوراتِ ملا عبدالحکیم را رد می کرد و گاہے التفات بجانب علمائے حاضر نمی کرد۔[۲۵]

اسی طرح ایک اور کشمیری عالم ملا باقر نارہ للو تھے، جو معقولات میں ملا باقر صباغ کے شاگرد تھے اور یہ ہندوستان کے وہ عالم تھے جو مختلف مسائل میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور پورب و پنجاب کے علما کے افکار و خیالات پر باقاعدہ معارضہ کرتے اور ان کی تحقیق کو ہدفِ نقد و جرح ٹھہراتے تھے۔

ملا باقر نارہ للو، در معقول شاگرد ملا باقر صباغ بودہ، و در ہندوستان با ملا عبدالحکیم و علمائے پنجاب و پورب معارضہ ہا کردہ، و آں ہا را ملزم می کرد۔[۲۶]

مجدد الف ثانی سے تعلقِ خاطر

مولانا سیالکوٹی اپنے ہم عصر علما اور صوفیا کے پاس جاتے اور ان میں سے بعض کے ساتھ گہرے اور مخلصانہ تعلقات رکھتے تھے، جن میں ایک حضرت مجدد الف ثانی تھے۔ دونوں بزرگ ملا کمال الدین کشمیری کے شاگرد تھے اور ایک دوسرے کے علم و فضل کی وسعتوں کو جانتے اور تدین و تقویٰ کی حدود کو خوب سمجھتے تھے۔ مولانا سیالکوٹی کے بارے میں تذکروں میں یہ بھی مرقوم ہے کہ وہ مجدد صاحب سے ملاقات کے لیے سرہند جایا کرتے تھے اور ان کے حلقۂ ارادت و بیعت میں شامل تھے۔ ان کے لیے ''مجدد الف ثانی'' کا لفظ سب سے پہلے مولانا سیالکوٹی ہی نے استعمال کیا تھا۔ ایک مرتبہ تو وہ کئی دن سرہند میں مقیم رہے اور مجدد صاحب نے ان کو ''آفتابِ پنجاب'' کا لقب عطا کیا۔ ان دونوں کے مخلصانہ مراسم کے بارے میں بہت سے واقعات متعدد

---

۲۵ دیکھیے: تاریخ کشمیر اعظمی۔ ص ۱۴۴

۲۶ ایضاً۔ ص ۱۴۸

تذکروں میں مندرج ہیں۔

حضرت میاں میر سے ملاقات

لاہور کے مشہور صوفی بزرگ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی آمد و رفت تھی اور ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک ملاقات کا واقعہ پروفیسر امین اللہ وثیر نے دارا شکوہ کی سکینۃ الاولیا کے حوالے سے ماہنامہ "ثقافت" (لاہور) میں بیان کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک روز جہانگیر حضرت میاں میر صاحب کی مجلس میں حاضر ہوا۔ مولانا سیالکوٹی بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ حضرت میاں میر نے بادشاہ کو خدا تک پہنچنے کے طریقے بتانا شروع کیے اور کہا کہ یہ وصل الی اللہ دو طریقوں سے ممکن ہے۔ اول جذبہ، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ یک بارگی بندے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ دوسرا سلوک، جو ریاضت، مجاہدہ اور کسی بزرگ کا دامن تھامنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ راہِ سلوک کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ جب سالک پر عالم ملکوت کا کشف ہو جاتا ہے تو اس کا پیر اُسے جنگلوں اور ویران جگہوں میں بھیج دیتا ہے تاکہ وہ تنہائی میں یادِ الٰہی میں مصروف رہے، اور یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ قربِ حق کے حصول کے لیے مخلوق سے کنارہ کشی ضروری ہے ــــ مولانا عبدالحکیم نے، جو ایک عالم باعمل تھے اور یہ جانتے تھے کہ بادشاہ حضرت میاں میر کا بہت معتقد ہے اور مجلس میں موجود ہے، اس موقع پر خاموشی اختیار کرنا مناسب نہ سمجھا اور کہا: حضرت! آپ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے اگر یہ صحیح ہے تو یہ عین رہبانیت کی تعلیم ہے، اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ مولانا نے جنگلوں کی تنہائی میں جا کر ا[illegible] لٰہی میں مصروف ہو جانے پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا کہ اس سے نماز باجماعت فوت ہو جاتی ہے اور اس طرح ایک بنیادی سنّتِ نبوی کا ترک لازم آتا ہے[۲۷]۔

تصنیفات و حواشی

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی ایک معروف تصنیف الدرۃ الثمینہ ہے۔ باقی مختلف

۲۷ "ثقافت" (لاہور) بابت اپریل ۱۹۶۷ء۔ ص ۱۰

مضامین پر مشتمل اہم درسی کتابوں پر حواشی ہیں، جو اپنی جگہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور حلقۂ علما و طلبا میں بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نزدیک ان کی تفصیل یہ ہے :

(۱) حاشیہ تفسیر بیضاوی (۲) حاشیہ مقدماتِ تلویح (۳) حاشیہ مطول (۴) حاشیہ شریفیہ (۵) حاشیہ شرح مواقف (۶) حاشیہ شرح عقائد نفتازانی (۷) حاشیہ حاشیہ خیالی، (۸) حاشیہ شرح شمسیہ (۹) حاشیہ حاشیہ عبدالغفور (۱۰) تکملہ حاشیہ عبدالغفور (۱۱) حاشیہ شرح مطالع (۱۲) حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی (۱۳) حواشی در کنار شرح حکمت العین (۱۴) حواشی در کنار شرح ہدایۃ الحکمہ (۱۵) حواشی در کنار مراح الارواح (۱۶) درۂ ثمنیہ در اثبات واجب تعالیٰ۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کی سطور میں، ان متون و شروح کا، جن کو مولانا ممدوح نے شرح و تحشیہ کے لیے منتخب فرمایا، مختصر الفاظ میں تعارف کرا دیا جائے۔

تفسیر بیضاوی

تفسیر بیضاوی کا اصلی نام "انوار التنزیل و اسرار التاویل" ہے۔ اور یہ قاضی ناصر الدین ابوالخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی (متوفی ۶۸۵ھ یا ۶۹۲ھ) کی تصنیف ہے در حقیقت یہ محمود ابن عمر زمخشری (۵۲۸ھ) کی تفسیر (جو تفسیر "کشاف" کے نام سے معروف ہے اور جس کا پورا نام "الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل و عیون الاقاویل فی وجوہ التاویل" ہے) کا اختصار ہے۔ زمخشری اگرچہ معتزلی تھا لیکن اس کی تفسیر کشاف اہلِ سنت کے حلقوں میں متداول اور مدارس میں سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی تھی۔ کشاف ایک ضخیم تفسیر ہے، متعدد اہلِ علم نے اس کے مختصرات لکھے، مگر ان میں شہرت اور قبولیتِ عامہ قاضی ناصر الدین بیضاوی کی انوار التنزیل و اسرار التاویل ہی کو حاصل ہوئی۔ اسی وجہ سے علما نے بیضاوی کی طرف خصوصیت سے عنان توجہ مبذول کی، اسے داخلِ نصاب کیا اور اس پر حواشی و تعلیقات تحریر کیے۔ نویں، دسویں، گیارھویں صدی ہجری میں اس پر متعدد علما حواشی لکھے۔

واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تفسیر بیضاوی کی ترویج دسویں صدی ہجری کے نصف میں ہوئی۔ اس سے پہلے اس ملک کے علما میں کشاف متداول تھی۔ دسویں صدی ہجری سے قبل خود ہندوستان میں دو تصویریں معرضِ تحریر میں آ چکی تھیں۔ ایک آٹھویں صدی ہجری میں اور دوسری نویں صدی ہجری میں۔!

آٹھویں صدی ہجری میں "تفسیر تاتارخانی" لکھی گئی جو فیروز تغلق (۷۵۲-۷۹۰ھ) کے عہد کے معروف عالم و فاضل امیر تاتارخاں کی مرتب کردہ تھی اور بڑی مفصل اور جامع تفسیر تھی۔

نویں صدی ہجری کے نصف اوّل میں "تفسیر بحر مواج" ضبطِ کتابت میں لائی گئی۔ یہ تفسیر جون پور کے نامور عالمِ دین، ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی (متوفی ۸۴۸ھ) کے زورِ علم و تحقیق کا نتیجہ تھی۔ فارسی زبان کی اس تفسیر نے بہت جلد جماعتِ علما میں مقبولیت حاصل کر لی۔

دسویں صدی ہجری میں ہندوستان میں بیضاوی کا رواج ہوا۔ اسی صدی میں محقق جلال الدین دوانی (متوفی ۹۰۸ھ) کے شاگرد ارضِ ہند میں داخل ہوئے اور ان کی آمد کے بعد یہاں کے علما کو تفسیر بیضاوی سے لگاؤ پیدا ہوا۔ شیخ ابوالفضل خطیب گاذرونی (۹۵۹ھ) محقق دوانی کے شاگرد تھے، وہ گجرات چلے آئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنے عصر کے جلیل القدر عالم تھے۔ شاہانِ گجرات نے ان کی بڑی سرپرستی کی اور عرصے تک احمد آباد میں مسندِ درس آراستہ کیے رکھی۔ انھوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا۔ غالباً یہ پہلے ہندی عالم تھے جنھوں نے یہ اہم علمی خدمت انجام دی۔ ان کے شاگردوں میں شیخ وجیہہ الدین گجراتی (۹۹۸ھ) شامل ہیں، جو کثیر التصانیف اور کثیر الدرس عالمِ دین تھے۔ انھوں نے بھی اپنے استاذ کی روایت کے مطابق بیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا۔

علامہ جلال الدین دوانی کے ایک اور شاگرد خواجہ جمال الدین محمود تھے اور ان کے شاگرد امیر فتح اللہ شیرازی تھے، جنھوں نے خواجہ جمال الدین محمود کے علاوہ مولانا کمال الدین شیروانی، مولانا احمد کرد اور میر غیاث الدین منصور سے بھی پڑھا تھا۔ یہ پہلے ایران سے دکن تشریف لائے اور پھر اکبر کی طلب پر ہندوستان چلے آئے تھے۔ انھوں نے بھی تفسیر

بیضاوی پر حاشیہ لکھا[۲۸]

امیر فتح اللہ شیرازی کے شاگرد مولانا عبدالسلام لاہوری تھے، جو درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے اور تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہ دیتے تھے۔ انھوں نے بھی تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا[۲۹]

مولانا عبدالسلام لاہوری کے شاگردوں میں ایک عالمِ دین مولانا عبدالسلام دیوی تھے جو ہندوستان کے صوبہ یو۔پی کے شہر دیوہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے بھی تفسیر بیضاوی کو حاشیہ نویسی کے لیے منتخب فرمایا[۳۰]

ان علمائے کرام کے علاوہ دیگر علمائے ہند میں سے شیخ علیٰی بن عثمان سندھی برہان پوری، شیخ صبغت اللہ بن روح اللہ حسینی گجراتی، شیخ شمس الدین بیجاپوری، شیخ طیب بن عبدالواحد بلگرامی، شیخ عبداللہ دہلوی، شیخ طاہر بن رضی ہمدانی، قاضی نور اللہ شوشتری، میر محمد ہاشم گیلانی اور قاضی محمد آصف الہ آبادی نے تفسیر بیضاوی پر حواشی تحریر کیے۔

پھر شیخ یعقوب بن یوسف بنانی نے دہلی میں اور مُلّا حسین کوجو نے کشمیر میں تفسیر بیضاوی پر حواشی لکھے۔ ملا حسین کوجو کے حاشیہ کے بارے میں "واقعاتِ کشمیر" کے مصنف کا کہنا ہے کہ یہ حاشیہ مختلف علوم کی روشنی میں لکھا گیا ہے، نہایت عمدہ ہے اور بہت سے فوائد علمیہ اور نکات عالیہ کو مشتمل ہے۔

ملا حسین کوجو، در انواعِ علوم مشارالیہ بودہ - حواشی او بر تفسیر بیضاوی فوائد و نکاتِ عالیہ

---

[۲۸] "المعارف" (لاہور)، بابت مارچ ۱۹۶۸ء۔ حکیم فتح اللہ شیرازی کے حالات کے لیے دیکھیے: عمل صالح، ج ۳، ص ۳۰۲۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۶۰۔ مفتاح التواریخ، ص ۱۹۳، ۱۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۵۴، ۲۵۵۔ بزمِ تیموریہ، ص ۵۱، ۵۲۔ منتخب التواریخ، ص ۴۶۷، ۴۶۸۔ دربارِ اکبری، ص ۶۷۳ تا ۶۸۴۔

[۲۹] مآثر الکرام، ص ۲۲۶۔ مولانا عبدالسلام لاہوری کے حدودِ علم و فضل کی وسعتوں کے لیے ملاحظہ ہو: عملِ صالح، ج ۳، ص ۳۰۰

[۳۰] ایضاً، ص ۲۲۵، ۲۲۶

افادہ می کند۔

کشمیری علما کے تذکروں سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں بیضاوی کو اس زمانے میں بہت ہی اہمیت حاصل تھی اور علما اس سے بے حد اعتنا کرتے تھے۔ بعض علما کو تو یہ باقاعدہ حفظ تھی، جن میں ملّا ابوالحسن المعروف بہ شاہم بابا خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ملا عبدالحکیم کا حاشیہ

ہندی اہلِ علم کا یہ وہ دور تھا جب مدارسِ دینیہ میں تفسیرِ بیضاوی کا وہ باقاعدہ درس دینے لگے تھے اور اس پر تعلیقات و حواشی کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی جو مسندِ تدریس پر فائز تھے اور طلبا کو تفسیر بیضاوی پڑھاتے تھے، اس کی شرح ضبطِ کتابت میں لانے کا ارادہ کیا اور اس کے مشکل و مغلق مباحث کو سلجھانے کی طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائی۔ لیکن کتاب چونکہ دقیق مسائل کو محیط ہے اس لیے مولانا کو معلوم تھا کہ شرح کے باوجود اس کی پیچیدہ گرہوں کی عقدہ کشائی ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کا اظہار وہ مقدمۂ کتاب میں ان الفاظ سے کرتے ہیں:

ان التفسیر العتیق والبحر العمیق، المسمی بانوار التنزیل، للامام الھمام، قدوۃ علماء الاسلام، سلطان المحققین، برھان المدققین القاضی ناصر الدین عبداللہ البیضاوی قد استنھز العلماء بحل مشکلاتہ واسھر الاذکیاء احداقھم لفتح مغلقاتہ، الا انہ لوجازۃ العبارات واحتوائہ علی الاشارات، جل ان یکون شریعۃ لکل وارد، وان یطلع علیہ الا واحد بعد واحد۔

وہ تفسیر قدیم اور [علومِ قرآنی کا] بحرِ عمیق، جو انوار التنزیل کے نام سے موسوم ہے اور محققوں کے بادشاہ اور دقیقہ سنجوں کی برہان قاضی ناصر الدین عبداللہ بیضاوی کی تصنیف ہے۔ علمائے نامدار اس کے مشکل مباحث کی عقدہ کشائی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اور اذکیائے دوراں نے اس کے پیچیدہ مسائل کی وضاحت کے لیے اپنی آنکھوں کو شب بیداری کرائی ہے۔ لیکن یہ کتاب اپنی عبارتوں کے ایجاز کی وجہ سے اور اشاراتِ علمیہ پر مشتمل ہونے کے باعث، اس سے کہیں بلند ہے کہ ہر اترنے والے کے لیے پانی کا گھاٹ بن جائے [یعنی ہر شخص کے

فہم کی گرفت میں آجائے] اور یکے بعد دیگرے سب لوگ اس کے دقائق و غوامض پر مطلع ہو جائیں۔

مولانا سیالکوٹی چوں کہ بہت بڑے عالم اور وسیع المطالعہ شخص تھے، اس لیے انھیں ذاتی طور پر یقین تھا کہ وہ تفسیر بیضاوی کے غوامض و مغلقات کے حل و کشود سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں لیکن ان سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم ان کے اس دعوے کو تسلیم کرنے سے متامل تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ صرف ان کی زبانی باتیں ہیں عملاً اس عظیم کام کی تکمیل بہت مشکل ہے۔ ان لوگوں نے مولانا ممدوح سے بیضاوی کے مغلقات کے بارے میں کچھ سوالات کیے اور ان کے جواب کے طالب ہوئے۔ مولانا نے ان کو تسلی بخش جواب دیے۔ تحریر فرماتے ہیں:

فقلت لھم ایھا الخلان الدینیۃ والاخوان الروحانیۃ، انی اٰنست نارًا بوادی ھذا الکتٰب، اٰتیکم منھا بقبس لعلکم تصطلون، فاستکشفوا منی بعض مظان لبسہ فعرضت لھم ما ورد فی خلدہ عند درسہ من حل یفید برد قلوب اولی الابصار و زیادات وقعت الظفرۃ عنھا۔

میں نے ان سے کہا، اے دینی دوستو اور روحانی بھائیو! میں نے اس کتاب کی وادی میں آگ دیکھی ہے۔ میں اس سے کچھ انگارے لاتا ہوں تاکہ تم اس سے تاپ سکو۔ اب انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ اس کے بعض ان مقامات کی وضاحت کروں، جہاں شکوک و شبہات کا خیال ہے۔ چنانچہ میں نے ان کے سامنے وہ فوائد علمی پیش کیے جو اس کتاب کا درس دیتے وقت میری سطح قلب پر ابھرے تھے۔ یہ ان مشکل مسائل کے ایسے حل تھے جس سے اہلِ علم اور اصحابِ عقل کے دلوں کو ٹھنڈک اور تسکین پہنچتی ہے۔ یہ حل ان زیادات و افادات کو محیط تھے، جن پر مجھے دسترس ہوئی۔

مولانا نے جب یہ دعویٰ کیا اور مغلقات کی توضیح و تشریح کے بارے میں ایک بات کہی تو ہر طرف کے اہلِ علم ان سے عرض کناں ہوئے کہ ان مقامات کی وضاحت فرمائی جائے لیکن غربت و تنگ دستی اور مال و مکان کی تنگی احباب کی اس خواہش و تمنا کی راہ میں رکاوٹ بن گئی، جس کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فاقترحوا ان تتقید ھذہ الاوابد تذکرۃ للاحباب النظار فعللتھم بتفرق البال وتشتت الحال، اذا کنت مطروحا بمکان تقف

حل بضاعتی فیہ فقر۔

انھوں نے اصرار کیا کہ میں ان دقیق مسائل کو قلم بند کردوں جو ہر شخص کے فکر و فہم کی گرفت میں آنے والے نہیں ہیں، تاکہ اہلِ نظر احباب کے لیے وہ ایک تذکرہ ثابت ہوں۔ لیکن میں نے ان سے عدمِ اطمینانِ قلب اور پراگندگیٔ حال کا بہانہ کیا۔ کیوں کہ میں اس زمانے میں ایک بالکل خالی مکان میں پڑا ہوا تھا، جہاں میری سب سے قیمتی متاع فقر اور بے سروسامانی تھی۔

مولانا کی یہ سخت ذہنی پریشانی اور شدید مالی بدحالی کا زمانہ ہے، اور ہندوستان میں یہ جہاں گیر کا عہدِ حکومت ہے، جبکہ بعض دیگر فضلائے عصر اور علمائے روزگار کی طرح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سرکار کی نظرِ عنایت کی سرحدوں سے باہر اور حکومت کے گوشۂ چشمِ التفات سے دُور تھے۔ اسی لیے اپنی گوناگوں پریشانیوں کی وجہ سے تحشیہ بیضاوی تحریر کرنے سے قاصر اور اپنے ذی علم احباب کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشنے سے عاجز تھے۔ اس قسم کے خالص علمی کام دلجمعی اور سکونِ خاطر کے متقاضی ہوتے ہیں، لیکن وہ اس سے محروم تھے —— جہاں گیر کے بعد شاہ جہان تختِ ہند کا وارث بنا تو سرکاری سطح پر علما کے وقار و احترام میں بھی اضافہ ہوا۔ مولانا سیالکوٹی نے اس سے ملاقات کی تو وہ ان کے علم و فضل کی فراوانی سے بہت متاثر ہوا اور انھیں صلات و جوائز سے سرفراز کیا۔ اب وہ ذہنی و فکری طور پر بالکل مطمئن تھے، چنانچہ دوستوں کے تقاضوں کو عملی شکل دینے کے لیے میدان میں نکلے اور قلم ہاتھ میں پکڑا۔ فرماتے ہیں:

حتّٰی جذب صنیعی وجمع شتات عمری دولۃ السلطان..

... ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہ جہان بادشاہ ...

وھدات بعین عنایتہ ملحوظا وبین اعین الناس مغبوطاً۔ فعیت بی العلل وضاقت علی الحیل، فشرعت فی جمع ما سمح بہ خاطری العلیل وذھنی الکلیل ... جاداً فی تحقیق معانیہ، باتغاً عن رموز مبانیہ، مومیًا فی اثنائہ الی اجوبۃ شکوک الناظرین ... فجاءت بعون اللہ کنزاً لا یحصی فوائدہ، و بحراً لا یقضی فرائدہ۔

تا آنکہ سلطان ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہ جہان بادشاہ . . . کی دولت نے مجھے کھینچ لیا اور میرے انتشارِ طبع کو، اطمینانِ خاطر سے بدل دیا . . . میں اس کی نظرِ عنایت میں سما گیا اور اعیانِ ملک میں محسودِ اقران بن گیا۔ اب حیلہ جوئی میرے لیے ناممکن ہو گئی اور بہانوں کے دائرے مجھ پر تنگ ہو گئے۔ پس میں نے وہ نکات و فوائد جمع کرنے سے شروع کیے جو میری بیمار طبیعت اور کمزور ذہن میں آئے تھے . . . لیکن ان کی ترتیب و تدوین میں، میں نے تحقیقِ معانی کو پیشِ نگاہ رکھا اور ان کے بنیادی مسائل کو موضوعِ بحث ٹھہرایا۔ نیز اس تحریر میں قارئین کے شبہات کے جواب کی طرف اشارہ کرتا رہا . . . چنانچہ اللہ کی مدد سے ایسا خزانہ معرضِ ظہور میں آیا اور ذہن نے اُگلا جو بے شمار فوائد پر مشتمل ہے اور ایسا سمندر سامنے نمودار ہوا، جس کے موتیوں کا ختم ہونا ناممکن ہے۔

اس طرح پہلے پارے کی تفسیر کا حاشیہ مکمل کر کے انھوں نے شاہ جہان کو پیش کیا۔ لکھتے ہیں:

ثم لما فرغت من تسويد ما يتعلق بتفسير الجزء الاول . . . جعلته عراضة لسدة السنية و تحفة لخدمة العلية۔

پھر جب میں پہلے پارے کی تفسیر سے متعلق تحشیہ سے فارغ ہوا . . . تو اُسے [شاہ جہان بادشاہ کے] آستانۂ بلند کے لیے پیش کیا اور اس کی خدمتِ عالیہ کے لیے اُسے تحفہ بنایا۔

شاہ جہان کے ملاحظہ میں آنے کے بعد انھوں نے تفسیر کے دوسرے جُز کا حاشیہ لکھا اور عہدِ شاہ جہانی کی یہ عظیم خدمت معرضِ ظہور میں آئی۔ اس تحشیہ نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ اسے مصر اور روم کے علما نے بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ یہ حاشیہ ہندوستان میں بھی چھپ چکا ہے اور مصر میں بھی ۔ !

مولانا سیالکوٹی کے اس حاشیے کی خصوصیات یہ ہیں:

- تفسیر بیضاوی کے مشکل الفاظ کی لغوی و نحوی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔
- ایسے جملے جو مغلق اور وضاحت طلب ہیں، ان کو واضح کیا گیا ہے اور ان کی پوری طرح صراحت فرمائی گئی ہے۔
- ان احادیث کی، جو تفسیر بیضاوی میں درج ہیں، سند بیان کر دی ہے اور جن کا مختصر الفاظ میں ذکر ہے، ان کا پورا متن درج کر دیا ہے۔

حاشیہ کشاف

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے زمخشری کی تفسیر کشاف کا حاشیہ بھی لکھا ہے، جو غیر مطبوعہ ہے اور جس کا قلمی نسخہ ہندوستان کی رام پور لائبریری میں موجود ہے۔

حاشیہ مقدماتِ تلویح توضیح

تلویح توضیح، اصولِ فقہ کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کا متن "تنقیح الاصول" ہے۔ جو صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعود المحبوبی (متوفی ۷۴۷ھ) کی تصنیف ہے ـــ بعد کو تنقیح الاصول کی شرح صدر الشریعۃ نے خود ہی لکھی، جس کو "التوضیح فی حل غوامض التنقیح" کے نام سے موسوم کیا۔ لیکن یہ شرح بجائے خود شرح طلب اور مزید وضاحت کی متقاضی تھی، اس لیے علما نے اس پر حواشی تحریر کیے۔ اس کی سب سے اہم اور پہلی شرح علامہ سعد الدین تفتازانی شافعی (متوفی ۷۹۲ھ) نے ۷۵۸ھ میں "التلویح فی کشف حقائق التنقیح" کے نام سے لکھی[۱۳۱] سب سے زیادہ مقبولیت اسی حاشیہ "تلویح" کو حاصل ہوئی ـــ اور پھر بہت جلد اس حاشیہ نے اصولِ فقہ کی مستند درسی کتاب کی حیثیت اختیار کر لی اور اُسے مدارسِ عربیہ کے اعلیٰ نصاب میں شامل کیا گیا، جسے اب بھی برِ صغیر کے مدارس میں باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے۔

واقعات کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل ہندوستان میں "اصول بزدوی" مروّج تھی۔ سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ ۔ ۷۵۲ھ) کے عہد میں "حسامی" کا ذکر بھی آتا ہے، جس پر عہدِ تغلق کے ہندی عالم مولانا معین الدین عمرانی دہلوی نے حاشیہ تحریر کیا تھا[۱۳۲] بعد ازاں "المنار" بھی مدارس میں آگئی۔ چنانچہ آٹھویں صدی ہجری کے نصف ثانی میں جب سلطان فیروز شاہ تغلق نے دہلی کے حوضِ خاص پر مدرسہ تعمیر کیا تو اس میں سید یوسف بن سید جمال حسینی (متوفی ۷۹۰ھ) کو مدرس مقرر کیا جو دراصل ملتان کے باشندے تھے اور دہلی چلے گئے

---

[۱۳۱] تفصیل کے لیے دیکھیے: کشف الظنون، ج ۱، ص ۴۹۶

[۱۳۲] مآثر الکرام دفتر اول، ص ۱۶۷، ۱۶۸

تھے۔ انھوں نے "توجیہ الافکار" کے نام سے "المنار" کی شرح سپردِ قلم کی، جس کا تذکرہ شیخ عبدالحق دہلوی ان الفاظ میں کرتے ہیں :

سید یوسف بن سید جمال الحسینی، ۔۔۔۔ بر منار نیز شرح دارد مسمّٰی بتوجیہ الافکار۔[۳۳]

تلویح توضیح کی ترویج مدارسِ ہند میں غالباً نویں صدی ہجری میں ہوئی، جب اس ملک کے علما علّامہ سعد الدین تفتازانی سے تعلیم حاصل کر کے یہاں آئے۔ ہندوستان کے علما میں سب سے پہلے تلویح توضیح کا حاشیہ شیخ وجیہ الدین گجراتی نے کیا۔ اس کے دوسرے محشّی شیخ یعقوب بن حسن صرفی کشمیری تھے جو نہ صرف کشمیر کے علما و فضلا میں بلکہ پورے ہند میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ ان کے علاوہ شیخ نور الدین محمد صالح گجراتی، شیخ محمد عاشق چریاکوٹی اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے فرزند شیخ عبداللہ لبیب نے تلویح توضیح کے حواشی قلم بند کیے۔ متاخرین میں مولانا جمال بن رکن الدین گجراتی، شیخ امان اللہ بنارسی اور قاضی عبدالحق بن محمد اعظم کابلی کے نام اس کے حاشیہ نویسوں میں لائق تذکرہ ہیں۔

تلویح توضیح کا معرکہ آرا حصّہ "مقدماتِ اربعہ" کا ہے، جو "حسن و قبح افعال" کے مسئلے کی وضاحت سے متعلق ہے۔ یہ بحث اگرچہ مسئلہ جبر و اختیار کے بارے میں علمِ کلام سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اصولِ فقہ میں بھی اس سے تعرض کیا گیا ہے۔

ہندی علما نے پوری تلویح توضیح پر حواشی لکھے اور بڑی عمدگی سے اس خدمتِ علمی سے عہدہ برآ ہوئے۔ مگر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اس معاملے میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے صرف تلویح توضیح کے مقدماتِ اربعہ کی تشریح کی اور اس اہم بحث کو اپنی کاوشِ فکر کا موضوع ٹھہرایا۔

حاشیہ شرح عقائد نسفی

عقائد و کلام ایک اہم موضوع ہے، اس پر بہت سی کتابیں ضبطِ تحریر میں لائی گئیں، جن میں ایک کتاب "عقائد نسفی" ہے۔ احناف میں اس کو بڑی قبولیت کی نگاہ سے دیکھا

---

[۳۳] اخبار الاخیار۔ ص ۱۵۰

گیا ہے۔ اس کے مصنف علامہ نجم الدین عمر بن محمد النسفی (متوفی ۵۳۷ھ) ہیں۔ متعدد علما نے اس کی شروح لکھیں، جن میں ایک شرح، جو "شرح عقائد نسفی" کے نام سے متداول ہے، علامہ سعد الدین تفتازانی نے لکھی اور بہت جلد مدارسِ عربیہ میں شامل ہوگئی۔ ہمارے ممدوح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اس کی اہمیت واضح کی ہے اور لکھا ہے کہ علما نے شرح عقائد نسفی کے حواشی تحریر کیے اور اس میں جو امور وضاحت طلب ہیں، ان کو حل کیا۔

فاماطوا عنه الغواشی وکتبوا علیه الحواشی۔

علما نے اس کی تہہ میں چھپے ہوئے مطالب کو ظاہر کیا اور اس پر حاشیے لکھے۔

برّصغیر پاک و ہند میں شرح عقائد نسفی کا ذکر سب سے پہلے دسویں صدی ہجری کے واقعات کے ضمن میں عہدِ ہمایوں کے مشہور عالم مولانا حاتم سنبھلی (متوفی ۹۶۹ھ) کے حالات میں ملتا ہے۔ وہ اس طرح کہ عہدِ ہمایوں میں جو علما مغل فاتحین کے ساتھ واردِ ہند ہوئے، ان میں ایک ملاّ علاء الدین لاری تھے، جن کو اپنے علم و فضل پر اس درجہ ناز تھا کہ کسی ہندی عالم کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انھوں نے شرح عقائد نسفی پر حاشیہ قلم بند کیا اور بڑے فخر کے ساتھ مولانا حاتم سنبھلی کو بغرضِ تبصرہ پیش کیا۔ مولانا حاتم سنبھلی نے یہ حاشیہ دیکھا تو اس پر ایسے دقیق اور وزنی اعتراض کیے کہ ملاّ علاء الدین لاری سے ان کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔ یہ واقعہ ملاّ عبدالقادر بدایونی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

چوں ملاّ علاء الدین لاری بدعویٰ تمام حاشیہ را کہ بر شرح عقائد نسفی نوشتہ، نزد میاں بردہ۔ بعد از مطالعہ چنداں تدقیق کردہ اند کہ ملاّ علاء الدین را ہیچ جواب نماند[۳۴]

یعنی ملاّ علاء الدین لاری اپنے پورے دعویٰ علم کے ساتھ وہ حاشیہ جو انھوں نے شرح عقائد نسفی پر لکھا تھا، میاں حاتم سنبھلی کے پاس لے گئے۔ انھوں نے مطالعہ کے بعد اس پر اس قدر دقیق علمی اعتراض وارد کیے کہ ملاّ علاء الدین ان کا کوئی جواب نہ دے سکے۔

اس طرح شرح عقائد نسفی مدارسِ ہند میں آئی۔ پھر اس پر کئی علمائے ہند نے حواشی

۳۴؎ منتخب التواریخ۔ ج ۳، ص ۶۶

لکھے، جن میں مولانا علاء الدین لاری، شیخ نظام الدین بدخشی اور مولانا وجیہ الدین گجراتی کے نام زیادہ مشہور ہیں۔

اس پر ایک حاشیہ، علمائے روم میں کے ایک عالم مولیٰ احمد بن موسیٰ الخیالی نے بھی لکھا تھا، جو اپنے محشی کے نام کی مناسبت سے حاشیہ خیالی کے نام سے معروف ہے۔ شرح عقائد نسفی کا یہ بہت عمدہ حاشیہ ہے، اور عربی مدارس کے علما و طلبا میں متداول و مشہور ہے! دیگر ممالک کے علما کی طرح خطۂ ہند کے علمانے بھی اس کو مرکزِ توجہ ٹھہرایا۔ چونکہ یہ داخلِ نصاب ہو گیا تھا، اس لیے متعدد ہندی علمانے اس پر حواشی لکھے، جن میں گیارھویں صدی ہجری کے اصحابِ علم میں سے مولانا عبدالسلام دیوی، شیخ محمد سعید سرہندی اور مفتی وجیہ الدین گوپامئوی کے نام لائق تذکرہ ہیں۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی اس کو اپنی کاوشِ فکر کے لیے منتخب فرمایا۔ اس پر علمائے روم نے بھی حواشی لکھے ہیں اور علمائے ہند نے بھی، لیکن طلبائے علم ان حواشی سے مطمئن نہ تھے۔ اس ضمن میں خود ان ہی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

لکن ما اتوا بما یروی الغلیل اویشفی العلیل، لما ان ابکارہ آبیۃ عن خطبۃ کل عاذب ومخدراتہ محتجبۃ لا تنجلی لکل طالب۔

لیکن ان حاشیہ نویس علمانے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو لوگوں کی علمی تشنگی دور کر سکتی، یا بیماروں کو حقیقی شفا بخشنے کے قابل ہوتی، کیوں کہ کتاب کے گہرے مسائل کے نقاب میں چھپی ہوئی دوشیزہ ہر شخص کو پیغامِ شادی دینے سے انکار کرتی ہے اور اس کے پردوں میں مستور غوامض ہر طلب گار کے سامنے اپنا نقاب نہیں اٹھاتے۔

ان حواشی میں جو کمی رہ گئی تھی، مولانا سیالکوٹی کے حاشیہ نے اس کو کما حقہٗ پورا کر دیا اور قاری کی سطحِ ذہن پر جو شبہات ابھر سکتے تھے، انھیں بطریقِ احسن رفع فرما دیا۔ لکھتے ہیں:

فصرفت برھۃ من عنفوان الشباب فی حل مبانیہ وانتھزت فرصۃ عن اعین الزمان لتحقیق معانیہ . . . فحققت مقاصدہ و بینت مصادرہ وموارد ہ . . . مجیبا عن شبھۃ الناظرین فجاء بحمد اللہ

تعالیٰ موافقاً للمامول وتم بعون اللہ تعالیٰ مطابقاً للمسئول۔

سو میں نے اپنے عنفوان شباب کا ایک حصہ اس کے بنیادی مسائل کو حل کرنے میں صرف کر دیا اور اس کے تحقیقِ معانی کی غرض سے زمانے کی آنکھوں سے فرصت کے کچھ لمحات اڑا لیے . . . اس کے مقاصد و مطالب کی گہرائی تک پہنچا اور اس کے مصادر و موارد بیان کیے . . . کتاب پڑھنے والوں کے شبہات کا جواب دیا۔ اس طرح یہ کتاب توقع کے عین مطابق ہو گئی۔ الحمد للہ تعالیٰ، اللہ کی مدد سے دوستوں کی تمنا کے ہم آہنگ ہو گئی۔

حاجی خلیفہ نے بھی کشف الظنون میں مولانا سیالکوٹی کے حاشیہ بر حاشیہ خیالی کا ذکر کیا ہے اور اس کو بہترین حاشیہ قرار دیا ہے:

وعلی الخیالی حاشیۃ . . . للملا عبد الحکیم بن شمس الدین الھندی السیالکوٹی متوفی سنۃ سبع وستین والف وھی احسن الحواشی مقبولۃ عند العلماء۔[۳۵]

اور خیالی پر . . . ملا عبد الحکیم بن شمس الدین ہندی سیالکوٹی نے حاشیہ تحریر کیا، جو ۱۰۶۷ھ میں ۔ت ہوئے۔ خیالی کا یہ بہترین حاشیہ ہے اور علما میں مقبول و مشہور ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ یہ حاشیہ انھوں نے بادشاہِ ہند شاہ جہان کے نام معنون کیا۔

۔اشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی

قاضی عضد الدین الایجی (متوفی ۷۵۶ھ) کی عقائد میں ایک کتاب عقائد عضدی کے نام سے معروف ہے، جس کی بہت سے علمانے شرحیں لکھیں۔ ان میں ایک شرح محقق دوانی یعنی علامہ جلال الدین دوانی (متوفی ۹۰۸ھ) نے بھی لکھی جو "شرح عقائد جلالی" کے نام سے ہمارے مدارس میں متداول رہی ہے اور علما و طلبا اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ بعد میں شرح عقائد جلالی پر علمانے حواشی تحریر کیے، جن میں خود محقق دوانی کے بعض جلیل القدر تلامذہ بھی شامل ہیں۔

شرح عقائد جلالی جب برصغیر میں پہنچی اور علمائے ہند میں مروج ہوئی تو اس پر مولانا

---

۳۵ کشف الظنون - ج ۲، ص ۱۱۴۸

عبد الحکیم سیالکوٹی نے حاشیہ لکھا اور مولانا ہی اس برصغیر کے پہلے عالم ہیں، جنھوں نے اس اہم کتاب کو تحشیہ کے لیے منتخب کیا۔ بعد ازاں دیگر علمائے ہند نے اس پر حواشی تحریر کیے۔

حاشیہ شرح المواقف

قاضی عضد الدین الایجی (متوفی ۷۵۶ھ) کے متون میں علم الکلام سے متعلق "المواقف فی الکلام" کو ایک متنِ متین کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُس دَور کے وہ سلاطین و ملوک جن کو اس کی عظمت کا علم تھا، متمنی تھے کہ اس کے فاضل مصنّف، علمِ کلام کے اس عظیم شاہ کار کا انتساب اس کے نام کریں۔ ان سلاطین میں ہندوستان کا بادشاہ سلطان محمد تغلق بھی شامل ہے۔ چنانچہ سلطان محمد تغلق (متوفی ۷۵۲ھ) نے قاضی عضد الدین کو ہندوستان لانے اور ان کی کتاب "المواقف" کو اپنے نام معنون و منسوب کرانے کے لیے دہلی کے نامور فاضل مولانا معین الدین عمرانی کو شیراز بھیجا۔ شیخ عبد الحق دہلوی لکھتے ہیں:

چنیں گویند کہ سلطان محمد تغلق کہ قاضی عضد را بہ دیارِ ہندوستان طلبیدہ و توشیح متن مواقف بنامِ خود التماس نمودہ، ہم مولانائے مذکور را فرستادہ بود[۳۶]

کہتے ہیں کہ سلطان محمد تغلق نے قاضی عضد الدین کو ہندوستان آنے کی دعوت دی اور ان کی کتاب المواقف کو اپنے نام معنون کرنے کی درخواست کی، اس کے لیے اس نے مولانا معین الدین عمرانی کو اس کے پاس بھیجا۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی سبحۃ المرجان میں مولانا معین الدین عمرانی کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعہ تحریر کیا ہے:

ارسلہ السلطان محمد بن تغلق شاہ والی الھند المتوفی سنۃ اثنتین وخمسین وسبعمائۃ الی القاضی عضد الدین الایجی بشیراز وانحف الیہ ھدایا غیر محصورۃ والتمس بالھند قدومہ[۳۷]

سلطان محمد تغلق (متوفی ۷۵۲ھ) نے مولانا معین الدین عمرانی کو بے شمار تحائف و ہدایا دے کر قاضی عضد الدین ایجی کے پاس شیراز بھیجا اور ان سے ہندوستان تشریف لانے کی درخواست کی

۳۶۔ اخبار الاخیار۔ ص ۱۴۴
۳۷۔ سبحۃ المرجان۔ ص ۳۷

لیکن شیراز کے حکمران سلطان ابواسحاق انجو کو پتا چلا تو اس نے اپنی پوری سلطنت قاضی عضدالدین کے سپرد کرنے کی پیش کش کی اور انھیں ہندوستان نہ آنے دیا۔ بعدازاں قاضی موصوف نے اپنی تصنیف "المواقف" ابواسحاق انجو کے نام معنون کردی۔ حافظ شیرازی نے بھی والی شیراز سلطان ابواسحاق انجو کے عہد کے پانچ رتنوں کے ذکر میں اس کتاب اور اس کے مصنف کی تعریف کی ہے:

دگر شہنشہ دانش عضد در بینش — بنائے کار "مواقف" بنام شاہ پناہ

اس سے "المواقف" کی علمی قدر و قیمت اور سلاطینِ وقت کی اس سے بے پناہ رغبت و اعتنا کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

المواقف پر متعدد اہلِ علم نے حواشی و شروح لکھے جن میں ایک شرح میر سید شریف جرجانی کی ہے، جو محمد بن مبارک شاہ منطقی کے شاگرد تھے اور محمد بن مبارک نے براہِ راست مصنف "المواقف"، قاضی عضدالدین سے یہ کتاب پڑھی تھی۔ گویا میر سید شریف جرجانی کو صرف ایک واسطے سے قاضی موصوف کا شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ یہ نہایت عمدہ شرح ہے اور مدارسِ عربیہ میں عرصے تک متداول رہی ہے۔ اس پر بہت سے علما نے حواشی تحریر کیے، جن میں ہندی علما بھی شامل ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مدارسِ ہند میں "شرح المواقف" کا رواج دسویں صدی ہجری میں پڑا۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ سندھ کے حکمران شاہ حسین نے مولانا یونس سمرقندی (متوفی ۹۵۱ھ) سے دیگر کتابوں کے علاوہ شرح المواقف کا درس بھی لیا تھا۔ دسویں صدی ہجری کے آخر میں ماوراءالنہر کے ایک جلیل القدر عالم مولانا عبدالسمیع اندجانی واردِ ہند ہوئے، وہ شرح المواقف اور حاشیہ مطالع کی تدریس میں خاص درک اور مہارت رکھتے تھے۔ اور ان کتابوں کو بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ مولانا احمد جند کے شاگرد تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب صاحب ہدایہ تک پہنچتا ہے۔ ہفت اقلیم کے مصنف احمد امین رازی لکھتے ہیں:

قاضی عبدالسمیع از شاگردانِ مولانا احمد جند است و نسبش بہ صاحبِ ہدایہ منتہی شود، و شرح مواقف و حاشیہ مطالع نیک می داند[۳۸]

---

[۳۸] ہفت اقلیم — ج ۲، ص ۳۱۴

افاضلِ ہند میں سے متعدد حضرات نے شرح المواقف پر حواشی تحریر کیے، جن میں مولانا وجیہ الدین گجراتی، شیخ ہبۃ اللہ شیرازی اور مولانا عبدالوہاب کشمیری کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ ان کے بعد کے اہل میں سے میر محمد زاہد ہروی کابلی (متوفی ۱۱۱۱ھ) نے جو مولانا سیالکوٹی کے ایک ہم عصر قاضی محمد اسلم ہروی (متوفی ۱۰۶۱ھ) کے صاحب زادے تھے، شرح المواقف کے دوسرے موقف "امورِ عامہ" پر مبسوط و مفصل حاشیہ لکھا جو عرصے تک معقولات کے اعلیٰ درس میں داخلِ نصاب رہا۔

سیّد شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ) کی شرح المواقف پر ایک حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے لکھا اور واقعہ یہ ہے کہ فضلائے ہند میں سے اسی حاشیہ کو سب سے زیادہ قبولیّت اور شرف حاصل ہوا۔ ہندوستان کے باہر کے اہلِ علم میں بھی اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ حاجی خلیفہ نے ہندی علما کے حواشی میں سے صرف مولانا سیالکوٹی کے حاشیہ کا ذکر کیا ہے۔

وعلی شرح المواقف للسیّد حاشیۃ لعبد الحکیم السیالکوتی اللاھوری۔[۳۹]

اور میر سید شریف جرجانی کی شرح مواقف پر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی لاہوری نے حاشیہ لکھا۔

بیرونِ ہند میں اس حاشیہ کی مقبولیّت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ استنبول اور مصر میں شرح مواقف کے تین حاشیے طبع ہوئے ہیں، جن میں ایک حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ہے۔

لیکن مولانا سیالکوٹی کا حاشیہ شرح المواقف مکمل نہیں ہے، صرف موقف خامس (پانچویں موقف) تک ہے۔ مولانا ممدوح، مقدمہ حاشیہ میں خود وضاحت کرتے ہیں کہ یہ حاشیہ انھوں نے اپنے بیٹے مولانا عبداللہ لبیب کے لیے، جبکہ وہ یہ کتاب ان سے پڑھتے تھے، لکھا تھا۔ مولانا کے الفاظ یہ ہیں:

ھذہ فوائد بل فرائد علقتھا علی شرح المواقف سید المحققین و افضل المدققین عند قراءۃ قرۃ العین لھذا الغریب عبد اللہ الملقب

---

[۳۹] کشف الظنون — ج ۲، ص ۱۸۹۴

باللبیب، تذکرۃ للاحباب وتحفۃ للاصحاب، وعدۃ لیوم الحساب، وانا الفقیر المتمسك بالحبل المتین عبدالحکیم بن الشیخ شمس الدین۔

یہ فوائد و نکات جنھیں موتیوں سے تعبیر کرنا چاہیے، وہ (حواشی) ہیں جو میں نے سید المحققین اور افضل المدققین (میر سید شریف جرجانی) کی شرح المواقف پر اس زمانے میں تحریر کیے تھے، جب مجھ غریب کی آنکھوں کی ٹھنڈک (میرا بیٹا) عبداللہ، جس کا لقب لبیب ہے، مجھ سے یہ کتاب پڑھتا تھا۔ میں نے ان حواشی کو اپنے احباب کے لیے ایک یادگار، —— رفقا کے لیے ایک تحفہ اور روزِ قیامت کے لیے توشہ بنایا ہے —— اور میں فقیر دین کی مضبوط رسی کو پکڑنے والا عبدالحکیم بن شیخ شمس الدین ہوں۔!

حاشیہ شرح شمسیہ

شمسیہ، علمِ منطق سے متعلق درجۂ اعلیٰ کے درسی نصاب کا متنِ متین ہے، جس کا پورا نام "الرسالۃ الشمسیہ فی قواعد المنطقیہ" ہے۔ اس کے مصنف نجم الدین کاتبی ہیں، جو محقق طوسی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنی یہ تصنیف خواجہ شمس الدین وزیر کے نام معنون کی تھی، اسی وجہ سے یہ "شمسیہ" کے نام معروف ہوئی۔ اہلِ علم میں اس متن نے بڑی قبولیت حاصل کی اور علما نے اس کی شرحیں سپردِ قلم کیں۔ ان شرحوں میں سب سے زیادہ مقبولیت قطب الدین رازی کی شرح کو ہوئی۔ ان کی شرح کا اصل نام "تحریر المنطقیہ فی شرح الرسالۃ الشمسیہ" ہے مگر یہ شرح اپنے مصنّف کے نام کی مناسبت سے "قطبی" کے نام سے معروف ہوئی۔

قطبی، اپنی تصنیف کے جلد ہی بعد داخلِ نصاب ہو گئی اور متعدد علمائے منطق نے اس پر حواشی تحریر کیے۔ لیکن حلقہ علما و طلبا میں درجۂ قبولیت صرف دو حاشیوں کو حاصل ہوا۔ ایک میر سید شریف جرجانی کے حاشیہ کو جو "میر قطبی" کے نام سے موسوم ہے اور دوسرے علامہ سعد الدین تفتازانی کے حاشیہ کو جو اپنے مصنّف کے نام کی وجہ سے "سعدیہ" کہلاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ علمائے ہند، قطبی سے، فیروز شاہ تغلق کے عہد میں، آٹھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں متعارف ہوئے۔ اور وہ اس طرح کہ فیروز شاہ تغلق نے دہلی میں جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس میں صدر مدرس مولانا جلال الدین رومی کو مقرر کیا تھا،[۴۰] جو صاحبِ قطبی

---

[۴۰] المعارف (لاہور) اپریل ۱۹۹۰ء، ص ۳۰

قطب الدین رازی کے شاگرد تھے۔ ان کے سلسلۂ تلمذ کا ذکر شیخ عبدالحق دہلوی نے سید یوسف بن سید جمال حسینی کے حالات کے ضمن میں کیا ہے:

اُو شاگردِ مولانا جلال الدین رومی است کہ از تلامذۂ مولانا قطب الدین رازی شارح شمشیہ و مطالع است[۱۴]

[سید یوسف بن جمال حسینی] مولانا جلال الدین رومی کے شاگرد تھے، جو کہ مولانا قطب الدین رازی شارح شمسیہ و مطالع کے تلامذہ میں سے تھے۔

خیال یہ ہے کہ مولانا جلال الدین رومی ہی اپنے استاذ مولانا قطب الدین رازی کی یہ شرح شمسیہ [قطبی] ہندوستان لائے اور وہ یہاں کے مدارسِ عربیہ کے نصاب میں داخل ہوئی اور علما نے اس سے اعتنا کیا۔ پھر دسویں صدی ہجری کے آغاز تک اس کتاب کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ نویں صدی ہجری کے اواخر میں علمائے ملتان، مولانا عزیز اللہ تلنبی اور مولانا عبداللہ تلنبی جب دہلی گئے تو مدارس ہند میں علمِ کلام کی شرح صحائف اور منطق کی شرح شمسیہ (قطبی) مروّج تھیں۔ انھوں نے دوسری کتابوں کا رواج ڈالا۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی مولانا عبداللہ تلنبی کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

آخر الامر از خرابیٔ ملتان اُو و شیخ عزیز اللہ تلنبی رختِ رحلت بہ دار الخلافہ دہلی کشیدند و علمِ معقول را دریں دیار مروّج ساختند، و پیش ازیں غیر شرح شمشیہ و شرح صحائف از علمِ منطق و کلام در ہند شائع نہ بود[۴۲]

بالآخر ہنگامۂ ملتان کے دوران میں وہ [مولانا عبداللہ تلنبی] اور شیخ عزیز اللہ تلنبی جب رختِ سفر باندھ کر [سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں] دار السلطنت دہلی گئے تو ان دیار میں معقولات کی ترویج کی، ورنہ اس سے پہلے ہندوستان میں علمِ منطق کی شرح شمسیہ (قطبی) اور علمِ کلام کی شرح صحائف کے علاوہ کسی اور کتاب کا رواج نہ تھا۔

چونکہ مدارسِ ہند میں شرح شمسیہ کو منطق کی اعلیٰ درجے کی نصابی کتاب سمجھا جاتا تھا

---

۱۴ اخبار الاخیار۔ ص ۱۵۰

۴۲ مآثر الکرام دفتر اول، ص ۱۷۵، ۱۷۶

اس لیے علمائے ہند نے اس کو مرکزِ توجہ ٹھہرایا اور اس پر حواشی تحریر کیے، جن میں مولانا عبدالوہاب کشمیری، مولانا وجیہ الدین گجراتی، شیخ ہبۃ اللہ شیرازی اور قاضی نور اللہ شوستری کے حواشی قابل ذکر ہیں۔

لیکن "قطبی" اور "میر قطبی" پر ان علمائے گرامی قدر کے حواشی کے علاوہ ایک حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی لکھا، اور یہ حاشیہ اس زمانے میں لکھا جب ان کے بیٹے مولانا عبداللہ لبیب ان سے یہ کتابیں پڑھتے تھے۔ اس حاشیے نے فنی اعتبار سے بڑی شہرت حاصل کی اور فاضل محشی نے اپنی دیگر تصانیف کی طرح اس کا انتساب بھی شاہ جہان بادشاہ کے نام کیا۔

اس حاشیے کی علمی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملا محب اللہ بہاری نے "سلم العلوم" میں قطبی کے کسی ہندی حاشیہ نویس کا حوالہ نہیں دیا۔ صرف اسی حاشیہ کو لائق التفات گردانا اور اس سے استفادہ کیا ہے۔ سلم العلوم کے شارحین میں سے ملا حمد اللہ نے بالخصوص اپنی شرح میں متعدد مقامات پر "فاضل لاہوری" کا نام لکھ کر اس کی صراحت کی ہے اور ان کے افاداتِ عالیہ کا ذکر کیا ہے۔

مولانا سیالکوٹی نے یہ حاشیہ سپردِ قلم کرنے کی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ قطبی اور میر قطبی کے بعض حواشی اپنی شہرت کے باوجود بعض مقامات پر تشنۂ تحقیق ہیں اور بعض اپنے اندر بلا مقصد طوالت لیے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے ان فضلا و علما کے حواشی ان کے نزدیک طلبا کے لیے زیادہ مفید مطلب اور لائقِ استفادہ نہ تھے، لہٰذا انھیں یہ حواشی تحریر کرنا پڑے[۵۴۳]

حاشیہ شرح مطالع الانوار

مطالع الانوار، قاضی سراج الدین محمود بن ابوبکر ارموی (متوفی ۶۸۹ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ "حصے" کو مصنفِ شہیر "طرف" سے تعبیر کرتے ہیں۔ طرف اول،

---

۵۴۳ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مجموعہ قطبی و حواشی قطبی۔ جلد ۱، ص ۳ تا ۸

منطق کے موضوع سے متعلق ہے، اور طرف ثانی، فلسفہ و حکمت کے مسائل کو محیط ہے۔ اس کے چار اجزا ہیں:۔۔۔ جواہر، اعراض، امورِ عامہ اور العلم الالٰہی۔!

مطالع الانوار کی شرح، قطب الدین رازی (متوفی ۷۶۶ھ) نے "لوامع الاسرار" کے نام سے تحریر کی اور اس کا انتساب وزیر غیاث الدین کی طرف کیا۔ مطالع الانوار کی یہ شرح اہلِ علم میں بڑی مقبول ہوئی اور بہت سے فحول علما نے اس پر حواشی لکھے۔ قاضی نور اللہ شوستری کا کہنا ہے کہ ملّا جلال الدین دوانی نے جو محقق جلال الدین کے عرف سے معروف ہیں، اس پر دو حاشیے لکھے تھے، ان میں سے ایک حاشیہ قدیم کہلاتا ہے اور دوسرا جدید۔!

لیکن سب سے زیادہ قبولیت کی نظر سے میر سید شریف جرجانی کے حاشیہ کو دیکھا گیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ میر شریف کا یہ حاشیہ، شرح مطالع الانوار کا دوسرا حاشیہ ہے۔ قدیم ترین (یا پہلا) حاشیہ مولی الحاج پاشا کا تھا[۴۴] کیونکہ میر شریف نے اس کے تقدم کا اعتراف بھی کیا ہے اور بعض مقامات پر مواخذہ بھی کیا ہے۔

میر سید شریف جرجانی کے بارے میں یہ واقعہ لائق تذکرہ ہے کہ وہ شرح مطالع الانوار خود اس کے مصنف (قطب الدین رازی) سے پڑھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، مگر قطب الدین رازی بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ میں نوجوان طالب علم کے اعتراضات و ایرادات کے دفاع و جواب کی ہمت نہ پائی، لہٰذا انھیں اپنے ایک شاگرد شمس الدین محمد بن مبارک شاہ کے پاس بھیج دیا اور فرمایا کہ ان سے پڑھنا، خود شارح (یعنی مجھ) سے پڑھنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ میر سید شریف جرجانی وہاں سے چلے اور شمس الدین محمد بن مبارک شاہ کے درس میں پہنچے۔ انھوں نے کہا، مستقل درس کے لیے تو وقت نہیں ہے، البتہ فلاں امیر زادہ یہ کتاب پڑھ رہا ہے، اس کے شریکِ درس ہو جاؤ۔ میر شریف نے اس کے ساتھ مل کر پڑھنا شروع کیا۔ درس میں تو وہ خاموش رہتے، لیکن شب کو مطالعہ کے لیے بیٹھتے تو بڑی محنت کرتے۔ ایک شب استاذ، مدرسہ اور طلبا کی دیکھ بھال کے

---

[۴۴] المعارف لاہور۔ اپریل ۱۹۶۸ء۔ ص ۳۸

لیے آئے۔ سید شریف کے حجرے کے قریب پہنچے تو انھیں پوری محنت سے مطالعہ میں مصروف اور مطالبِ کتاب میں مستغرق پایا۔ اندر سے کچھ اس طرح کی آواز آرہی تھی:

قال الشارح کذا وقال الاستاذ کذا و انا اقول کذا [۴۵]

شارح کتاب [قطب الدین رازی] نے یہ کہا اور استاد نے یہ تقریر کی اور میں یہ کہتا ہوں۔

استاذِ مکرم، لائق شاگرد کے اس اسلوبِ مطالعہ سے اس درجہ متاثر اور خوش ہوئے کہ دوسرے روز سے مستقل سبق مقرر کر دیا ــــ دورانِ طالب علمی ہی میں میر سید شریف نے شرح المطالع کا حاشیہ قلم بند کیا، اور اس حاشیہ نے فحول واکابر علما کے نزدیک اس درجہ شہرت وقبولیت پائی کہ انھوں نے اس حاشیہ پر حواشی تحریر کیے، جن میں میر مرتضیٰ شریفی، مرزا جان شریفی اور دیگر علمائے عظام شامل ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ شرح مطالع الانوار سے ہندی علما، فیروز شاہ تغلق کے عہد میں آشنا ہو چکے تھے، کیونکہ مدرسہ فیروز شاہی کے ایک مدرس (مولانا جلال الدین رومی) وہ بزرگ تھے جو خود مولانا قطب الدین رازی کے شاگرد تھے [۴۶] غالباً یہ کتاب دیارِ ہند میں وہی لائے ہوں گے، لیکن یہ مدارسِ ہند میں داخلِ نصاب کب ہوئی؟ اس سے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ سلطان شاہی بیگ (متوفی ۹۲۸ھ) نے جو مغل حکمران ظہیر الدین بابر سے پہلے سندھ کا حاکم تھا، اور حکومت وسیاست کے ساتھ ساتھ، علم وفضل کی نعمت سے بھی مالامال تھا، شرح مطالع پر تعلیقات قلم بند کی تھیں۔ بعد ازاں ۷۰۲ھ میں مولانا عبدالسمیع اندجانی ہندوستان آئے تو اس کتاب کی ترویج واشاعت اور زیادہ ہوئی۔ اس لیے کہ ان کو شرح مواقف اور شرح مطالعہ کے درس وتدریس میں بڑی مہارت حاصل تھی۔

قاضی عبدالسمیع . . . شرح مواقف وحاشیہ مطالع نیک می داند [۴۷]

شرح مطالع، برِ صغیر کے حلقۂ درس میں متداول ہوئی تو متعدد علمائے ہند نے اس پر حواشی لکھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بیٹے شیخ نور الحق دہلوی نے بھی حاشیہ لکھا۔ مولانا عبدالحکیم

---

[۴۵] الشقائق النعمانیہ بر حاشیہ تاریخ ابن خلکان ــ ج ۱، ص ۲۳۹

[۴۶] اخبار الاخیار ــ ص ۱۵۰ [۴۷] ہفت اقلیم ــ ج ۳، ص ۴۴۳، ۴۴۴

سیالکوٹی نے بھی اس پر حاشیہ تحریر کیا، جس کا قلمی نسخہ ہندوستان کی بانکی پور لائبریری میں موجود ہے۔[۴۸]

حواشی در کنار شرح حکمۃ العین

حکمۃ العین، فلسفہ و حکمت سے متعلق علامہ نجم الدین کاتبی قزوینی کی تصنیف ہے۔ اس کی شرح ملا قطب الدین رازی نے شرح حکمۃ العین کے نام سے لکھی تھی۔ شرح حکمۃ العین جب نصابِ درسیہ میں آئی تو علمانے اس پر حواشی لکھے، علامہ جلال الدین دوانی نے بھی اس کا حاشیہ سپردِ قلم کیا تھا۔ دسویں صدی ہجری میں شرح حکمۃ العین ہندوستان میں متداول ہوئی تو یہاں کے علمانے بھی اس کو مستحقِ التفات گردانا۔ اس پر ایک حاشیہ مولانا وجیہ الدین گجراتی نے لکھا۔[۴۹] ان کے شاگرد مولانا خوش حال تاشقندی نے بھی دیگر کتابوں کے علاوہ اس پر حاشیہ تحریر کیا۔ عبدالباقی نہاوندی لکھتے ہیں:

ملا خوش حال خلف صدق مولانا قاسم تاشقندی است . . . اوائل طالب علمی شرح ہدایہ و حکمۃ العین و شرح تجرید و حاشیہ قدیم و شرح چغمینی و تحریر اقلیدس حل نمودہ۔[۵۰]

ان حضراتِ علمائے ہند کے علاوہ گیارھویں صدی ہجری میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اس کو موضوعِ فکر ٹھہرایا اور اس پر حواشی تحریر فرمائے۔

حواشی در کنار شرح ہدایۃ الحکمۃ

ہدایۃ الحکمۃ، اثیر الدین ابہری کی تصنیف ہے، یہ اگرچہ ایک صغیر الحجم رسالہ ہے، لیکن اپنے موضوع میں بڑا اہم ہے اور بہت سے علمانے اس کو شروح و حواشی کا مستحق گردانا ہے۔ اس کی ایک شرح، علامہ جلال الدین دوانی کے تلمیذِ رشید میر حسین میبذی نے لکھی، جو اس کے شارح کے نام پر "میبذی" کہلائی۔ پھر علما میں یہی میبذی (یعنی شرح ہدایۃ الحکمۃ) مروّج ہوگئی۔

---

[۴۸] المعارف لاہور۔ اپریل ۱۹۶۸ء۔ ص ۴۰

[۴۹] مآثر الکرام۔ ص ۱۸۱، ۱۸۲

[۵۰] مآثر رحیمی۔ ج ۳، حصہ اول، ص ۳۲، ۳۳

صدرائے شیرازی نے بھی ہدایۃ الحکمۃ کی شرح لکھی جو اُن کے نام پر "صدرا" کہلاتی ہے۔

حلقہ علمائے برصغیر میں بھی میبذی [یعنی شرح ہدایۃ الحکمۃ] پڑھنے اور اس پر حواشی لکھنے کا رواج ہوا۔ ان حواشی میں مولانا محمد حسن علمی، مولانا مفتی نور الحق دہلوی بن شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور قاضی نور اللہ شوستری کے حواشی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی نے اس پر ایک مفید حاشیہ لکھا۔

حواشی در کتار مراح الارواح

مراح الارواح، احمد بن علی بن مسعود کی تالیف ہے اور عربی زبان میں علمِ صرف سے متعلق ہے۔ یہ اگرچہ مختصر کتاب لیکن بقول حاجی خلیفہ کے بڑی مفید ہے اور مدارسِ عربیہ میں متداول و مشہور رہی ہے:

وھو مختصر نافع متداول۔[۱]

اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں علمائے روم اس کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور اُس نواح میں یہ داخلِ نصاب تھی۔ اسی وجہ سے اس کی کئی علما نے شرحیں لکھیں۔ ایک شرح، صحیح بخاری کے معروف شارح علامہ بدر الدین عینی نے بھی لکھی۔ ہندوستان میں مراح الارواح کو بڑی وقعت حاصل ہوئی حضرت علامہ نواب صدیق حسن خاں نے اپنے آخری ایام زندگی میں "تصریف الریاح" کے نام سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی نے بھی اس کتاب کو لائق توجہ ٹھہرایا اور اس پر حواشی تحریر کیے۔

تکملہ حاشیہ عبد الغفور

علمِ نحو کی مشہور اور متداول کتاب "کافیہ" ہے۔ کافیہ، شیخ جمال الدین ابو عمرو عثمان بن عمرو مالکی (متوفی ۶۴۶ھ) کی تصنیف ہے، جو ابنِ حاجب مالکی کے نام سے معروف ہیں۔ یہ اپنے موضوع کا ایک مختصر متن ہے مگر نہایت بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ حاجی خلیفہ نے اس

---

[۱] کشف الظنون۔ ج ۲، ص ۱۶۵۱

کے متعلق لکھا ہے۔

وھی مختصر معتبر نۃ شھرتہ مغنیۃ عن التعریف۔[۱۵۲]

یہ ایک مختصر اور قابلِ اعتماد متن ہے، جس کی شہرت نے اسے تعریف سے بے نیاز کر دیا ہے۔

کافیہ کو مدارسِ عربیہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور علما نے اس کی طرف بے حد التفات کیا۔ اہل علم نے جتنے شروح یا حواشی کافیہ پر تحریر کیے ہیں، دوسری کم ہی کتابوں پر کیے ہوں گے۔ ان سب کا استقصا مشکل ہے۔ مشاہیر شارحین میں سے شیخ رضی الدین محمد بن الحسن استر آبادی نحوی کی شرح کافیہ بڑی مشہور ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی تو رضی کی اس شرح کافیہ کی انتہائی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح مسائلِ نحو کی جمع و تدوین اور تحقیق رضی کی شرح کافیہ میں کی گئی ہے اور کسی کتاب میں نہیں کی گئی، بلکہ کتب نحو کی اکثر کتابوں میں اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف ہی نہیں ہوئی۔

کافیہ کے دوسرے مشہور شارح مولانا عبدالرحمٰن جامی (متوفی ۸۹۴ھ) ہیں، جن کی شرح کافیہ، "الفوائد الفیائیہ"، نہایت شہرت کی حامل ہے اور اپنے شارح کے نام پر ہی "شرح جامی" کے نام سے موسوم ہو گئی ہے۔ علما و طلبا میں شرح جامی کی قبولیت و تداول کا یہ عالم ہے کہ کافیہ کے ساتھ یہ باقاعدہ مدارسِ عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

علمائے ہند کو کافیہ سے شغف و تعلق شروع ہی سے رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، آٹھویں صدی ہجری کے ربعِ اوّل میں اس کی ترویج کا حلقہ بڑھا، جب شیخ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے مرید و تلمیذ اور صرف کی درسی کتاب "زرادی" کے مصنفِ شہیر مولانا فخر الدین زرادی نے اس کے مسائل کو حل کیا، لیکن اس کی باقاعدہ شرح لکھنے والے پہلے ہندی عالمِ دین ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی تھے جنھوں نے "الارشاد" کے نام سے اس کی شرح لکھی اور "شرح ہندی" کے نام سے معروف ہوئی۔ اس سے پہلے کے کسی ہندی شارح کافیہ کا نام تذکرہ و سوانح کی کتابوں میں ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی

---

[۱۵۲] کشف الظنون — ج ۲، ص ۱۳۷۰

کی شرح کافیہ کو ہند اور بیرونِ ہند میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی اور اس نے "شرح ہندی" کے نام شہرت پائی۔ عرصہ تک یہ اپنی گوناگوں افادیت کی وجہ سے علمائے روم وعجم کا موضوعِ تحشیہ بنی رہی۔ اس پر مولیٰ توقانی، خطیب ابوالفضل گازرونی اور میر غیاث الدین منصور نے حواشی تحریر کیے۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نواسے شیخ صفی الدین ردولوی نے بھی کافیہ کی شرح لکھی اور اسے "غایۃ التحقیق" کے نام سے موسوم کیا۔

کافیہ کی معروف شرح "شرح جامی" جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، مدارسِ عربیہ میں مروّج ہے، اور علما نے اس کو کافیہ ہی کی طرح لائق اعتنا جانا اور اس پر حواشی لکھے۔ سب سے اوّل اس پر مُلّا عصام الدین اسفرائینی نے حاشیہ لکھا اور بیشتر مقامات پر مولانا جامی کو ہدفِ اعتراضات ٹھہرایا۔ اس کا جواب مولانا جامی ہی کے ایک شاگرد مولانا عبدالغفور لاری (متوفی ۹۱۲ھ) نے ایک حاشیہ کی شکل میں دیا اور کافیہ کا یہ حاشیہ "حاشیہ عبدالغفور" کہلایا۔ مگر وہ اُسے مکمّل نہ کر پائے[۵۳]۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا یہ خاص موضوع تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو قابل نظرِ التفات گردانا اور اس غیر مکمل حاشیہ کی تکمیل کی۔ اہلِ علم میں مولانا سیالکوٹی کی اس علمی کوشش کو "تکملہ حاشیہ عبدالغفور" کے نام سے شہرت نصیب ہوئی۔

حاشیہ حاشیہ عبدالغفور

مُلّا جامی کے شاگرد مولانا عبدالغفور لاری نے اپنے حاشیہ میں مُلّا عصام الدین اسفرائینی کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو انھوں نے مُلّا جامی پر وارد کیے تھے۔ بعد ازاں ان دونوں (مُلّا عصام الدین اور مُلّا عبدالغفور) پر بعض علما نے محاکمہ کیا، مثلاً مولیٰ مصلح الدین لاری نے اپنے حاشیہ میں ان دونوں کے نقطۂ فکر سے بحث کی۔ مولانا عیسیٰ بن محمد صفوی ایجی (متوفی ۹۵۵ھ) نے بھی ان پر محاکمہ کیا۔ ان کے بعد ابراہیم ماموفی شافعی نے مُلّا عبدالغفور لاری کے حاشیہ

---

[۵۳] کشف الظنون — ج ۲، ص ۱۳۷۱، ۱۳۷۲

پر حاشیہ لکھا۔ اس حاشیہ میں انھوں نے مولانا علی بن محمد صفوی سے استفادہ کیا تھا۔

کافیہ اور شرح جامی تو مدارسِ ہند میں بہت مروّج رہے ہیں اور علما نے ان سے بڑا استفادہ کیا ہے، لیکن حاشیہ عبدالغفور سے بھی وہ بے خبر نہ تھے، اس سے وہ مستفید ہوئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حاشیہ عبدالغفور پر حاشیہ صرف مولانا سیالکوٹی ہی نے تحریر کیا ہے، اور کسی عالم کا نام تذکروں میں مرقوم نہیں۔ پہلے انھوں نے تکملہ حاشیہ عبدالغفور لکھا، بعد میں حاشیہ حاشیہ عبدالغفور سپردِ قلم کیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا سیالکوٹی کو اس حاشیہ سے بہت رغبت تھی اور اُسے وہ طلبا و علما کے لیے مفید سمجھتے تھے۔

حاشیہ مُطوّل

علّامہ سراج الدین ابو یعقوب سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ) نے صرف، نحو، بلاغت، عروض وغیرہ علومِ ادب سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام "مفتاح العلوم" ہے۔ حلقہ اہلِ علم میں یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی، اُسے داخلِ درس کیا گیا اور متعدد علمائے مشاہیر نے اس پر شروح لکھیں، جن میں قطب الدین شیرازی، علّامہ سعدالدین تفتازانی اور میر سید شریف جرجانی کی شروح بالخصوص لائقِ تذکرہ ہیں۔ علمائے ہند نے بھی اس کتاب کو شائستہ التفات ٹھہرایا اور مولانا معین الدین عمرانی دہلوی نے اس پر حاشیہ تحریر کیا[۵۴] ان کے علاوہ شیخ حسین ناگوری نے جو شیخ حمیدالدین ناگوری کی اولاد سے تھے، اس کی قسمِ ثالث کی ایک مفصل و مبسوط شرح سپردِ قلم کی[۵۵]

بعدازاں علمائے عظام نے مفتاح العلوم کے مختصرات بھی تیار کیے۔ المواقف فی الکلام کے مصنفِ شہیر قاضی عضدالدین ایجی نے بھی "فوائدِ غیاثیہ" کے نام سے اسے مختصر کیا۔ یہ وہی فوائدِ غیاثیہ ہے، جس کی صاحب شمس بازغہ ملّا محمود جون پوری نے "فوائد" کے نام سے شرح تحریر کی۔

علّامہ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن بن عمر قزوینی شافعی المعروف بہ خطیبِ دمشق (متوفی ۷۳۹ھ) نے سکاکی کی مفتاح العلوم کا تلخیص المفتاح کے نام سے اختصار کیا، جو اس کی القسم الثالث کا

---

۵۴ اخبار الاخیار۔ ص ۱۴۴

۵۵ تفصیل کے لیے دیکھیے: الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند۔ ص ۳۹ و اخبار الاخیار۔ ص ۱۸۲

اختصار ہے اور معانی، بیان اور بدیع کے فنون کو محتوی ہے۔ تلخیص المفتاح نے علما و طلبا میں بہت جلد شہرت و مقبولیت حاصل کر لی اور متعدد افاضل و علما نے اس کی شرحیں قلم بند کیں۔

علاّمہ سعد الدین تفتازانی نے بھی تلخیص المفتاح کو مرکزِ التفات ٹھہرایا اور اس کی یکے بعد دیگرے دو شرحیں لکھیں۔ ایک بڑی مفصل، جسے انھوں نے "المطول" کے نام سے موسوم کیا۔ یہ شرح ۷۴۸ھ میں تکمیل کو پہنچی۔ دوسری اس سے مختصر، جو "مختصر المعانی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ شرح ۷۵۶ھ کو غجدوان میں مکمل ہوئی۔ یہ دونوں کتابیں شہرت و تداول کے لحاظ سے بلند مرتبے کو پہنچیں۔ علما و طلبا نے ان کو بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھا اور مدارسِ عربیہ کے اعلیٰ نصاب میں داخل کی گئیں۔ بہت سے علمائے عظام نے ان کو حواشی و تعلیقات کا موضوع ٹھہرایا۔[۵۶]

مدارسِ ہند میں مطول کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی اور علما نے اس پر تحشیے لکھے۔ ہمارے ہاں عربی مدارس کے نصاب میں مطول "ما انا قلت" کی بحث تک پڑھائی جاتی ہے۔ برِ صغیر میں اس کتاب کا بہت رواج تھا اور علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کا باقاعدہ اساتذہ سے درس لیتے تھے۔ اس کی اہمیت و مقبولیت کا اندازہ میرؔ کے اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو ہندوستان کے مشہور عالم مولانا شبیر احمد خاں غوری نے ذکرِ میر کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اُردو کے مشہور شاعر میرؔ نے لکھا ہے کہ انھوں نے دہلی کے ایک استاذ سے مطول پڑھی، اور اس کے بدلے میں وہ انھیں اپنا صبح کا ناشتہ حاضرِ خدمت کر دیا کرتے تھے۔[۵۷]

متعدد معروف اور کبار علمائے ہند نے مطول پر حواشی تحریر کیے، جن میں شیخ طاہر بن رضی ہمدانی، مولانا وجیہ الدین گجراتی، قاضی نور اللہ شوستری اور مفتی وجیہ الدین گوپاموی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے بعد کے فضلائے ہند میں سے سید محمد بن محمد قنوجی، شیخ نور الدین بن محمد صالح گجراتی، مولانا نور الدین کشمیری، قاضی نجف علی بن عظیم الدین جھجری، قاضی عبد النبی احمد نگری،

---

[۵۶] تفصیل کے لیے دیکھیے: کشف الظنون۔ ج ۲، ص ۱۴۷۳ تا ۱۴۷۸

[۵۷] المعارف (لاہور)، مئی ۱۹۶۸ء۔ ص ۴۸

شیخ فرید الدین احمد آبادی، شیخ جمال الدین بن رکن الدین گجراتی اور حکیم معز الدین خالص پوری کے حواشی کا پتا چلتا ہے [۵۸]

گیارھویں صدی ہجری میں ہمارے ممدوح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اس اہم کتاب کو فکر و نظر کا محور بنایا اور علومِ بلاغت و فصاحت اور بیان و بدیع کے اس عظیم شاہ کار پر حاشیہ تحریر کیا۔

ترجمہ غنیۃ الطالبین

مولانا سیالکوٹی نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "غنیۃ الطالبین" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ انھوں نے لاہور کے ایک عارف باللہ بزرگ شیخ بلاول قادری لاہوری کی فرمائش پر کیا تھا۔ اس کتاب کے ساتھ مولانا کے صاحب زادے مولانا عبداللہ لبیب کا خطبہ بھی شامل ہے۔

الدرۃ الثمینہ

مولانا سیالکوٹی کی فہرستِ تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر مروجہ علوم کی مشہور درسی کتابوں پر حواشی تحریر کیے ہیں۔ مستقل کتاب صرف ایک ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کا دور کتبِ درسیہ پر حواشی و تعلیقات اور تشریحات و توضیحات کا دور تھا، اور اس دور میں یہ بہت بڑی علمی اور فنی خدمت متصور ہوتی تھی۔ اس ضمن میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے، ان میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ دقیق مسائل کو وضاحت سے پیش کرنا اور ان کی زلف گرہ گیر کو حسن و خوبی سے سلجھانا، انہی کا کام تھا۔ ان کے ذہنِ رسا نے جن پیچیدگیوں کو حل اور جن علمی عقدوں کو وا کیا ہے، وہ کوئی دوسرا نہیں کر سکا۔

گزشتہ سطور میں ان کے حواشی و تعلیقات کا تعارف کرایا جا چکا، اب ان کی ایک مستقل تصنیف "الدرۃ الثمینۃ فی علم الواجب تعالیٰ" کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا مقصود ہے ـــــ یہ ان کی ایک معرکہ آرا کتاب ہے، اس کو الرسالۃ الخاقانیہ کے نام سے

---

۵۸ الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند۔ ص ۳۹

بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کی بیشتر کتابیں ان کے محسن و مربی اور قدر دان، شاہ جہان بادشاہ کے نام منتسب ہیں۔ اس گراں مایہ تصنیف کا انتساب بھی برصغیر کے اسی مغل حکمران کی طرف ہے، لہٰذا اس کا نام الرسالۃ الخاقانیہ رکھا گیا۔ کتاب کے آخر میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

لکن ھذا آخر ما قصدنا ایرادہ فی ھذہ الرسالۃ الخاقانیۃ۔

اس کی وجہِ تالیف یہ ہے کہ فرماں روائے ایران شاہ صفی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شاہ عباس دوم اورنگِ ایران پر متمکن ہوا تو بادشاہِ ہند شاہ جہان نے شاہ صفی کی تعزیت اور شاہ عباس کی تخت نشینی پر مبارک باد پیش کرنے کی غرض سے اپنے ایک امیر جان نثار خاں کی قیادت میں ایک وفدِ سفارت، ایران روانہ کیا، جس میں محمد فاروق (مشرف) اور محب علی (وقائع نویس) شامل تھے۔ یہ تین رکنی وفدِ سفارت ایران پہنچا تو ایرانی امرا و علما سے ان کی طویل ملاقاتیں ہوئیں اور ان کے اعزاز میں مختلف علمی مجالس منعقد کی گئیں، جن میں ایرانی علما نے ان سے فلسفے کے بعض مباحث پر گفتگو کی۔ ایران کا وزیرِ اعظم اس زمانے میں خلیفہ سلطان اعتماد الدولہ تھا، جو بہت بڑا معقولی تھا، اس نے بھی ہندوستانی علما سے معقولات کے مسائل پر اپنے نقطۂ فکر کا بے تکلفی سے اظہار کیا۔ مغلیہ دور کا ہندوستان بھی علومِ عقلیہ کا گہوارہ تھا اور اس ملک میں اس وقت بڑے بڑے منطقی اور فلسفی موجود تھے۔ خود اس وفدِ سفارت کے ارکان میں سے محمد فاروق مشرف اور محب علی وقائع نویس فلسفہ و حکمت کے فاضل کامل تھے اور معقولات پر عبور میں ان کو بڑا غرہ تھا۔ مگر ایرانی وزیرِ اعظم نے ان پر ایسے سوالات کیے کہ یہ حیران رہ گئے۔ مثلاً اس نے کہا کہ امام غزالی نے قدمِ عالم، علمِ واجب تعالیٰ اور نفیِ حشرِ اجساد کے بارے میں ابو نصر فارابی اور ابنِ سینا کی تکفیر کی ہے۔ لیکن بعض علما ان مسائل میں تاویل سے بھی کام لیتے ہیں۔ فرمایئے آپ کی کیا رائے ہے؟۔

سفارتِ ہند کے ارکان، ایرانی وزیر کے ان فاضلانہ سوالات کا تسلی بخش جواب نہ دے سکے، جس سے علومِ عقلیہ میں علمائے ہند کی عالمی شہرت کو دھچکا لگا۔ شاہ جہان ان دنوں کابل میں مقیم تھا، اس علمی ہزیمت کی خبر سن کر وہ متاثر تو ضرور ہوا، مگر وہ اتنی جلدی ایرانی علما کے مقابلے میں ہندوستانی علما کی شکست تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے اپنے وزیر علامی سعد اللہ خاں

سے کہا کہ مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی کو خط لکھا جائے کہ وہ مذکورہ بالا مسائلِ ثلاثہ سے متعلق ایک مختصر مگر جامع رسالہ لکھ کر شاہی دربار میں پیش کریں۔

سعد اللہ خاں نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو دس پندرہ دن کے اندر اندر رسالہ لکھنے کی فرمائش کی، مگر مولانا نے خط پڑھتے ہی قلم ہاتھ میں پکڑا اور صرف ایک ہفتے میں ایسا عمدہ رسالہ قلم بند کر دیا جو مذکورہ مسائل پر پوری طرح حاوی تھا اور اپنے دامنِ صفحات میں ایسی جامعیت لیے ہوئے تھا، جو ایک ضخیم کتاب میں بھی مشکل سے پائی جاتی ہے۔

الدرۃ الثمینہ یا الرسالۃ الخاقانیہ دو ابواب پر منقسم ہے:

باب اول علمِ باری تعالیٰ سے متعلق اور اس مسئلے کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے۔ یہ باب تین ابحاث کو محیط ہے۔ پہلی بحث اثباتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ہے۔ دوسری بحث میں کیفیت علمِ باری کی وضاحت سے تعرض کیا گیا ہے اور تیسری بحث میں علم باری تعالیٰ کی عمومیت معرضِ بیان میں لائی گئی ہے۔

کتاب کا یہ حصّہ نہایت علمی اور گہرا ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک فلسفہ و حکمت کی روشنی میں اثباتِ باری تعالیٰ، کیفیتِ علمِ باری تعالیٰ اور عمومیتِ علم باری تعالیٰ کے اہم مسئلے کی توضیح کی گئی ہے۔

کتاب کے باب ثانی میں مولانا نے دوسرے مسائل ـــ یعنی حشر و نشرِ اجساد اور حدوث و قدوم عالم ـــ کو موضوعِ بحث ٹھہرایا ہے۔ اس سلسلے میں ابونصر فارابی اور ابنِ سینا کی تکفیر کے بارے میں امام غزالی کی رائے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ بعض دیگر فلاسفۂ اسلام اور اصحابِ علم کے نظریات بھی بیان کیے ہیں۔ اس ضمن میں محقق دوانی اور امام رازی کی رائے بھی نقل کی ہے۔ بعد ازاں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ فرماتے ہیں:

اقول تکفیرھم بانکار الحشر الجسمانی حق لانہ مما نطق بہ الکلام المجید۔

میں کہتا ہوں کہ حشرِ اجساد سے انکار کی بنا پر ان کی تکفیر ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں خود قرآنِ مجید ناطق ہے۔

اسی طرح نفی قدمِ عالم سے متعلق بھی قرآنِ مجید سے استدلال کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ یہ

نظریات خود قرآن مجید میں موجود ہیں۔

بعض دیگر تصنیفات

ان تصنیفات و حواشی کے علاوہ ڈاکٹر زبید احمد اور منشی محمد الدین فوق کی کتابوں سے مولانا کی مندرجہ ذیل تصنیفات کا بھی پتا چلتا ہے۔

دلائل التجدید :- یہ رسالہ حضرت مجدد الف ثانی کے دعویٰ تجدید کی تائید اور اثبات کے موضوع پر ہے۔ اس میں مولانا نے مستحکم و مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے کہ شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا دعویٰ صحیح ہے اور یہ دَور مجدد الف ثانی کا متقاضی ہے اور وہ شیخ احمد سرہندی ہیں۔

حاشیہ علیٰ شرح تہذیب : منطق کی مشہور کتاب شرح تہذیب پر مولانا سیالکوٹی کا حاشیہ

القول المحیط : علمِ منطق کے بارے میں ایک رسالہ۔

سیالکوتی علی التصورات : یہ بھی علمِ منطق میں ہے۔

زبدۃ الافکار :

حواشی علی الکشاف :

حواشی علی الحسامی :

مسجد اور مدرسہ وغیرہ

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ابتدائی دَور غربت اور تنگ دستی کا دَور تھا، لیکن شاہ جہان سے رابطہ پیدا ہو جانے کے بعد اُن کے حالات بالکل بدل گئے تھے اور وہ امیرانہ و رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہ جہان ان کے علم و فضل سے انتہائی متاثر اور ان کا بہت بڑا قدر دان تھا۔ اس نے ان کو اچھی خاصی جاگیر عطا کی، کئی مرتبہ نقد روپے اور انعام و اکرام سے نوازا۔ سونے سے تلوایا اور پھر ان کے ہم وزن رقم جو چھ ہزار روپے بنتی تھی، ان کی خدمت میں پیش کی۔ چنانچہ سولھویں سالِ جلوس (۱۰۵۲ھ) کے واقعات میں محمد صالح کنبو لکھتا ہے:

جامع فضائل وہبی و کسبی مولانا عبدالحکیم سیالکوتی را بزروزن کردہ، شش ہزار روپیہ ہم وزن آں گنجِ ہنر بدو مرحمت نمودند[59]

---

[59] عمل صالح - ج ۲، ص ۳۰۹۔

یعنی (شاہ جہان نے) جامع فضائل وہبی و کسبی مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو سونے سے تلوایا اور پھر اس کے ہم وزن چھ ہزار روپے ان کو عنایت کیے۔

مولانا ذوالفقار احمد کی روایت کے مطابق شاہ جہان نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو دو مرتبہ ترازو میں تولا اور جو روپیہ ان کے تول میں آیا، وہ انہی کو عطا کر دیا۔ ہر تول میں چھ ہزار روپے آئے۔ متعدد گاؤں بھی ان کو شاہ جہان نے جاگیر میں دیے۔[۶۰]

مولانا نے یہ روپیہ بڑے اچھے کاموں میں خرچ کیا۔ اپنے مکان کے قریب ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا اور ساتھ ہی مسجد تعمیر کی۔ اس مدرسے میں وہ خود درس دیتے تھے اور ہند اور بیرونِ ہند کے علما و طلبا ان سے علم حاصل کرتے تھے۔ ان کے قیام اور مصارف کے مولانا ہی کفیل تھے۔ ان کی تعمیر کردہ مسجد اب بھی سیالکوٹ کے محلہ میانہ پورہ میں موجود ہے۔ منشی محمد الدین فوق کے حسبِ تصریح لفظِ "میانہ" پنجابی زبان میں مسجد کے ملاّ، امام، خطیب اور میاں کے لیے بولا جاتا ہے۔ چوں کہ مدرسہ اور مولانا کے قیام کی وجہ سے طلبائے علم وہاں رہتے تھے، لہٰذا اس جگہ کا نام "میانہ پورہ" مشہور ہو گیا، اور یہ نام مولانا کے زمانے ہی سے چلا آ رہا ہے۔[۶۱]

لالہ امین چند نے بھی یہی لکھا ہے:

ان [مولانا عبدالحکیم] کا مدرسہ بڑا نامی گرامی تھا، چنانچہ اس موضع کا نام، میانہ پورہ، انہی کے باعث مشہور ہے۔[۶۲]

مفتی غلام سرور قریشی بھی یہی بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ محلہ مولانا عبدالحکیم ہی کی وجہ سے [میانہ پورہ کے نام سے] مشہور ہے، اور اسے مولانا نے شاہ جہان کے عہد میں آباد کیا تھا۔[۶۳]

منشی محمد الدین فوق لکھتے ہیں کہ:

۶۰۔ قضاء الارب من ذکر علما النحو والادب۔ ص ۱۹۸، ۱۹۹

۶۱۔ مولانا عبدالحکیم، سوانح۔ ص ۴۴، ۴۵

۶۲۔ تواریخ سیالکوٹ۔ ص ۲۹۴

۶۳۔ تاریخ مخزنِ پنجاب۔ ص ۲۵۵

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی مسجد کے قریب کچھ زمین خالی پڑی ہوئی تھی، [مشہور اہلِ حدیث عالم] مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی مرحوم کے والد مستری قادر بخش مرحوم نے کمیٹی سے خرید کر یہ جگہ مسجد کے نام وقف کر دی۔ ۱۹۱۹ء میں اس زمین کو صحنِ مسجد میں شامل کر کے مسجد کی توسیع کی گئی۔ ایک فوارہ اور حوض بھی تیار کیا گیا جو پانی سے لبریز رہتا تھا۔

مولانا نے مسافروں کی سہولت کے لیے ایک بہت بڑی کارواں سرائے اور حمام بھی تعمیر کرائے۔ منقول ہے کہ انگریزوں نے ۱۲۷۵ھ میں اس عمارت کو خیراتی شفاخانے میں بدل دیا تھا۔[۶۴] موجودہ سول ہسپتال، اسی خیراتی شفاخانے اور ڈسپنسری کی عمارت میں بنایا گیا ہے۔

مولانا عبدالحکیم نے ایک بہت عمدہ باغ بھی بنایا تھا اور اس کے اردگرد مضبوط فصیل تعمیر کی تھی۔ منشی محمد الدین فوق کا بیان ہے:

"راقم الحروف، ۱۹۲۰ء میں وہاں گیا۔ ایک دو آموں کے درخت نظر آئے، ایک کنواں جاری تھا اور اس کے ساتھ کچھ مزروعہ اراضی تھی، اس جگہ مولانا کی قبر بھی ہے۔ پوچھا، مولانا کا باغ کہاں ہے؟ جواب ملا۔ یہی باغ ہے، جہاں تم کھڑے ہو، اور جہاں یہ کھیت نظر آرہے ہیں۔ اب نہ باغ ہے، نہ فصیل، نہ کوئی عمارت۔"

مولانا نے سیالکوٹ میں ایک خاصا بڑا تالاب بھی تعمیر کرایا تھا، کہا جاتا ہے، اس تالاب کی تعمیر پر مولانا نے لاکھوں روپے خرچ کیے تھے اور اس میں براہِ راست دریائے چناب سے ایک نہر کے ذریعے پانی لانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس سے ملحق کچھ عمارتیں، برجیاں اور پل وغیرہ بھی تھے۔ سکھوں کے عہدِ حکومت میں یہ سب کچھ برباد ہو گیا ـــــ اس تالاب کے سلسلے میں لالہ امین چند کے یہ الفاظ قابلِ ذکر ہیں:

یہ وہی تالاب ہے کہ جو مولوی عبدالحکیم کے زمانے میں بنوایا تھا مگر مدت سے اٹ گیا تھا۔ اب بعد غدر جناب مسٹر پرنسپ صاحب بہادر کے ایما سے باہتمام سید قائم علی صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ، چودھریانِ شہر نے تیار کرایا اور کچھ روپیہ سرکار نے بھی عطا کیا۔ گویا کل اس شہر میں یہی ایک ـــــ

---

۶۴ سوانح ـ ص ۵۴

تالاب ہے[۶۵]

بعد ازاں ایک زمانہ آیا کہ یہی تالاب سیالکوٹ کے مقامی بجلی گھر کے پانی کے ذخیرے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔

سیالکوٹ میں مولانا عبدالحکیم کی تعمیر کردہ عیدگاہ بھی ہے جو اب تک موجود ہے۔ اس میں شہر کے لوگ عید کی نماز پڑھتے ہیں اور اس کا انتظام مقامی انجمن اسلامیہ کے سپرد ہے۔ اس عیدگاہ کے چار دروازے تھے اور ہر دروازے پر بلند مینار تعمیر کیے گئے تھے۔ مرورِ ایام سے دیوار اکثر جگہ سے شکستہ ہو گئی۔ ۱۲۸۷ھ میں بعض مخیر لوگوں نے روپیہ اکٹھا کیا اور عیدگاہ کی مرمت کرائی گئی[۶۶]

وفات

مولانا عبدالحکیم نے ۱۶ ربیع الاوّل ۱۰۶۷ھ کو وفات پائی اور سیالکوٹ میں مدفون ہوئے[۶۷]

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تاریخِ وفات میں قدرے اختلاف ہے۔ بختاور خاں کا بیان ہے:

دوازدہم ربیع الاول سنہ ہزار و شصت و ہفت در سیالکوٹ رحلت نمود[۶۸]

۱۲ ربیع الاوّل ۱۰۶۷ھ کو سیالکوٹ میں وفات پائی۔

غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی دو تصنیفات میں دو تاریخ ہائے وفات بیان کی ہیں۔ مآثر الکرام میں لکھتے ہیں:

دوازدہم ربیع الاوّل (۱۰۶۷ھ) سبع و ستین و الف طومارِ حیات پیچیدہ و در سیالکوٹ مدفون گردید[۶۹]

۱۲ ربیع الاوّل ۱۰۶۷ھ کو ان کی کتابِ حیات لپیٹی گئی اور وہ سیالکوٹ میں مدفون ہوئے۔

---

۶۵ تواریخ سیالکوٹ۔ ص ۲۹۴ — ۶۶ سوانح۔ ص ۴۶

۶۷ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب۔ ص ۱۹۸، ۱۹۹۔

۶۸ مرآۃ العالم۔ ورق ۴۹۲ ب — ۶۹ مآثر الکرام۔ ص ۱۹۳، ۱۹۴

سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں:

توفی فی الثامن عشر من شہر ربیع الاول سنة سبع وستین و الف و دفن بسیالکوٹ۔[۷۰]

۱۸ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ کو انتقال کیا اور سیالکوٹ میں دفن کیے گئے۔

علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی نے بھی یہی تاریخ وفات تحریر کی ہے۔ یعنی ۱۸ ربیع الاول، ۱۰۶۷ھ۔[۷۱]
اسماعیل پاشا[۷۲] اور خیرالدین زرکلی نے[۷۳] بھی یہی تحریر کیا ہے۔ مولوی رحمان علی نے سنِ وفات تو ۱۰۶۷ھ ہی لکھا ہے البتہ تاریخ ۱۶ ربیع الاول (تاریخ شانزدہم ربیع الاول) تحریر کی ہے[۷۴]
لیکن محمد اسلم پسروری ان کی تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاول اور سالِ وفات ۱۰۶۸ھ لکھتے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں:

آں قدوۃ افاضل دوازدہم ربیع الاول سن ہزار و شصت و ہفت کہ اول جلوسِ عالم گیری در سیالکوٹ رحلت نمود۔

حضرت نواب صدیق خاں رحمۃ اللہ علیہ بہت آگے چلے گئے ہیں۔ وہ ۱۰۹۷ھ لکھتے ہیں:

توفی فی سنة ۱۰۹۷ھ و دفن ببلدہ[۷۵]

مولانا عبدالحی حنفی لکھنوی رقم طراز ہیں:

توفی فی نیف وستین والف[۷۶]

یعنی ۱۰۶۰ھ کے بعد دفن ہوئے۔

مولوی فقیر محمد جہلمی کے بقول ان کی وفات ۱۰۶۸ھ یا ۱۰۹۷ھ میں ہوئی[۷۷]۔

محمد صالح کنبو نے ۱۰۶۷ھ سنِ وفات لکھا ہے:

---

[۷۰] سبحۃ المرجان – ص ۶۶
[۷۱] نزہۃ الخواطر – ج ۵، ص ۲۱۱
[۷۲] ہدیۃ العارفین – ج ۱، ص ۵۰۴
[۷۳] اعلام المؤلفین – ج ۴، ص ۵۵
[۷۴] تذکرہ علمائے ہند – ص ۱۱۰، ۱۱۱
[۷۵] ابجد العلوم – ص ۹۰۲، ۹۰۳
[۷۶] طرب الاماثل بتراجم الافاضل – ص ۲۲۳، ۲۲۴
[۷۷] حدائق الحنفیہ – ص ۴۱۴، ۴۱۵

درسال ہزار وشصت و ہفت ہجری متوجہ دار البقا گردید۔[۷۷]

یعنی ۱۰۶۷ھ کو راہیِ ملک بقا ہوئے۔

دوسری جگہ محمد صالح کنبو نے شاہ جہان کے اکتیسویں[۳۱] سالِ جلوس (۱۰۶۷ھ) کے حالات میں بالکل واضح الفاظ میں لکھا ہے:

ہژدہم ربیع الثانی بعرض اشرف رسید کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کہ شرح فضل و کمالاتش را دفتری جداگانہ باید، ایں مکان را محلِ اقامتِ خود ندانستہ، دوازدہم ماہِ مذکور رہ گرائ عقبیٰ گردید۔[۷۹]

۱۸ ربیع الثانی (۱۰۶۷ھ) کو بادشاہ (شاہ جہان) کو اس بات کی اطلاع پہنچی کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے، جن کے فضل و کمال کی وضاحت کے لیے ایک الگ دفتر کی ضرورت ہے، اس دنیا میں اقامت گزیں رہنا اپنے لیے مناسب نہ جانا، وہ ۱۲ ماہِ مذکور (ربیع الثانی) کو دارِ عقبیٰ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہمارے نزدیک محمد صالح کنبو کی روایت زیادہ صحیح اور قابلِ اعتماد ہے۔ کیوں کہ یہ مولانا سیالکوٹی کے معاصر ہیں اور ان کی بدرجہ غایت تکریم بھی کرتے ہیں۔ انھیں وہ اپنی تصنیف — عملِ صالح — میں ان الفاظ سے یاد کرتے ہیں:

حبرِ محقق، نحریرِ مدقق، سرآمد دانشوران واجب التعظیم۔

محمد صالح کنبو، علامہ کی بڑی قدر کرتے اور بہترین الفاظ میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ رقم طراز ہیں:

بالجملہ آں صاحبِ فضائلِ صوری و معنوی حقِ عظیم بر سائر اربابِ فضائل ثابت کردہ، درسال ہزار وشصت و ہفت ہجری متوجہ دار البقا گردید۔[۸۰]

یعنی مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے جو صوری و معنوی خوبیوں کے حامل تھے، تمام اصحابِ علم اور اربابِ فضل پر اپنا حقِ فوقیت ثابت کر دیا، ۱۰۶۷ھ کو عالمِ جاودانی کو تشریف لے گئے۔

حافظ عبدالرحمٰن امرتسری ہندوستان کی سیاحت کو نکلے تو سیالکوٹ بھی گئے۔ اپنے سیاحت نامہ میں وہ سیالکوٹ کا ذکر کرتے ہوئے، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی شخصیت،

۷۷۔ عملِ صالح، ص ۳، ص ۲۹۵ ۷۹۔ ایضاً، ص ۲۰۵ ۸۰۔ ایضاً، ص ۲۹۵

ان کے علم و فضل اور ان کے مدفن کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے الفاظ درج ذیل ہیں:

ہسپتال سے دو سو گز کے فاصلے پر مشہور فاضل مولوی عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی کا مقبرہ ہے۔ موجودہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں بڑی شان و شوکت کی عمارت تھی۔ مگر اب بالکل شکستہ ہوگئی ہے۔ مولوی صاحب شاہ جہان بادشاہ کے زمانے میں ایک زبردست عالم اور صاحبِ تصانیف گزرے ہیں۔ آپ نواب سعداللہ خاں وزیرِ اعظم کے ہم سبق تھے۔ عراق، شام اور استانبول کی متعدد درس گاہوں میں مجھے آپ کی تصانیف داخلِ درس دیکھنے کا موقع ملا۔ اگرچہ نواب سعداللہ خاں کو ہندوستان کی وزارت کا رتبہ حاصل تھا، مگر ہندوستان سے باہر بلادِ اسلامیہ میں علمی حیثیت سے جو شہرت مولوی عبدالحکیم صاحب کو حاصل ہوئی، اسے کوئی ہندوستانی مصنف حاصل نہیں کر سکا۔ آپ کا انتقال ۱۰۶۷ھ – ۱۶۵۶ء میں اسی جگہ [سیالکوٹ میں] ہوا[۱۵۸]

تلامذہ

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے تصنیف و تالیف اور شروح و حواشی کی گرم بازاری کے ساتھ ساتھ تمام عمر ہنگامۂ تدریس بپا کیے رکھا اور متعدد فحول علما نے ان سے اخذِ علم کیا، اختصار کے ساتھ ان میں سے چند حضرات کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

قاضی عبدالرحیم مرادآبادی

قاضی عبدالرحیم بن عبدالرشید بہاری ثم مرادآبادی اپنے عصر کے مشاہیر علما میں سے تھے، فاضلِ کبیر اور دیارِ ہند کی نامور شخصیت تھے۔ نو سال سے زائد عرصہ مولانا سیالکوٹی کی خدمت میں رہے اور علم و فضل کی نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ مند ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مرادآباد کی مسندِ قضا پر متعین کیے گئے۔ طویل مدت تک اس خدمت پر مامور رہے اور ساتھ ہی درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان سے بہت سے علما نے حصولِ علم کیا۔ قاضی صاحب مرحوم کا حلقۂ تلمذ مشاہیر علما پر مشتمل تھا۔

ملّا عصمت اللہ سہارن پوری

تذکرۂ باغستان کے مصنف نے ملّا عصمت اللہ سہارن پوری کا شمار مولانا سیالکوٹی کے

---

۱۵۸ سیاحتِ ہند (یعنی ہندوستان کا ہفت سالہ سفرنامہ) ص ۵۹، ۶۰۔ مطبع رفاہِ عام سٹیم، لاہور۔ طبع اول ۱۹۰۹ء

تلامذہ میں کیا ہے۔ عالمِ کبیر، فاضلِ جلیل اور معروف فقیہ تھے۔ درس و تدریس ان کا اصل مشغلہ تھا۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے مگر بقول صاحب "تذکرہ علمائے ہند" :

دَر باطن چشمِ بصیرتش روشن بود[۵۸۲]

ان کے باطن میں چشمِ بصیرت روشن تھی۔

انھوں نے کافیہ کی شرح "الفوائد الضیائیہ" (یعنی شرح جامی) پر حاشیہ لکھا اور شرح خلاصۃ الحساب تحریر کی۔ بہت سے علما و طلبا کو ان سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

مولوی محمد احمد قنوجی

مولانا سیالکوٹی کے تلامذہ کی طویل فہرست میں مولوی محمد احمد قنوجی کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ یہ اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم تھے۔ عمر بھر تعلیم و تدریس میں مصروف رہے۔ کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں منطق کی کتاب صدرا کا حاشیہ لائق تذکرہ ہے۔

ملّا عبدالوہاب پسروری

عہدِ شاہ عالم کے مشہور عالم اور فرحت الناظرین کے مصنّف محمد اسلم پسروری کے جدّ امجد ملّا عبدالوہاب پسروری بھی مولانا سیالکوٹی کے شاگردوں میں شامل تھے۔ معروف فاضل اور عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ محمد اسلم پسروری نے اپنی تصنیف فرحت الناظرین میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ملّا عبدالوہاب پسروری شاہ جہانی عہد کے عالم تھے اور شاہ جہان ان کے علم و فضل سے اس درجہ متاثر تھا کہ اس نے کئی مرتبہ ان کو وظائف و مناصب سے نوازا اور علامی نواب سعد اللہ خاں کی سعی و کوشش سے اپنے بیٹوں کے نام دو گاؤں شاہ جہان کی طرف سے قبول کیے۔ بعد میں شاہ جہان نے دو مزید دیہات کا اضافہ کر کے یہ تعداد چار تک بڑھا دی تھی۔ یہ دیہات کافی عرصہ ان کے خاندان کے تصرف میں رہے، مگر سکھوں کے دورِ ہنگامہ میں ان کے قبضے سے نکل گئے۔

ملّا عبدالوہاب پسروری نے مولانا سیالکوٹی سے فقہ و اصول اور معانی کی کتابیں پڑھیں اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد تمام عمر درسِ علومِ دینی میں صرف کر دی۔ ان سے بہت سے علما و

---

۵۸۲ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۴۰

طلبا نے استفادہ کیا۔

مولوی محمد معظّم

مولوی محمد معظم بن احمد صدیقی موضع بنّہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے تحصیل کی اور علوم دینیہ میں اپنے معاصرین سے سبقت لے گئے۔ قرآن مجید مع تفسیر بیضاوی کے ان کو حفظ تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے بہادر شاہ نے ان کو ان کے وطن بنّہ کا قاضی مقرر کیا اور چند گاؤں بطور انعام عطا کیے۔ عمر بھر مسندِ تدریس اور منصبِ قضا پر متعین رہے۔ صاحبِ تصانیف بھی تھے۔ قرآن مجید کی تفسیر بھی معرضِ تحریر میں لائے تھے، مگر وہ سکھوں کے دورِ استیلا میں نذرِ آتش کر دی گئی تھی۔ علاوہ ازیں مثنوی مولانا روم کی شرح بھی لکھی تھی۔

ملّا عبدالعزیز عزّت اکبر آبادی

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے شاگردوں میں ایک عالم دین ملّا عبدالعزیز عزّت اکبر آبادی تھے۔ یہ مولانا عبدالرشید کے بیٹے تھے، جن کا شمار اکابر علما میں ہوتا تھا۔ ملّا عبدالعزیز عزّت عنفوانِ شباب ہی میں حصولِ علم سے فارغ ہو کر درس و افادہ میں مصروف ہو گئے تھے اور اپنے وطن اکبر آباد میں مسندِ تدریس پر فائز تھے۔ ان کی علمی خوبیوں کی بنا پر اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں اکثر ان کا تذکرہ رہتا اور بادشاہ ان کی تعریف کرتا۔ ان کے بعض رسائل و مسودات بھی بادشاہ کی نظر سے گزرے تھے، جنھیں دیکھ کر وہ ان سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے ان کو دربار میں طلب کر کے "موردِ انواعِ عاطفت" فرمایا اور "منصبِ عمدہ و خدمتِ عرضِ مکرر" کا امتیاز بخشا۔ عالم گیر ان کا بہت احترام کرتا تھا اور اس کی "توجہاتِ روز افزوں" ان کو حاصل تھیں[۹۸۳]۔

ملّا عبدالعزیز بہت اچھے شاعر بھی تھے اور عزّت تخلّص کرتے تھے۔ مرآۃ العالم میں بختاور خاں کا بیان ہے کہ عالم گیر اپنی تخت نشینی کے اٹھارویں سال میں حسن ابدال میں اقامت پذیر تھا، ملّا عبدالعزیز

---

۹۸۳ ضمیمہ اورنٹیل کالج میگزین ۔ ص ۷۷ ۔ (اگست ۔ نومبر ۱۹۵۳ء)

عزت اکبر آبادی بھی اس کے پاس موجود تھے۔ جب وہ بادشاہ سے اجازت لے کر لاہور پہنچے تو مندرجہ ذیل غزل لکھ کر بادشاہ کو حسن ابدال بھیجی:

زِ دردِ دل چہ نگارم کہ جوشِ بے تابیست | زِ شوقِ جاں چہ نویسم کہ نامہ سیمابیست
شبِ فراق خیال کہ ریخت خون دلم | کہ باز اشک گلابی و دیدہ عنابیست
چگونہ شرحِ دہم حالِ دل کہ بے تابم | زیادِ تابِ رخش دل کتان و مہتابیست
نشستہ ایم دریں بحر، تا خدا کند | بکشتی کہ زیک قطرہ آب گردابیست
نماند صورتِ رازِ دلم نہاں عزت | کہ دیدہ صفحۂ تصویرِ رنگِ بیخوابیست

بختاور خاں نے اس غزل کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے:

گوہر ایں اشعار عربی و فارسی و ہندی کہ ازاں محیط فضل بساحلِ ادائی و رنگینی مضمون رسیدہ ہمہ آبدار و آویزۂ گوشِ مستعدانِ روزگار است[۵۸۴]

مُلّا محمد افضل جون پوری

ملّا محمد افضل جون پوری، اپنے عصر کے علامۂ زماں و افتخارِ زمانیاں تھے۔ فنونِ درسیہ میں مہارت رکھتے تھے، درسیات میں جو فضل و کمال ان کو حاصل تھا، وہ اس عہد کے علمائے جون پور میں اور کسی کو حاصل نہ تھا۔ معاصرین میں نہایت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور لوگوں کے دل ان کی عزت سے معمور تھے۔ جون پور سے لاہور آئے اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حلقۂ درس میں شمولیت کی۔ کئی سال ان کی خدمت میں رہے اور علومِ مروجہ سے فارغ ہو کر اپنے وطن جون پور کو مراجعت کی۔ جون پور میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس سے بے شمار تشنگانِ علوم نے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ یہ ہندوستان میں جہاں گیر کا عہد تھا۔ وہ ان کی بہت تکریم کرتا تھا، اور انھیں "استاد الملک" کے خطاب سے نوازا تھا۔ مدرسہ شاہی میں تدریس کے فرائض بھی ان کے سپرد تھے۔ ان کے لیے جاگیر بھی مقرر کی تھی[۵۸۵]۔ ملّا محمد افضل کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن کا تذکرہ ان کے اصل مقام پر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

---

[۵۸۴] مراۃ العالم ورق ۹۴ الف

[۵۸۵] ماہنامہ "ثقافت" لاہور۔ بابت جون ۱۹۶۷ء۔ بحوالہ تذکرہ علمائے جون پور (قلمی) از خیر الدین محمد الہ آبادی۔ ورق ۱۹ الف۔

چندر بھان برہمن

مولانا سیالکوٹی کے شاگردوں کی طویل فہرست میں عہدِ شاہ جہانی کا ایک ممتاز ہندو شاعر و ادیب چندر بھان تھا جو برہمن تخلص کرتا تھا اور چندر بھان برہمن کے نام سے معروف تھا۔ وہ لاہور کا باشندہ تھا۔ اس نے اپنی تصنیف "چہار چمن" کے تیسرے چمن میں اپنی زندگی کی بعض تفصیلات درج کی ہیں، اس نے بتایا ہے کہ وہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا تلمیذ ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس نے ابتدائی تعلیم مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے حاصل کی تھی۔ اس کی مشہور تصنیفات یہ ہیں :

چہار چمن، تحفۃ الانوار، گلدستہ، نگارنامہ، تحفۃ الفصحا، مجموعۃ الفقرا، منشآت، دیوانِ فارسی ـــ باختلافِ روایات چندر بھان برہمن نے ۱۰۷۳ھ یا ۱۰۷۵ھ کو وفات پائی[۵۸۶]

میر سید اسماعیل بلگرامی

میر سید اسماعیل بلگرامی کا تذکرہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے کیا ہے اور ان کی فراوانی علم و فضل کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

سید، از فحول علما و جہاندۂ فضلا است، و بہ دو واسطہ شاگردِ امیر فتح اللہ شیرازی۔ در عقلیات برہانِ ساطع بود و در نقلیات حجتِ قاطع۔ جمِ غفیرِ دانش آموزان را کامل و مکمل ساخت۔ و بر حاشیۂ علامہ دوانی بر تہذیب المنطق حاشیہ مدوّن مستعدانہ نوشت، و با وصف علوِ مرتبۂ دانش بسیار کوچک دل بزرگ ہمت بود، و یدِ فیض رسانی طولے داشت، و علمِ موسیقی ہندی خوب می دانست و از مہرۂ دقائق ایں فن می زیست[۵۸۷]

یعنی سید اسماعیل بلگرامی کا شمار، فحول علما اور نامور فضلا میں ہوتا ہے۔ وہ دو واسطوں سے امیر فتح اللہ شیرازی کے شاگرد تھے۔ علومِ عقلیہ میں برہانِ ساطع اور علومِ نقلیہ میں حجتِ قاطع تھے۔ انھوں نے علما کی بہت بڑی جماعت کو علم و فضل میں کامل و مکمل کیا۔ علامہ جلال الدین دوانی کے حاشیۂ تہذیب المنطق پر عمدہ

---

۵۸۶ چندر بھان کے حالات کے لیے دیکھیے: عملِ صالح ـ ج ۳، ص ۳۳۶ تا ۳۳۸ و ص ۳۴۳، ۳۴۴

۵۸۷ مآثر الکرام، دفترِ اول، ص ۲۲۳

حاشیہ لکھا۔ علم میں مرتبۂ بلند پر فائز ہونے کے باوجود، بہت نرم دل اور باہمت بزرگ تھے۔ ان کا دستِ فیض رسانی بہت لمبا تھا۔ ہندی علمِ موسیقی پر خوب عبور رکھتے تھے اور اس کی فنی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

سید اسماعیل بلگرامی نے سب سے پہلے مولانا عبدالسلام دیلوی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے اکثر متداول کتبِ درسیہ کی تحصیل کی۔ اس کے بعد مزید تحصیل کے لیے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حصولِ علم کی اجازت چاہی۔ مولانا معذرت خواہ ہوئے اور فرمایا:

از ہجوم طلبا گنجائش وقت علیحدہ نیست، مگر آنکہ سماعت سبق فلاں شخص اختیار افتد[۵۸۸]

طلبائے علم کے ہجوم کی وجہ سے علیحدہ وقت کی تو گنجائش نہیں ہے۔ البتہ (ایک طالب علم کا نام لے کر فرمایا) فلاں شخص کے سبق میں شمولیت کر کے سماعت کر سکتے ہو۔

سید اسماعیل نے اسی کو مغتنم جانا اور خاموشی کے ساتھ سماعتِ درس کرنے لگے۔ دورانِ سبق کوئی بات نہ کرتے اور چپ چاپ بیٹھے سنتے رہے۔ اسی طرح ایک مدت گزر گئی۔ ایک روز خود ہی استاد نے پوچھا:

مدتہا گزشت۔ گاہے حرفے از شما سر بر نہ زد[۵۸۹]

عرصہ گزر گیا، تمھاری زبان سے ایک حرف بھی کبھی سننے میں نہیں آیا۔

سید نے عرض کیا، موجودہ صورت میں تو سماعت ہی کو کافی سمجھوں گا۔ البتہ:

اگر وقتے علیحدہ قسمت فقیر مقرر شود بقدرِ استعداد حرف تواں زد۔

اگر فقیر کو علیحدہ وقت عطا فرمایا جائے تو بقدرِ استطاعت کچھ عرض کروں۔

مولانا نے فرمایا، ان دنوں عصر اور مغرب کے درمیان فرصت ہے، تمھارے سبق کے لیے یہی وقت مقرر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ دوسرے روز مستقل درس اور بحث کا آغاز کیا گیا۔ سلسلۂ گفتگو شروع ہوا تو شام ہو گئی۔ نمازِ مغرب سے فارغ ہو کر پھر مصروفِ درس ہو گئے، تا آنکہ عشا کی نماز کا وقت آ گیا۔ جب مولانا نے دیکھا کہ "سر رشتۂ سخن" ختم ہونے کے آثار کہیں نظر نہیں آرہے ہیں تو فرمایا کل صبح صبح آجاؤ۔ دوسرے تمام اسباق موقوف کر کے پہلے ہم اسی مسئلۂ زیرِ

---

۵۸۸ مآثر الکرام۔ دفتر اول۔ ص ۲۲۳ ۵۸۹ ایضاً۔ ص ۲۲۴

بحث کی تحقیق کریں گے۔

دوسرے روز صبح کے وقت لائق شاگرد پھر مولانا کی خدمت میں پہنچا۔ دیگر تمام طلبائے مدرسہ بھی موجود تھے۔ چاشت سے دوپہر تک بحث ہوتی رہی اور متواتر تین روز تک سلسلۂ گفتگو جاری رہا۔ لیکن بحث کے سمٹنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو مولانا نے ہونہار تلمیذ سے فرمایا:

بارے حل ایں مقام بر شما ہم بہ نوعی ظاہر شد؟

مسئلۂ زیرِ بحث کا کوئی حل خود تم پر بھی ظاہر ہوا؟

لائق شاگرد نے عرض کیا:

یکے از محشیان دریں محل حاشیہ بہ قلم آوردہ، و حاشیہ کہ از تحریراتِ خودش بود برآوردہ۔

فلاں حاشیہ نویس نے اس بارے میں یہ لکھا ہے، اور ساتھ ہی اپنا تحریر کردہ حاشیہ بھی استادِ محترم کی خدمت میں پیش کر دیا۔

استاد نے شاگرد کا یہ حاشیہ دیکھا تو:

جواہر تحسین افشاند و فرمود مطلبِ حاشیہ بسیار دقیق و نازک واقع شدہ۔ اما عبارت خالی از اطناب نیست۔

بہت خوش ہوئے، تحسین کی اور فرمایا، حاشیے کا مطلب بہت دقیق اور پیچیدہ ہے۔ مگر اصل عبارت بھی اطناب سے خالی نہیں ہے۔

پھر شاگرد سے دریافت کیا۔

تحصیل شما از کجاست؟

تم نے کہاں تحصیلِ علم کی ہے؟

عرض کرد کہ از خدمتِ مولوی عبدالسّلام دیوہ۔!

عرض کیا، دیوہ کے مولوی عبدالسلام کی خدمت میں رہ کر۔!

مولانا عبدالسلام دیوی چونکہ مولانا سیالکوٹی کے معاصر تھے اور علوم و فنون کے بہت ماہر بھی تھے، اس لیے قدرتی طور پر سید اسماعیل کا یہ جواب سن کر مولانا کے دل میں شبہ گزرا کہ ممکن ہے، مولانا عبدالسّلام دیوی نے ان کے امتحان کی غرض سے اپنے اس شاگرد کو ان کے پاس بھیجا ہو۔ اور

اس خیال کا اظہار سید موصوف سے کر بھی دیا۔ لیکن سید صاحب نے حلفاً کہا:

این امر را اصلاً دخلی نیست، ومحض بارادۂ استفادہ در جناب عالی رسیدہ ام[۹۰]

اس معاملے میں قطعاً کسی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ میں تو محض استفادہ کی غرض سے جناب کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوا ہوں۔

میر غلام علی آزاد کا بیان ہے کہ میر سید اسماعیل بلگرامی نے بقیۂ تمام مروجہ کتبِ درسیہ مولانا سیالکوٹی ہی سے پڑھیں اور انھی کے حلقۂ تلمذ میں رہ کر سارے مدارجِ علمی طے کیے۔

سید اسماعیل، بلگرام کے رہنے والے تھے، عمر بھر مسندِ تدریس پر فائز رہے اور ہنگامۂ درس وافادہ میں زندگی بسر کر دی — "وروزگارے بہ تعلیم وتدریس گزرانید"[۹۱] کثیر التعداد علماء طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ ۴ شوال ۱۰۸۸ھ کو بروز شنبہ وفات پائی[۹۲]

مولانا عبداللہ لبیب

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے ایک شاگرد خود ان کے بیٹے مولانا عبداللہ لبیب تھے، جن کے زمانۂ طالب علمی میں ان کے استفادے کے لیے انھوں نے متعدد کتابوں پر حواشی تحریر کیے۔ یہ جلیل القدر عالم تھے۔ ان کا تذکرہ آیندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایے۔

اولاد

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے نامور فرزند مولانا عبداللہ تھے، جن کا لقب لبیب تھا۔ یہ اپنے جلیل القدر والد کی طرح بہت بڑے صاحبِ علم وفضل اور متدین ومتقی بزرگ تھے۔ اپنے اخلاق وفضائل اور اوصاف وکمالات کی وجہ سے لوگوں میں "امام وقت" مشہور تھے۔ اس ضمن میں لالہ سجان رائے بٹالوی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

از افزونی حسنِ اخلاق ورہنمائی خلائق این بزرگ را امامِ وقت گفتندے[۹۳]

---

۹۰ مآثر الکرام — دفتر اول — ص ۲۲۴

۹۱ ایضاً

۹۲ ایضاً — ص ۲۲۵

۹۳ خلاصۃ التواریخ — ص ۳۷

یعنی (مولانا عبداللہ لبیب) بے پناہ حسنِ اخلاق کے حامل ہونے کی وجہ سے اور لوگوں کو رشد و ہدایت کی تلقین کرنے کے باعث، عوام انھیں امامِ وقت گردانتے تھے۔

مولانا عبداللہ لبیب نے معقولات و منقولات کا علم اپنے والدِ مکرم سے حاصل کیا تھا اور حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحصیل شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند شیخ نور الحق دہلوی سے کی تھی[۹۴]

مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر مولانا عبداللہ لبیب کے علم و فضل کی فراوانی سے بہت متاثر تھا اور ان کی بہت تکریم کرتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۰۸۶ھ میں لاہور آیا تو مولانا ممدوح سے ملاقات کا متمنی ہوا، اور انتہائی اعزاز و اکرام سے انھیں سیالکوٹ سے لاہور بلایا گیا۔ بادشاہ نے ان سے مل کر بہت خوشی کا اظہار کیا اور وہ تمام اعزازات جو اُن کے والد مولانا عبدالحکیم کو حاصل تھے، ان کے لیے برقرار رکھے اور ان میں کچھ اضافہ بھی کیا۔ خلعتِ خاص، دو سو اشرفیاں اور ایک ہاتھی دے کر انھیں رخصت کیا۔

ایک روایت کے مطابق اورنگ زیب نے انھیں اجمیر بلایا اور اجمیر کی صدارتِ عظمیٰ پیش کرنا چاہی۔ مگر بقول بختاور خاں کے مولانا نے یہ کہہ کر بادشاہ کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ:

الحال سنینِ عمر بستین رسیدہ، وقتِ ترکِ نوکری است نہ اختیارِ نوکری۔

اب جبکہ عمر ساٹھ سال کو پہنچ گئی ہے، یہ ترکِ نوکری کا وقت ہے، نہ کہ نوکری اختیار کرنے کا۔

علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی فرماتے ہیں کہ بادشاہ نے ایک خط کے ذریعے مولانا عبداللہ لبیب کو یہ پیش کش کی تھی، اس کے جواب میں انھوں نے لکھا:

ان الزمان زمان الفراق

کہ اب دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آگیا ہے۔

مرآۃ العالم میں بختاور خاں کا بیان ہے کہ مولانا عبداللہ لبیب، گوشہ نشین عالمِ دین تھے اور اربابِ حکومت سے الگ تھلگ رہتے تھے۔

---

۹۴ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۵۲

بحفظ کلام مجید و قلتِ اختلاط بارباب دول و رغبتِ طبع بانزوا و گوشہ نشینی بر والدِ ماجد خود مزیت داشت۔

یعنی وہ قرآنِ مجید کے حفظ اور اصحابِ حکومت سے عدم رغبت و قلتِ اختلاط کے اوصاف سے متصف تھے اور اربابِ دولت سے ملنے کے بجائے علیحدگی و گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے تھے اور اس سلسلے میں اپنے والد (مولانا عبدالحکیم) پر فوقیت رکھتے تھے۔

اس عظیم المرتبت عالم نے اورنگ زیب عالم گیر کے چھبیسویں [۲۶] سالِ جلوس میں ۱۰۹۴ھ کو وفات پائی۔ ان کے حالات اس کتاب کے اصل مقام پر بیان کیے جائیں گے۔ ان شاء اللہ

۲- مولانا عبدالحکیم کشمیری

مولانا عبدالحکیم، مولانا عبدالکریم کشمیری کے بیٹے تھے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کے فاضل تھے۔ طریقت سے بھی تعلق رکھتے تھے اور اس سلسلے میں کشمیر کے نامور عالمِ دین شیخ معین الدین نقشبندی کشمیری کے فیض یافتہ تھے۔ "تذکرہ علمائے ہند" میں انھیں عہد عالم گیری کے عالم بتایا گیا ہے[۹۵]

۳- مولانا عبدالحی بلگرامی

مولانا عبدالحی بن ابوالفتح بن عبدالدائم عثمانی بلگرامی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں کے علما سے علم حاصل کیا۔ پھر اپنے والدِ گرامی شیخ ابوالفتح کی مسندِ علم پر متمکن ہوئے۔ فقہ، اصولِ فقہ اور علومِ عربیہ کے جید عالم تھے۔ انھوں نے خلاصۃ الفقہ کے نام سے ایک مختصر سی کتاب بھی تصنیف کی جس میں حدیث اور فقہ کی روشنی میں سفر سے متعلق مسائل بیان کیے گئے ہیں[۹۶]

۴- مفتی عبدالحی سنبھلی

مفتی عبدالحی سنبھلی، حنفی المسلک تھے اور اپنے علاقے اور عہد کے کبار علما میں سے تھے۔

---

۹۵ تاریخ کشمیر اعظمی۔ ص ۱۶۹ ــــ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۲۶۹ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۱۲

۹۶ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۱۲ بحوالہ شرف اشرفی

اپنے علم و فضل کی بنا پر سنبھل کے منصب افتا پر متمکن ہوئے اور عمر بھر اس پر فائز رہے۔ علومِ دینیہ سے متعلق بعض مفید کتابوں کے مصنف تھے۔[۹۷]

۵۔ شیخ عبدالخالق سہارن پوری

شیخ عبدالخالق بن عبدالستار بن عبدالکریم انصاری سہارن پوری، سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ قرآنِ مجید حفظ کیا اور شیخ رکن الدین بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے تجوید سیکھی۔ پھر باقی علوم کی تحصیل کی۔ ان کا شمار اپنے دور میں فقہ، قرأت اور تجوید کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ ۷ رجب ۱۰۲۰ھ کو وفات پائی۔[۹۸]

۶۔ مولانا عبدالدائم گوالیاری

مولانا عبدالدائم بن عبدالحی بن عبدالغنی عباسی گوالیاری کا شمار ان حضرات میں ہوتا تھا جو فقہ، اصولِ فقہ اور علومِ عربیہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ اصولِ فقہ کے بارے میں ایک کتاب بھی تصنیف کی، جس کا نام "اساس الاصول" ہے۔ یہ کتاب انھوں نے مغل حکمران شاہ جہان کے عہد میں تصنیف کی تھی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ رام پور (ہندوستان) کے مکتبہ حامدیہ میں موجود ہے۔[۹۹]

۷۔ مفتی عبدالرحمٰن کابلی

مفتی عبدالرحمٰن کابلی حنفی، شیخِ وقت اور عالمِ کبیر تھے۔ فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے ماہر تھے۔ شاہ جہان کے عہد میں، آگرہ میں فوج کے منصبِ قضا پر متعین تھے۔ پیکرِ صدق و صفا، صاحبِ ورع و تقویٰ اور متدین بزرگ تھے۔ فہم و فراست کے زیور سے آراستہ تھے۔ حضرت

---

[۹۷] کمال محمد سنبھلی کی "اسراریہ" دیکھیے۔ اس میں ان کی تصنیفات کا ذکر ہے۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۱۳

[۹۸] نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۱۳ بحوالہ مرآۃ جہاں نما

[۹۹] نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۱۳

بدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔ حضرت مجدد آگرہ تشریف لے جاتے تو ان کے ہاں ضرور آمدورفت رکھتے[۲۳۰]

۸۔ شیخ عبدالرحمن سنبھلی

شیخ عبدالرحمن نقشبندی سنبھلی شیخ صالح اور فقیہ عصر تھے۔ شیخ تاج الدین سے اخذ طریقت کیا اور طویل عرصہ تک ان کی صحبت میں رہے۔ خواجہ باقی باللہ سے بھی کسب فیض کیا۔ علم و معرفت میں یگانۂ روزگار تھے۔ اپنے شیخ کے حکم سے سنبھل کی مسندِ مشیخت پر فائز ہوئے اور خلقِ کثیر کو فیض پہنچایا۔ تقویٰ و عزیمت میں ہمیشہ اپنے شیوخ کے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔ ۷ شوال ۱۰۶۷ھ کو سنبھل میں وفات پائی[۲۳۱]

۹۔ قاضی عبدالرحیم مرادآبادی

قاضی عبدالرحیم بن عبدالرشید بہاری مرادآبادی، بہت بڑے فاضل، اپنے دور کے شیخ اور مشہور عالم تھے۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے کسبِ علم کیا اور نو سال سے زائد عرصہ ان کی خدمت میں رہے۔ پھر مرادآباد کے منصبِ قضا پر مامور کیے گئے اور ساتھ ہی طویل مدت تک وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ سعداللہ بلگرامی اور بہت سے اہل علم شامل ہیں[۲۳۲]

۱۰۔ مفتی عبدالرحیم سندھی

مفتی عبدالرحیم بن عثمان بن یوسف بن صالح بدینی سندھی شاہ جہان کے عہد میں ٹھٹھہ کے مفتی تھے۔ اپنے زمانے کے شیخ، عالم اور فقیہ تھے[۲۳۳]

---

[۲۳۰] زبدۃ المقامات - ص ۳۵۴، ۳۵۵ —— نزہۃ الخواطر - ج ۵، ص ۲۱۴

[۲۳۱] اسراریہ - ص —— نزہۃ الخواطر - ج ۵، ص ۲۱۵، ۲۱۶

[۲۳۲] نزہۃ الخواطر - ج ۵، ص ۲۱۸

[۲۳۳] تحفۃ الکرام - ص ۶۸۵ —— نزہۃ الخواطر - ج ۵، ص ۲۱۸

۱۱- مولانا عبدالرزاق بانڈی کشمیری

مولانا عبدالرزاق بانڈی کشمیری، دیارِ کشمیر کے بڑے عالم و فاضل اور ذکی و فطین بزرگ تھے۔ ملّا فاضل کے خواہر زادہ تھے، جنھوں نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے بعض حواشی پر تنقید کی ہے۔ مولانا عبدالرزاق کشمیری معقولات میں بے حد تیز تھے اور اس کے تمام گوشوں پر پوری نظر رکھتے تھے۔ شرح تجرید کا حاشیہ سپردِ قلم کیا، جس کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ میری اس تالیف کو سمجھنا تو کجا بڑے بڑے عالم اس کو پڑھ بھی نہیں سکتے۔ شاہ جہان بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا اور کابل کے مدرسے میں منصبِ تدریس پر متعین کر دیا۔ اس اثنا میں کئی راتیں کتاب محاکمات کا رد لکھتے رہے، جس سے ذہن و دماغ پر اتنا شدید بوجھ پڑا کہ خللِ دماغ کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ یہ کیفیت یہاں تک بڑھی کہ حلق پر چھری مارلی، شاگردوں کو پتا چلا تو دوڑ کر آئے اور کپڑا باندھ کر زخم بند کیا۔ پھر اس کا علاج کرایا اور اللہ نے شفا عطا کی۔ بعد ازاں مدرسۂ کابل کی تدریس سے مستعفی ہو کر واپس کشمیر آگئے تھے۔ کشمیر ہی میں وفات پائی ؁۱۰۷۴ھ

۱۲- مولانا عبدالرشید کشمیری

ارضِ کشمیر کے یہ عالمِ دین، مولانا عبدالرشید کشمیری زرگر کے عُرف سے معروف تھے۔ عالمِ کبیر، علّامۂ عصر، شیخِ وقت اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اس زمانے کا کشمیر علم و فضل کا مرکز تھا اور متعدد مقامات پر علمائے کشمیر کی تدریس کی مسندیں بچھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ مولانا عبدالرشید ان کی خدمت میں گئے اور شیخ محمد بن افضل بن حیدر چرخی، مُلّا سلطان مانتجو، قاضی عبدالرحیم اور دیگر اساتذۂ کشمیر سے تحصیل کی۔ طبیعت میں تصوّف و طریقت کا شوق پیدا ہوا تو اس دور کے ایک کشمیری صاحبِ طریقت

۱۰۷۴ھ تاریخ کشمیر اعظمی۔ ص ۱۴۲ —— تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۲۶۹ —— حدائق الحنفیہ۔ ص ۴۲۸۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۱۸، ۲۱۹

بزرگ شیخ محمد علی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفاضہ کیا۔ بعد ازاں خود درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا اور علما کی بہت بڑی جماعت ان کے علم و فضل سے مستفید ہوئی۔ عمر کے آخری دور میں سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں برہان پور کی فوجی چھاونی میں قاضی عساکر مقرر ہو گئے تھے۔ نہایت شیریں کلام تھے۔ مدلل اور پُر زور تقریر کرتے تھے۔ اس کشمیری نژاد عالمِ دین نے برہان پور شہر میں وفات پائی [۱۰۵]

۱۳۔ قاضی عبدالرشید دہلوی

گیارھویں صدی ہجری میں دہلی علمی لحاظ سے بڑا بارونق شہر تھا۔ اس میں علما کی کثیر تعداد جمع تھی، جن میں قاضی عبدالرشید دہلوی بھی شامل ہیں۔ یہ اپنے دور اور علاقے کے شیخ، فقیہ اور صوفی بزرگ تھے۔ شیخ عبدالعزیز بن حسن چشتی دہلوی کے احفاد میں سے تھے۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی سے اخذِ طریقت اور کسبِ علم کیا تھا۔ الہ آباد میں تین سال ان کی خدمت میں رہے۔ پھر سنبھل کے منصبِ قضا پر مامور کیے گئے۔ قضا کی نازک اور اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ سنبھل میں درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری تھا۔ متعدد اہلِ علم نے ان سے استفادہ کیا۔ فقط صاحب قال ہی نہ تھے، صاحب وجد و حال بھی تھے۔ جب درسِ حدیث کے دوران حال کی کیفیت غالب آجاتی تو بے ساختہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور پھر روتے روتے گھگھی بندھ جاتی [۱۰۶]

۱۴۔ شیخ عبدالستار برہان پوری

سرزمینِ برہان پور نے جن علما و فضلا کو جنم دیا، ان میں شیخ عبدالستار بن عیسیٰ بن قاسم بن یوسف بھی ہیں، جنھیں عبدالستار سندھی بھی کہا جاتا ہے۔ عالم و فقیہ اور شیخ و زاہد تھے۔ فضل و کمال میں شہرت رکھتے تھے۔ برہان پور میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد شیخ عیسیٰ

---

[۱۰۵] تاریخ کشمیر اعظمی۔ ص ۱۷۷ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۰، ۲۲۱ — تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۲۶۹

[۱۰۶] الامراریہ۔ ص — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۱

سے تعلیم کا آغاز کیا۔ مروجہ کتبِ درسیہ کی تحصیل ان ہی سے کی۔ ریاضی کی بعض کتابیں علا
شکر اللہ شیرازی سے پڑھیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب علامہ ممدوح فارس سے آئے
تھے اور برہان پور میں مقیم تھے۔ برہان پور میں کئی سال تک علامہ شکر اللہ شیرازی نے افاضہ وافادہ
کی محفل گرم کیے رکھی تھی۔ شیخ عبدالستار زہد و قناعت اور عفت و توکل میں بہت مشہور تھے۔
متواضع اور کثیر الفوائد عالمِ دین تھے۔ طریقہ شطاریہ کے مطابق اپنے والد مرحوم سے اخذِ طریقت
بھی کیا اور اس سلسلے میں طویل عرصہ ان کی صحبت میں گزارا۔ والد کی وفات کے بعد مسندِ ارشاد
پر متمکن ہوئے۔[۱]

۱۵۔ مفتی عبدالسلام دیوی

مفتی عبدالسلام دیوی، موضع دیوہ کے رہنے والے تھے، جو ہندوستان کے صوبہ یوپی میں اعمالِ لکھنؤ
میں واقع ہے۔ ان کا نسب نامہ یہ ہے: عبدالسلام بن ابو سعید بن حب اللہ بن احمد بن
عبدالرحیم بن احمد فیاض بن محمد اعظم حسینی کرمانی دیوی — مفتی عبدالسلام دیوی، معقول اور
منقول کے جامع تھے۔ نہایت ذکی اور ذہین عالمِ دین تھے۔ دیوہ کے مقام پر پیدا ہوئے جو
اس دور میں لکھنؤ کے نواح میں معروف قریہ تھا۔ اب تک اس کو علم و تصوف کے مرکز کی حیثیت
حاصل ہے۔ اپنے قصبے اور علاقے کے نامور علما سے علم حاصل کیا۔ پھر عازم لاہور ہوئے، اس زمانے
میں لاہور میں مفتی عبدالسلام لاہوری کی مسندِ تدریس آراستہ تھی، ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے
اور حصولِ علم کیا۔ یہاں تک کہ فقہ، اصولِ فقہ اور کلام میں اپنے اقران و معاصرین سے فوقیت لے
گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد طویل عرصے تک لاہور ہی میں مسندِ تدریس پر فائز رہے۔ پھر
شاہ جہان بادشاہ کی فوج میں منصبِ افتا پر متمکن ہوئے۔ ایک مدت تک اس منصب پر مامور
رہے۔ بعد ازاں کبر سنی کی بنا پر اس منصب سے معزول ہو گئے اور لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔
لاہور میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، جس سے بہت سے لوگ مستفید ہوئے۔
مفتی عبدالسلام دیوی، صاحبِ تصنیف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات و حواشی سے پتا چلتا

---

[۱] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار۔ ص ۵۶۰، ۵۶۱ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۲

ہے کہ وہ تفسیر، فقہ، منطق اور علمِ کلام میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں یہ کتابیں شامل ہیں:

حاشیہ علیٰ حاشیہ خیالی، شرح منار الاصول، حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیہ شرح الصحائف، حاشیہ علیٰ ہدایۃ الفقہ، شرح تہذیب المنطق اور حاشیہ علی التحقیق۔

مولانا عبدالسلام دیوی کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی "اکسیر" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انھوں نے ۱۰۳۹ھ کو وفات پائی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ "بادشاہ نامہ" سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۱۰۴۷ھ کو زندہ تھے[۱۰۸]

عملِ صالح کے مصنف صالح محمد کنبو نے بھی شاہ جہان کے دسویں سالِ جلوس مین ان کا ذکر کیا ہے۔ اس سالِ جلوس کا سن ۱۰۴۶ھ ہے۔ ۱۰۴۶ھ کو شدید قحط پڑا تھا، جس میں لوگ شدید تکلیف میں مبتلا ہوئے اور اشیائے صرف کی قیمتیں بہت بڑھ گئیں۔ شاہ جہان نے علمائے کرام، بزرگانِ دین اور اصحابِ فضل و کمال سے دعا کی درخواست کی۔ چنانچہ نمازِ استقسا پڑھی گئی جس کے نتیجے میں بڑی بارش ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے قحط کی مصیبت دور فرمائی۔ جن حضرات سے بادشاہ نے دعا اور نمازِ استقسا کی درخواست کی تھی، ان میں سید جلال، قاضی محمد اسلم، مفتی عبدالسلام، شیخ مجیب علی سرہندی، مظہر بدائع اور شیخ ناظر شامل تھے[۱۰۹] یعنی ۱۰۴۶ھ میں مفتی عبدالسلام دیوی زندہ تھے۔

بہر حال مفتی موصوف گیارھویں صدی ہجری کے ہندی علما میں اپنے علم و فضل اور نیکی و صالحیت کے اعتبار سے اونچے مرتبے کے حامل تھے[۱۱۰]

۱۶۔ مفتی عبدالسلام لاہوری

گیارھویں صدی ہجری میں لاہور کو اہلِ علم اور اصحابِ فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔

---

۱۰۸ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۳ ۱۰۹ عملِ صالح۔ ج ۲، ص ۲۰۹

۱۱۰ ملاحظہ ہو عملِ صالح۔ ج ۳، ص ۳۰۰۔۔۔ بادشاہ نامہ۔ ج ۱، ص ۳۴۲، ۳۴۳۔۔۔ مآثر الکرام۔ ج ۱، ص ۲۲۵، ۲۲۶۔۔۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۲، ۲۲۳۔۔۔ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۲۶۹

یہ عہد برصغیر میں تین عظیم مغل حکمرانوں — جلال الدین اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہان کا عہد تھا — اس عہد میں لاہور میں جن علما و فضلا کی علمی سرگرمیوں اور تدریسی کوششوں کا سلسلہ زوروں پر تھا، ان میں مفتی عبدالسلام لاہوری کا نام نامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے — مفتی عبدالسلام لاہوری کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے؟ کب پیدا ہوئے؟ ان کے والد کا کیا نام تھا؟ تذکرہ نگار ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ اپنے دور کے علامہ اور بہت بڑے فاضل تھے۔ کثرتِ درس و افادہ میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ صلاح و تقویٰ کے زیور سے آراستہ اور بلند مرتبے کے حامل تھے۔

تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق مفتی عبدالسلام نے نوّے سال عمر پائی، کم و بیش ساٹھ سال تک لاہور میں ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا اور ۱۰۳۷ھ کو فوت ہوئے۔ اس حساب سے ان کا سال ولادت ۹۴۷ھ بنتا ہے۔ اس عرصے میں انھوں نے ہندوستان کے تقریباً آٹھ بادشاہوں کا زمانہ پایا — یعنی (۱) ظہیر الدین بابر (۲) نصیر الدین ہمایوں (۳) شیر شاہ سوری (۴) سلیم شاہ سوری (۵) عادل شاہ سوری (۶) جلال الدین اکبر (۷) نور الدین جہاں گیر اور (۸) شاہ جہان کا — آخری تین بادشاہوں کا زمانہ تو اُن کی بھرپور تدریسی ہنگامہ آرائیوں کا زمانہ تھا۔

اساتذہ

مفتی عبدالسلام لاہوری نے اپنے دور کے مشاہیر اساتذہ اور نامور فضلا سے استفادہ کیا، ان بزرگوں کا تعارف ذیل کی سطور میں کرایا جاتا ہے:

۱۔ میر فتح اللہ شیرازی: یہ وہ بزرگ ہیں، جنھیں بیجاپور کے حکمران عادل شاہ نے بڑی کوشش سے شیراز سے دکن بلایا اور اپنے دربار سے منسلک کیا تھا۔ اس کے قتل کے بعد وہ جلال الدین اکبر کی دعوت پر فتح پور سیکری آگئے تھے اور دربارِ اکبری سے انسلاک اختیار کر لیا تھا۔ معقولات میں یہ اپنے عہد کے منفرد اہلِ علم تھے۔ منقولات میں بھی دست رس رکھتے تھے۔ حکمت و فلسفہ، منطق و ہیئت، ہندسہ و ریاضی، نجوم و رمل، حساب و طلسمات نیز نجات اور جرِ اثقال کے ماہر تھے۔ علاوہ ازیں عربی ادب، تفسیر اور حدیث میں نظر تھی۔ یہ وہی ماہر معقولات ہیں، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر تمام علوم عقلیہ، یعنی منطق و فلسفہ اور حکمت وغیرہ پر مشتمل

کتابیں اس دنیا سے ناپید ہو جائیں تو وہ اپنے حافظے کے زور سے ازسرِ نو ان علوم کو زندہ کر سکتے تھے۔ میر فتح اللہ شیرازی نے علامہ جلال الدین محقق دوانی، میر صدر الدین شیرازی، میر غیاث الدین منصور، میرزا جان میر اور دیگر علمائے متاخرین کی تصنیفات کو علمائے ہند سے متعارف کرایا اور اس ملک کی درس گاہوں کے نصاب میں داخل کرایا[۱]۔ اکبر ان کی انتہائی تکریم کرتا تھا۔ اس نے ان کو ۹۹۳ھ میں قیام لاہور کے زمانے میں امین الملک کا خطاب عطا کیا تھا۔ مالی معاملات اور پیمائشِ زمین کے سلسلے میں وہ بے شمار معلومات رکھتے تھے۔ راجہ ٹوڈرمل بھی اس کا ماہر تھا۔ اکبر نے ٹوڈرمل کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ اس ضمن میں جو قدم اٹھانا چاہے، میر فتح اللہ شیرازی کے حکم سے اٹھائے۔ میر فتح اللہ شیرازی نے ۹۹۷ھ کو کشمیر سے اکبر کی واپسی کے زمانے میں ماندوجان کے مقام پر وفات پائی اور کوہِ سلیمان میں مدفون ہوئے۔

۲۔ شیخ سعد اللہ لاہوری: یہ عہدِ اکبری کے مستند اور نامور علما میں سے تھے۔ ایک عرصہ تک لاہور میں مسندِ تدریس پر متمکن رہے۔ انھیں تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔

۳۔ قاضی صدر الدین جالندھری لاہوری: یہ مخدوم الملک عبد اللہ سلطان پوری کے شاگرد تھے۔ متبحر اور فاضل بزرگ تھے۔ عہدِ اکبری میں لاہور کے منصبِ قضا پر بھی متعین رہے۔ بعد میں صوبہ گجرات کے علاقہ بھڑوچ کے قاضی مقرر ہوئے۔ انھوں نے ۹۹۰ھ کو وفات پائی۔

۴۔ شیخ اسحاق بن کاکو: یہ بھی مفتی عبد السلام لاہوری کے اساتذہ میں سے تھے۔ جامع جمیع علوم، متبحر، متوکل علی اللہ، متورع اور صوفی بزرگ تھے۔ ہمیشہ مشغولِ عبادت رہتے تھے[۲]۔

مسندِ تدریس اور تلامذہ

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مفتی عبد السلام لاہوری نے لاہور میں مسندِ تدریس آراستہ کی اور درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ اپنے عہد میں وہ بے نظیر مدرس اور عدیم المثال عالم تھے۔ انھوں نے تقریباً ساٹھ[۳] سال تک علوم و فنون کی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور بہت سے تشنگانِ علوم نے ان سے اپنی علمی تشنگی بجھانے کا سامان فراہم کیا۔ کچھ عرصہ افواج شاہی میں

---

[۱] مآثر الکرام دفتر اول، ص ۲۲۸، ۲۲۹ [۲] منتخب التواریخ۔ ج ۳، ص ۵۱

مفتی کے فرائض بھی انجام دیے۔ ان کے علم و فضل کا شہرہ دُور دُور تک پہنچ گیا تھا۔ برصغیر پاک و ہند سے باہر بھی اہلِ علم میں ان کی علمی شہرت پہنچ چکی تھی اور وہ ان سے بہت متاثر تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ مشہور ماہر معقولات قاضی محمد اسلم ہروی کے بھتیجے میرک شاہ خراسان سے ہندوستان آئے تو لاہور میں مفتی عبدالسلام کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے، کتب متداولہ کا اعادہ کیا، مفتی ممدوح کے فیوضِ علمی سے بہرہ اندوز ہوئے اور سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد سلطنتِ مغلیہ کے اہم مناصب پر فائز ہوئے، بالآخر منازلِ ترقی طے کرتے ہوئے عہدِ اورنگ زیب میں صدرِ کل یا صدر الصدور کے منصب بلند پر پہنچے۔ شیخ میرک ہروی نے ۱۰۷۱ھ کو وفات پائی۔

شیخ محب اللہ بہاری بھی مفتی عبدالسلام لاہوری کے فیض یافتگان میں سے تھے۔ شیخ محب اللہ بہاری برصغیر کے اصحابِ تصوف میں منفرد حیثیت کے حامل تھے اور اس ضمن میں بعض ممتاز افکار کے مالک۔ انھوں نے ۱۰۵۸ھ کو سفر آخرت اختیار کیا۔

شاہ جہان کے وزیر اور معروف عالم علامی سعد اللہ تمیمی چنیوٹی بھی ان کے تلمیذ تھے۔

قاضی عبدالسلام دیوی بھی مفتی عبدالسلام کے شاگرد تھے۔ یہ مضافاتِ لکھنؤ کے ایک مقام دیوہ سے حصولِ علم کے لیے لاہور آئے تھے۔ جلیل القدر عالم دین تھے۔ معقولات و منقولات میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ طویل عرصہ تک مفتی ممدوح کے حلقۂ درس میں شریک رہے اور ان سے مستفید ہوئے۔ شاہ جہانی دور میں افواج شاہی کے مفتی بھی مقرر ہوئے۔ لیکن استاد کی طرح بالآخر لاہور میں درس و تدریس کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا اور تاحینِ حیات یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔

شیخ محمد میر عمری سیوستانی بھی مفتی عبدالسلام کے تلامذہ میں سے تھے۔ وہ ۹۵۷ھ کو سیوستان میں پیدا ہوئے اور اپنے مرشد شیخ خضر سیوستانی کے حکم سے لاہور آئے اور مفتی عبدالسلام کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ جس زمانے میں شیخ محب اللہ بہاری لاہور آکر مفتی عبدالسلام کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے، اس زمانے میں علامی سعد اللہ چنیوٹی اور شیخ محمد میر عمری بھی مفتی ممدوح سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ لاہور کے مشہور بزرگ ہیں جو میاں میر کے نام سے معروف ہیں۔ ۱۰۴۵ھ کو لاہور میں فوت ہوئے۔

مفتی ممدوح کے ایک لڑکے بھی تھے جن کا نام شیخ محمد مراد تھا، یہ بھی صاحبِ فضل اور ذی علم بزرگ تھے۔ وہ عالم شاہ کے عہد تک زندہ تھے۔ جب شاہ عالم بادشاہ نے خطبہ جمعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ "وصی" کے لفظ کا اضافہ کرنے کا حکم دیا تو شیخ محمد مراد ان علما میں سے تھے، جنھوں نے اس حکم پر عمل کرنے سے صاف الفاظ میں انکار کر دیا تھا اور بادشاہ سے کہا تھا کہ اس کا یہ فرمان غلط اور ناقابلِ تسلیم ہے۔ اس کی پاداش میں بادشاہ نے ان کو قید کر دیا تھا۔

حاشیہ بیضاوی

مفتی موصوف عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے، تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہیں کی۔ آخر عمر میں بیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا۔ بختاور خاں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

در آخر عمر کہ پسر خود را بیضاوی درس می گفت و حاشیہ بر بیضاوی نوشت می فرمود، سخنانِ بسیار بر کتبِ متداولہ داشتم و بر اہلِ فضل عرض کردہ بودم، و در معرضِ قبول افتادہ بود، لیکن از کثرتِ درس فرصت نیافتم کہ در قیدِ تحریر در آورم ۱۱۳

عمر کے آخری دَور میں جب اپنے بیٹے کو بیضاوی پڑھاتے تھے اور بیضاوی پر حاشیہ تحریر فرما رہے تھے، فرمایا کرتے کہ میں نے کتبِ متداولہ پر بہت سی باتیں اپنی یادگار چھوڑی اور اہل علم کے سامنے پیش کی ہیں اور انھیں بارگاہِ اصحابِ فضل میں شرفِ قبولیت عطا ہوا ہے، مگر کثرتِ درس کے ہنگاموں سے فرصت نہ ملنے کی وجہ سے میں انھیں ضبطِ تحریر میں نہیں لا سکا۔

لیکن عمر کے آخری دَور میں جب حواس مختل ہو گئے اور قوتِ حافظہ ختم ہو گئی تو اس پر اظہارِ افسوس کرتے تھے کہ کیوں اپنے افکارِ علمی کو معرضِ کتابت میں نہ لائے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی اُن کا یہ تاثر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

الحال کہ ضعفِ قویٰ مستولی گشت و قوتِ حافظہ رو بہ انحطاط آورد، ہمہ از خاطر بر آمد۔ بر فقدانِ ایں صورِ ذہنی تاسف می نمود ۱۱۴

اب کہ قوائے جسمانی پر کمزوری غالب آگئی ہے اور قوتِ حافظہ انحطاط پذیر ہو گئی ہے، تمام چیزیں ذہن

---

۱۱۳ مرآۃ العالم - ص ۵۳۵ ۱۱۴ مآثر الکرام دفتر اول، ص ۲۲۶

سے نکل گئی ہیں۔ اس ذخیرۂ علم کے ذہن سے نکل جانے پر سخت افسوس ہوتا ہے۔

مفتی عبدالسلام چوں کہ ہمہ وقت درس وافادہ میں مصروف رہتے تھے، اس لیے تصنیف و تالیف کی طرف عنان توجہ مبذول نہ کرسکے۔ ان کی تصانیف میں ایک تفسیر بیضاوی کے حاشیہ کا پتا چلتا ہے جو انھوں نے آخر عمر میں اپنے بیٹے محمد مراد کی تعلیم کے زمانے میں لکھا تھا۔

کیا نافع المسلمین انہی کی تصنیف ہے؟

اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی میں فارسی زبان میں مسائل فقہ پر مشتمل ایک کتاب موجود ہے، جس کا نام "نافع المسلمین" ہے۔ اس کے دیباچے میں مصنفِ کتاب نے اپنا نام عبدالسلام بن عبدالعزیز لاہوری لکھا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع میں بڑی عمدہ ہے، اس میں مختلف فقہی مسائل کے اس انداز میں جواب دیے ہیں جس انداز میں ایک مفتی دیتا ہے۔ عربی میں بھی کثرت سے بعض باتیں بیان کی گئی ہیں۔ غیر فقہی مسائل و معارف کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ اس میں مندرج ہے۔ اس کتاب کا ایک مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں بھی موجود ہے[۱۱۵]۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے مرتبِ فہرست نے اس امکان کا اظہار کیا ہے کہ "نافع المسلمین" انہی مفتی عبدالسلام لاہوری کی تصنیف ہے، اور عبدالسلام بن عبدالعزیز لاہوری سے یہی مراد ہیں۔ قیاس یہی چاہتا ہے کہ یہ انہی کی تصنیف ہوگی۔

تذکرہ نویسوں نے مفتی عبدالسلام لاہوری کی بے حد تعریف کی ہے اور اُن کے علم و فضل کو بہت خراج تحسین ادا کیا ہے۔ نظام الدین ہروی ان کا ذکر "فحول علمائے لاہور" کے الفاظ سے کرتا ہے[۱۱۶]

شاہ نواز نے انھیں مستند فاضل اور بلند مرتبہ فقیہ قرار دیا ہے[۱۱۷]۔ بختاور خاں، ان کو "از فضلائے متبحرین بود" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے[۱۱۸]۔ عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے:

حاوی معقول و منقول مُلّا عبدالسلام لاہوری مفتی کہ فنونِ ادبیہ و فقہ و اصولِ فقہ را

---

۱۱۵ فہرست مخطوطات شیرانی۔ ج ۳، ص ۳۰۶ ۱۱۶ طبقاتِ اکبری۔ ج ۲، ص ۴۶۹

۱۱۷ مآثر الامرا۔ ج ۳، ص ۵۱۸ ۱۱۸ مرآۃ العالم۔ ص ۵۳۵

نیکو دانستی[۱۱۹]

علومِ معقول و منقول میں ہادی و مرجع مفتی عبدالسلام لاہوری جو فنونِ ادبیہ، فقہ اور اصولِ فقہ میں خوب مہارت رکھتے تھے۔

صالح محمد کنبو ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

جامع المعقول والمنقول ملّا عبدالسلام لاہوری کہ در فنونِ تفسیر و فقہ ثانی و نظیر نداشت[۱۲۰]

معقول و منقول کے جامع ملّا عبدالسلام لاہوری جن کا علومِ تفسیر و فقہ میں کوئی ثانی اور نظیر نہ تھا۔

علّامہ عبدالحی حسنی لکھنوی رقم طراز ہیں:

الشیخ الفاضل العلامۃ المفتی عبدالسلام الحنفی اللاھوری احد کبار العلماء، لم یکن لہ نظیر فی عصرہ فی کثرۃ الدرس والافادۃ۔[۱۲۱]

شیخ، فاضل، علّامہ، مفتی عبدالسلام حنفی لاہوری، کبار علما میں سے تھے، اپنے عصر میں کثرتِ درس و افادہ میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔

مولوی رحمان علی لکھتے ہیں:

ملا عبدالسّلام لاہوری، شاگردِ میر فتح اللہ شیرازی فقیہ و مفسّر بود[۱۲۲]

ملّا عبدالسلام لاہوری، جو میر فتح اللہ شیرازی کے شاگرد تھے، اپنے عہد کے مفسّر اور فقیہ تھے۔

مولوی فقیر محمد جہلمی ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

ملّا عبدالسلام لاہوری، عالمِ اجل، فاضلِ اکمل، فقیہ جیّد، مفسّر متقن بود[۱۲۳]

ملّا عبدالسلام لاہوری، عالمِ اجل، فاضلِ اکمل، فقیہ جیّد، مفسّر متقن تھے۔

لاہور کے اس جلیل القدر عالمِ دین اور مفسّر و فقیہ نے کم و بیش ساٹھ[۶۰] سال تک لاہور میں غلغلۂ تدریس بلند کیے رکھا اور اس طویل عہد میں بے شمار ہندی و غیر ہندی علما نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کی وفات ۱۰۳۷ھ کو ہوئی، اور نوّے[۹۰] برس عمر پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

---

۱۱۹ بادشاہ نامہ۔ ج ۱، ص ۳۴۲

۱۲۰ شاہ جہان نامہ۔ ج ۳، ص ۳۸۳

۱۲۱ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۳

۱۲۲ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۲۰

۱۲۳ حدائق الحنفیہ۔ ص ۴۰۶

۱۷۔ قاضی عبدالسلام برہان پوری

قاضی عبدالسلام سندھی برہان پوری، ارضِ سندھ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ بعض کتبِ درسیہ شیخ عباس بن جلال سندھی سے پڑھیں، باقی درسی کتابوں کی تکمیل حکیم عثمان بن عیسیٰ بویکانی برہان پوری سے کی۔ شیخ وقت اور فاضلِ کبیر تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ برہان پور کے حکمران عادل شاہ نے ان کے فضل و کمال سے متاثر ہوکر انھیں برہان پور شہر کے منصبِ قضا پر مامور کر دیا تھا۔ عہدۂ قضا کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ علمِ فقہ پر عبور کا یہ عالم تھا کہ مختصر الوقایہ کی شرح سپردِ قلم کی، جو روایاتِ فقہی کی جزئیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے[۱۲۴]۔

۱۸۔ شیخ عبدالشکور جون پوری

شیخ عبدالشکور جون پوری، عالمِ صالح اور اپنے دور کے جلیل القدر بزرگ تھے۔ شیخ مبارک بن خیر الدین جون پوری کی اولاد سے تھے۔ شیخ نور اللہ جون پوری کے بعض تلامذہ سے علم حاصل کیا، پھر شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے کسبِ طریقت کیا۔ شیخ عبدالشکور جون پوری ہمیشہ مسندِ درس و افادہ پر متمکن رہے۔ بہت سے علما نے ان سے استفادہ کیا۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ مختصر الوقایہ کی شرح سپردِ قلم کی، جس میں مسئلہ عشر بالعشر (دہ در دہ) بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ گیارھویں صدی ہجری کے اس عالمِ دین نے ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۰۷۲ھ کو وفات پائی[۱۲۵]۔

۱۹۔ شیخ عبدالشکور منیری

شیخ عبدالشکور منیری بہاری، علاقہ بہار کے شہر منیر میں پیدا ہوئے اور عرصے تک اپنے

---

[۱۲۴] اذکارِ ابرار ترجمہ گلزارِ ابرار۔ ص ۳۰۶ و ۴۴۵ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۵

[۱۲۵] تاریخ شیراز ہند جون پور۔ ص ۷۱۸ — تجلی نور۔ ج ۲، ص ۵۴ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۶

شہر کے اہلِ علم سے علم حاصل کرتے رہے۔ پھر عازمِ جون پور ہوئے جو اس زمانے میں دیارِ ہند میں علم و فضل کا عظیم مرکز تھا، وہاں شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری اور دیگر علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور کتبِ متداولہ کی تحصیل کی۔ پھر شیخ محمد رشید عثمانی سے اخذِ طریقت کیا اور طویل عرصہ تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے، یہاں تک کہ دعوت و ارشاد کے مرتبۂ بلند پر فائز ہوئے۔ شیخ ممدوح نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور انھیں سندِ خلافت باقاعدہ لکھ کر عطا کی۔ بعد ازاں اپنے شہر مَنیر چلے گئے اور درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔

شیخ عبدالشکور مَنیری بہاری، عالم و فقیہ، زاہد و قانع اور متوکل علی اللہ بزرگ تھے۔ کبھی اصحابِ دولت کے دروازے پر دستک نہیں دی اور دنیا اور اربابِ دنیا کی طرف کبھی دھیان نہیں کیا۔ برصغیر کے اس نامور عالم و فقیہ نے شروع جمادی الاخریٰ ۱۰۹۵ھ کو مَنیر میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے [۱۲۶]۔

۲۰۔ قاضی عبدالشکور لاہوری

قاضی عبدالشکور لاہوری، فقہ و اصول اور علومِ عربیہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے عہد کے علما میں سے تھے۔ نیک، عبادت گزار اور متقی عالمِ دین تھے۔ علما و صوفیا کی بڑی تکریم کرتے اور ان سے عقیدت سے پیش آتے تھے، زیادہ وقت تلاوتِ قرآن، نوافل و عبادت اور اوراد و وظائف میں صرف کرتے۔ متین اور حلیم الطبع تھے۔ مستحقین اور یتامیٰ و مساکین کا بہت خیال رکھتے اور جو آمدنی ہوتی، ان پر خرچ کر دیتے۔ معاملہ فہم اور خوش اخلاق تھے۔ اکبر بادشاہ کی طرف سے علما پر ابتلا و آزمائش کا وقت آیا اور ان پر سختیاں ہونے لگیں تو بادشاہ نے بہت سے علما کو جو ملازمتِ شاہی میں داخل تھے، دور دراز مقامات میں منتقل کر دیا تھا، تاکہ ان کے اثر و رسوخ کے دائرے یا تو بالکل ختم ہو جائیں یا بہت ہی کم رہ جائیں، ان علما میں قاضی عبدالشکور کا نام بھی شامل ہے۔ بادشاہ نے ان کو جون پور کا قاضی

---

[۱۲۶] نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۶: بحوالہ گنج ارشدی

مقرر کرکے بھیج دیا تھا۔ طویل عرصہ تک یہ اس عہدہ پر فائز رہے۔ پھر جب بادشاہ الہ آباد کے دورے پر گیا تو قاضی عبدالشکور بادشاہ کی خدمت میں آئے، اس نے ان کو اس عہدۂ قضا سے معزول کرکے ان کی جگہ قاضی زادہ رومی کو مقرر کر دیا، جو ایک بلند مرتبہ عالم دین تھے۔ اس منصب سے علیحدگی کے بعد قاضی عبدالشکور لاہوری نے ہر طرف سے منقطع ہو کر درس و افادہ کو اپنا مستقل مشغلہ قرار دے لیا تھا اور ساری توجہ علما و طلبا کی تعلیم و تعلم پر مرکوز کردی تھی۔ نہایت قانع بزرگ تھے اور بہت قلیل آمدنی پر گزر بسر کرتے تھے، درس و تدریس میں انتہائی قلبی اطمینان محسوس فرماتے تھے۔[۱۲۷]

۲۱۔ قاضی عبدالعزیز نصیر آبادی

قاضی عبدالعزیز بن فتح عالم بن محمد بن محمود شریف حسنی نصیر آبادی، امیر کبیر شیخ الاسلام قطب الدین محمد بن احمد مدنی کردی کی اولاد سے تھے۔ نصیر آباد میں پیدا ہوئے جو ہندوستان کے صوبہ یو۔پی کے شہر رائے بریلی کے مضافات میں واقع ہے۔ وہیں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں، یہاں تک کہ فتویٰ و تدریس کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہو گئے۔ قابلیت کا یہ عالم تھا کہ شاہ جہان کے عہد میں اپنے بڑے بھائی ابو محمد بن محمد بن محمود نصیر آبادی کی نیابت کرتے ہوئے ان کی جگہ نصیر آباد کے منصبِ قضا پر متعین ہوئے۔ اپنے علاقے کے مشہور شیخ و عالم اور فقیہ تھے۔[۱۲۸]

۲۲۔ شیخ عبدالعزیز الہ آبادی

شیخ عبدالعزیز الہ آبادی، فقیہ اور صالح عالم دین تھے۔ شیخ محب اللہ عمری کے خالہ زاد بھائی تھے۔ شیخ محب اللہ سے علم ظاہری اور تصوف و طریقت کی تحصیل کی، طویل عرصہ ان کی

---

[۱۲۷] منتخب التواریخ۔ ج ۳، ص ۱۰۶ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۶ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۹

[۱۲۸] سید احمد شہید — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۸

خدمت میں گزارا اور بہت استفادہ کیا۔ بعدازاں الہ آباد سے عازمِ دہلی ہوئے اور وہاں شیخ باقی باللہ کے صاحب زادۂ گرامی شیخ عبداللہ سے ملاقات کی۔ دہلی ہی میں اسراریہ کے مصنّف کمال محمد سنبھلی ان سے ملاقی ہوئے [۱۲۹]

۲۳- شیخ عبدالغفور اجینی

شیخ عبدالغفور بن داؤد اجینی، فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ اجین کے باشندے تھے۔ اپنے عمِّ بزرگ وار شیخ راجی محمد اجینی سے حصولِ علم کیا اور کافی عرصہ ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ اخذِ طریقت بھی انھی سے کیا۔ قرآنِ مجید سے قلبی لگاؤ تھا، چنانچہ پہلے قرآن حفظ کیا اور پھر اس کے مشکلات و غوامض کے حل و کشود میں مصروف ہوگئے۔ ہر سال رمضان المبارک میں قرآنِ مجید اپنے ہاتھ سے لکھ کر کسی قرآن خوان درویش کو دیا کرتے تھے۔ مکہ مکرّمہ اور مدینہ منورہ کا سفر بھی کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ ہندوستان واپس آئے تو ارضِ حجاز سے مراجعتِ ہند پر نہایت افسوس کا اظہار کرتے تھے اور دل میں واپس حجاز جانے کی شدید آرزو رکھتے تھے۔ ہر صورت اور ہر حال میں لوگوں کے کام کاج اور ان کی سفارشات اور انھیں فائدہ پہنچانے کے لیے ساعی رہتے۔ نرم دل، حلیم الطبع اور نیک عالمِ دین تھے۔ ۱۰۰۵ھ یا ۱۰۰۶ھ کو شہر اُجین میں فوت ہوئے [۱۳۰]

۲۴- قاضی عبدالغنی خاندیسی

قاضی عبدالغنی خاندیسی، فقہ و اصول اور قرات و تجوید کے جیّد علما میں سے تھے۔ صوبہ خاندیس کے منصبِ قاضی القضاۃ پر فائز تھے۔ عالمِ جوانی ہی میں درس و افادہ میں مصروف ہوگئے اور طویل عرصہ تک یہ اہم خدمت انجام دیتے رہے۔ جب جوانی رخصت ہوگئی اور

---

۱۲۹ اسراریہ ۔ ص — نزہۃ الخواطر ۔ ج ۵، ص ۲۲۹

۱۳۰ اذکارِ ابرار ۔ ص ۴۱۲، ۴۱۳ — ایضاً ۔ ص ۲۳۰

دورِ پیری میں داخل ہوئے تو صحیح بخاری کی شروح اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف کے مطالعہ کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔ اس ہندی عالم و فقیہ نے ۱۰۰۹ھ کو برہان پور میں وفات پائی [۱۳۱]

۲۵۔ شیخ عبدالفتاح چریاکوٹی

شیخ عبدالفتاح بن مبارک عباسی چریاکوٹی ۹۹۴ھ کو چریاکوٹ میں پیدا ہوئے، اپنے عصر کے مشاہیر اساتذہ سے اخذِ علم کیا اور اس درجہ شہرت و ناموری حاصل کی کہ اس دور کے مشاہیر فقہائے حنفیہ میں سے گردانے گئے۔ "میراث نامہ" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو فارسی نظم میں ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

مہذب گشت ایں میراث نامہ — خدا را شکر کز تحریر نامہ

اس عالمِ دین نے ربیع الاوّل ۱۰۵۷ھ کو وفات پائی [۱۳۲]

۲۶۔ قاضی عبدالقادر پانی پتی

قاضی عبدالقادر پانی پتی ثم اجینی پانی پت میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی، قاضی محمود پانی پتی کے بیٹے تھے۔ شیخ عبدالملک بن عبدالغفور پانی پتی سے اخذِ علم کیا۔ تصوف سے دلچسپی ہوئی تو شاہ عبدالرزاق کی خدمت میں گئے اور ان سے کسبِ فیض کیا۔ ان کے مرید و خلیفہ ہوئے اور متصوفین فقہا میں سے شمار کیے گئے۔ عالمِ شباب میں عازمِ حج ہوئے اور تین مرتبہ اس مبارک سفر پر گئے۔ ان کے سفرِ حج کے سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اثنائے سفر میں متعدد مدارس اور مراکزِ علم میں پہنچے اور بہت سے لوگوں سے ملاقات کی، جنگلوں اور دریاؤں کو عبور کیا مگر کسی سے کسی قسم کی نہ مدد لی، نہ روپے پیسے کی اعانت طلب کی۔ حج

---

[۱۳۱] اذکارِ ابرار۔ ص ۴۵۱ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۳۰

[۱۳۲] تاریخ مکرم۔ ص — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۳۱، ۲۳۲

کے بعد اُجین (مالوہ) میں سکونت اختیار کرلی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ بالآخر عزیزوں اور دوستوں کے اصرار پر مالوہ کے شہر سارنگ پور میں مقیم ہوگئے۔ سارنگ پور میں ان کے چچا منصبِ قضا پر فائز تھے۔ چچا کی وفات کے بعد ان کو وہاں عہدہ قضا قبول کرنے کو کہا گیا۔ یہ عہدہ قبول تو کرلیا مگر بعد کو اس سے دست بردار ہو کر وہاں سے چلے گئے اور کسی دُور دراز علاقے میں سکونت اختیار کرلی۔ ان کے دوستوں نے تعاقب کیا، واپس لائے اور دس سال بعد پھر منصبِ قضا پر فائز کردیا۔

غرض قاضی عبدالقادر پانی پتی ایک نیک اور دنیا سے بیزار قسم کے عالمِ دین تھے۔ دنیا کی ظاہری شان وشکوہ سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہمہ وقت ذکرِ الٰہی اور یادِ خدا میں مصروف رہتے تھے۔ فصیح البیان تھے، عربی اور فارسی کے بے شمار اشعار زبانی یاد تھے، جنھیں تقریر وتحریر میں برمحل اور مناسب موقع پر پڑھتے اور لکھتے ــــ صوفیا کی عبارتیں بھی خوب یاد تھیں۔

قاضی ممدوح بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ علمِ تفسیر پر نظر رکھتے تھے۔ آیاتِ متشابہات کی تاویلات، ناسخ ومنسوخ، آیاتِ قرآن کے نزول کی تقدیم وتاخیر، مشکلاتِ قرآنیہ کے حل وکشود، مجملات کے بیان، اعراب کی تخصیص وتعمیم اور وجوہ، شانِ نزول، قرآن کے استعارات اور حقیقت ومجاز کے عالم تھے۔ ہر جمعہ کو شہر کی جامع مسجد میں تفسیرِ قرآن بیان فرمایا کرتے، جس میں مفسّرین کے اقوال وآرا کے خوب حوالے دیتے۔ وفات کے دن بھی حسبِ معمول مقررہ وقت پر سورۂ مزمل کی تفسیر بیان کی۔ بعدازاں بدن میں ایک لرزہ پیدا ہوا، کچھ وصیت کی اور دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔ ۱۱۰۱ھ کو اُجین میں انتقال کیا اور مورخین نے "قاضی زندہ دل" کے الفاظ سے تاریخ وفات نکالی[۱۳۳]۔

۲۷۔ قاضی عبدالقادر لکھنوی

قاضی عبدالقادر لکھنوی فاضلِ وقت اور علامۂ عصر تھے۔ شیخ سلطان بن اللہ داد کی

---

[۱۳۳] اذکارِ ابرار۔ ص ۶۶۱، ۶۶۲ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۳۶، ۲۳۷

اولاد سے تھے۔ ان کے آبا و اجداد میں مولانا قطب الدین محدث بن مولانا خضر محدث ایسے برگزیدہ علما و فضلا کے اسمائے گرامی تذکروں میں مرقوم ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ۹۹۶ھ کو لکھنؤ میں اور ایک روایت کے مطابق کسمنڈی میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں اعمال لکھنؤ میں ایک قریہ تھا۔ نیک اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو قرآن مجید حفظ کیا اور مزید حصولِ علم کے لیے لاہور روانہ ہوئے۔ لاہور کو اس عہد میں مرکزِ علم و فضل کی حیثیت حاصل تھی، یہاں مختلف علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور درجۂ ممتازہ پر فائز ہوئے۔

قاضی عبد القادر لکھنوی مستغنی المزاج عالم تھے، دنیا اور اس کے مال و اسباب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جو آمدنی ہوتی غربا و مستحقین میں بانٹ دیتے۔ ان کا معمول تھا کہ عشا کی نماز کے بعد جب تک لوگ جاگتے یہ سوتے رہتے اور جب لوگ سو جاتے تو جاگ اٹھتے۔ پھر صبح تک نماز اور وظائف و اوراد میں مشغول رہتے۔ نماز چاشت کے بعد طلبا کو درس دیتے۔ اس ہندی عالمِ دین نے چالیس سال تک مسندِ درس و افادہ آراستہ کیے رکھی اور ان کی کوشش سے اللہ نے بے شمار علما و طلبا کو دولتِ علم سے بہرہ ور کیا۔ ان کی وفات ۲۷ شعبان ۱۰۷۶ھ کو لکھنؤ میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ کل بیاسی سال عمر پائی [۱۳۴]

۲۸- شیخ عبد القادر حضرمی

شیخ عبد القادر بن شیخ عبد اللہ عیدروس حضرموتی ہندی، ۲۰ ربیع الاول ۹۷۸ھ کو ہندوستان کے مشہور شہر احمد آباد میں پیدا ہوئے اور ملک کے جید علما و فضلا سے تعلیم حاصل کی۔ یہ شافعی المسلک فقیہ تھے اور اپنے دور کے نامور فاضل تھے۔ تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے۔ ان کی تصنیفات میں بڑی عمدہ اور قابلِ قدر کتابیں شامل ہیں۔ النور السافر فی اخبار القرن العاشر بھی انھی کی تصنیف ہے جو عربی زبان میں تاریخ و رجال کی بہترین کتاب ہے اور کتب حوالہ میں سے ہے۔ اس کے حوالے "فقہائے ہند" کی کئی جلدوں میں متعدد مقامات میں دیے گئے ہیں۔

---

[۱۳۴] تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۲۸ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۳۴

اور معزز قارئین کے مطالعہ میں آچکے ہیں - ان کی تصنیفات میں درج ذیل کتابوں کے نام تذکروں میں مرقوم ہیں :

۱- الفتوحات القدسیہ فی الخرقۃ العیدروسیہ - (۲) الحدائق الخضرۃ فی سیرۃ النبی واصحابۃ العشرۃ - (۳) المنتخب المصطفٰی فی اخبار مولد المصطفٰی - (۴) الدر الثمین فی بیان المہم من الدین - (۵) اتحاف الحضرۃ العزیزۃ بعیون السیرۃ الوجیزۃ - (۶) المنہاج الیٰ معرفۃ المعراج - (۷) الانموذج اللطیف فی اھل بدر الشریف (۸) اسباب النجاۃ والنجاح فی اذکار المساء والصباح - (۹) الحواشی الرشیقۃ علی العروۃ الوثیقۃ - (۱۰) منح الباری بختم البخاری - (۱۱) تعریف الاحیاء لفضائل الانبیاء - (۱۲) عقد اللآل بفضائل الآل - (۱۳) بغیۃ المستفید لشرح تحفۃ المرید - (۱۴) النفحۃ العنبریہ فی شرح بیتین العدنیۃ - (۱۵) غایۃ القرب فی شرح نہایۃ الطلب - (۱۶) اتحاف اخوان الصفا بشرح تحفۃ الظرفاء - (۱۷) صدق الوفاء بحق الخلفاء - (۱۸) النور السافر فی اخبار القرآن العاشر - (۱۹) الزھر الباسم من روض الاستاذ حاتم - (۲۰) قرۃ العین فی مناقب الولی عمر بن محمد باحسین - (۲۱) الروض الاریض والفیض المستفیض (یہ ان کے اشعار کا مجموعہ ہے)۔

شیخ عبد القادر حضرمی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ تصوف وطریقت سے بھی لگاؤ تھا - بہترین شاعر بھی تھے -

اس عالم دین اور عظیم مصنف نے ۱۰۳۸ھ کو احمد آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے - [۱۳۵]

۲۹- شیخ عبد القادر اچی

شیخ عبد القادر پنجاب کے شہر اُچ کے باشندے اور شیخ حامد قادری اُوچی کے صاحب زادے تھے -

---

[۱۳۵] تذکرہ علمائے ہند - ص ۱۲۹ —— حدائق الحنفیہ - ص ۴۰۶ —— نزہۃ الخواطر - ج ۵ ص ۲۳۵، ۲۳۶ —— خلاصۃ الاثر - ج ۲، ص ۴۴۰

والد کی وفات کے بعد بڑے بھائی شیخ موسیٰ سے سجادہ نشینی کے مسئلے پر جھگڑا ہو گیا تھا جو کئی سال چلتا رہا۔ بالآخر مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے پاس فتح پور سیکری چلے گئے تھے۔ بڑے عالم اور نیک بزرگ تھے۔ دعوت و ارشاد ان کا اصل موضوع تھا۔ اکبر کے مذہبی خیالات میں تبدیلی آئی تو اس سے دُور ہٹ گئے۔ اکبر بھی ان سے خوش نہ رہتا تھا۔ ایک رات بادشاہ نے شیخ سے کوکنار (پوست) پینے کو کہا۔ شیخ نے سخت لفظوں میں انکار کر دیا، اس سے بادشاہ کا مزاج اور بھی مکدّر ہو گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ رنج بادشاہ کو اس سے ہوا کہ ایک مرتبہ شیخ موصوف نے فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں نماز باجماعت سے فارغ ہو کر نفل پڑھنا شروع کر دیے۔ بادشاہ نے کہا:

شیخ نماز نفل در خانہ بگزارید۔

شیخ نفل نماز گھر جا کر ادا کرو۔

شیخ نہایت جرأت سے بولے:

پادشاہم! ایں ملکِ شما نیست کہ بحکم شما باشد۔

بادشاہ! یہ جگہ تیری ملکیت نہیں ہے کہ تیرا حکم چلے۔ تم اس کے مالک نہیں، بادشاہ ہو۔

اکبر کو ان الفاظ سے بڑی تکلیف پہنچی اور کہا "یہ شیخ کس قدر جاہل ہے"۔ پھر حکم صادر ہوا:

چوں ملک از ما نمی خواہی در ملک ما ہم مباش۔

اگر تم ہماری ملکیت نہیں مانتے تو ہمارے ملک میں نہ رہو۔

شیخ اسی وقت اُٹھے اور بادشاہ کی امداد و اعانت کو ترک کر کے اپنے شہر اچ واپس چلے گئے۔ بھائی سے جھگڑا ختم کیا اور دعوت و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔

یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ شیخ عبدالقادر کے ایک بھائی شیخ موسیٰ (جن سے سجادہ نشینی کے بارے میں تنازع پیدا ہو گیا تھا) پہلے ہی زہد و عبادت اور مجاہدہ و مشیخت کی زندگی ترک کر کے اکبر کے دربار میں پہنچ گئے تھے اور اس سے تعلق پیدا کر کے سپاہ گری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ فوج میں ملازم ہو گئے تھے اور پانچ صدی امیروں کی صف میں چلے گئے تھے۔ اکبر کے افکارِ دینی میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی تاہم شیخ موسیٰ کا یہ حال تھا کہ دربار میں اگر نماز کا

وقت آ جاتا تو عین دیوان خانۂ خاص و عام میں بادشاہ کی موجودگی میں خود اذان کہہ کر باجماعت نماز ادا کرتے اور کسی کو انھیں ٹوکنے یا کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوتی ـــــ بعد میں شیخ موسیٰ کو بادشاہ کی طرف سے ملتان میں جاگیر مل گئی تھی اور وہیں منتقل ہو گئے تھے۔[۱۳۶]

۳۰- شیخ عبدالقادر لاہوری

شیخ عبدالقادر بن محمد بن زین العابدین لاہوری بھی درحقیقت اوچ کے باشندے تھے۔ بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی کا نام شیخ اللہ بخش تھا۔ دونوں بھائی عالم باعمل، پرہیزگار اور باکمال بزرگ تھے۔ دونوں اکبر کے دربار سے متعلق تھے۔ اکبر نے نیا مذہب ایجاد کیا تو اُن کا شمار اس کے مخالفوں میں ہونے لگا۔ بادشاہ نے شیخ اللہ بخش کو صدر کا عہدہ تفویض کر کے گجرات بھیج دیا جنھوں نے وہاں بڑی خدمات انجام دیں، بادشاہ نے تین صدی کے منصب کا فرمان جاری کیا، مگر اس اثنا میں یہ گجرات ہی میں وفات پا گئے۔ رہے شیخ عبدالقادر تو ان کو بادشاہ نے مکہ معظمہ چلے جانے کا حکم دیا۔ ارضِ حجاز کا سفر ان دنوں بادشاہ کی طرف سے جلاوطنی کا حکم رکھتا تھا۔ ان دنوں گجرات کے نظم و نسق پر میرزا نظام الدین احمد اور خان خاناں بیرم خاں متعین تھے۔ شیخ عبدالقادر سفرِ حجاز کے سلسلے میں وہاں پہنچے تو ان لوگوں نے سامانِ سفر اور زادِ راہ تیار کیا۔ شیخ حج و زیارت سے فیض یاب ہو کر واپس آئے تو لاہور میں مقیم ہو گئے اور زہد و افادہ کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔ ۱۰۲۲ھ کو لاہور ہی میں وفات پائی۔[۱۳۷]

۳۱- علامہ عبدالقادر اجینی

علامہ عبدالقادر اجینی کا مولد بغداد تھا۔ والد کی وفات کے بعد چچا کی نگرانی میں چلے گئے۔

---

[۱۳۶] منتخب التواریخ۔ ج ۳، ص ۹۱ تا ۹۳ ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۳۳

[۱۳۷] ایضاً۔ ص ۱۰۱ ـــــ ایضاً۔ ص ۲۳۷

بغداد سے واردِ ہند ہوئے۔ پہلے بندرگاہ گوا میں اُترے، بعد میں گجرات کا عزم کیا۔ منطق و فلسفہ اور دیگر علومِ مروجہ میں مہارت رکھتے تھے۔ ۹۸۲ھ میں جلال الدین اکبر سے تعلق پیدا ہوا۔ بعض کتابوں پر تعلیقات و حواشی بھی لکھے۔ ۱۰۲۱ھ کو اجین میں پیدا ہوئے [۱۳۸]

۳۲۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی

مُلّا عبدالقادر بدایونی، شیخ ملوک شاہ عمری بدایونی کے بیٹے تھے۔ شیخ ملوک شاہ کا شمار اپنے علاقے کے صالح علمائے دین میں ہوتا تھا۔ شیخ وقت مولانا حاتم سنبھلی (متوفی ۹۶۹ھ) کے شاگرد تھے۔ ان سے کچھ کتابیں پڑھی تھیں، لیکن تکمیل شیخ جلال الدین بدایونی سے کی تھی۔ اخذِ طریقت مولانا عبداللہ بدایونی ساماتوی سے کیا۔ ۲۷ رجب ۹۶۹ھ کو بعارضہ اسہال آگرہ میں وفات پائی اور میت کو بساور میں لے جاکر دفن کیا گیا۔ مُلّا عبدالقادر نے ”جہانِ فضل“ تاریخ وفات نکالی۔

معلوم ہوتا ہے، شیخ ملوک شاہ اچھے عالم تھے اور ان کا کتب خانہ بھی تھا۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے، جو عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ جس زمانے میں وہ حصولِ علم کے لیے سنبھل میں مقیم تھے، ہیموں بقال (ہیموں بنیا) نے سر اٹھایا اور اس کا لشکر لوٹ مار کرتا ہوا، بساور پہنچا۔ اس کے ظلم و تشدّد سے تمام بساور لُٹ کر برباد ہوگیا۔ بدایونی افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اس لوٹ مار میں والد کا کتب خانہ بھی لُٹ گیا۔ اس سے دوسرے برس قحط کی مصیبت آئی۔ اس میں مخلوق خدا کی بدحالی دیکھی نہ جاتی تھی۔ ہزاروں آدمی بھوک سے مرگئے۔ آدمی کو آدمی کھاتا تھا۔

شیخ ملوک شاہ کے بیٹے مُلّا عبدالقادر بدایونی اپنے عہد کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ دَورِ اکبری کے مشاہیر اور نامور علما میں سے تھے، تاریخ و رجال، شعر و انشا اور فنونِ حکمیہ کے ماہر تھے، حدیث اور فقہ میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ تاریخ میں یہ مُلّا عبدالقادر کے

---

[۱۳۸] اذکارِ ابرار۔ ص ۵۴۸ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۳۲، ۲۳۳

نام سے معروف ہیں اور لفظِ "مُلّا"، ان کے نام جز ہو گیا ہے۔ "مُلّا" اس دور میں ایک معزز لفظ تھا اور اس کا اطلاق عالم اور فاضل شخص پر ہوتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عبدالقادر بدایونی اس کے صحیح منطوق اور جائز حق دار تھے۔!

بدایونی کی ولادت

عبدالقادر بدایونی ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ کو ہندوستان کی سابق ریاست جے پور (راجستان) کے قصبہ ٹوڈا میں شیر شاہ سوری کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوئے۔ اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں وہ شیر شاہ کے حسنِ انتظام اور عدل و انصاف کی بہت تعریف کرتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس منصف مزاج بادشاہ کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اس ضمن میں بدایونی کے الفاظ یہ ہیں:

بحمد اللہ کہ در زمان ایں چنیں ملکے کما قال النبی علیہ السلام انا ولدت فی زمان الملک العادل، تولد صاحبِ ایں منتخب در ہفدہم شہر ربیع الثانی در سنہ سبع و اربعین و تسمائۃ واقع شد[۱۳۹]

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میری ولادت عادل بادشاہ (نوشیروان) کے عہد میں ہوئی۔ الحمد للہ کہ صاحب منتخب التواریخ بھی ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ کو اس بادشاہِ عادل (شیر شاہ سوری) کے عہد میں پیدا ہوا۔

بدایونی کی ابتدائی زندگی بساور میں گزری جو ٹوڈا سے شمال مشرقی جانب اٹھارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

عبدالقادر بدایونی فاروقی النسل تھے۔ ان کا خاندان مالی اعتبار سے تو آسودہ حال نہ تھا، البتہ ددھیال اور ننھیال دونوں صاحبِ علم اور دین دار گھرانے تھے اور اس نعمتِ خداوندی کے بہت قدر دان تھے۔

حصولِ علم

بدایونی نے سلیم شاہ سوری کے زمانے میں سنبھل جا کر سید محمد مکی سے قرآن مجید پڑھا۔ سید محمد مکی

---

۱۳۹ منتخب التواریخ - ج ۱، ص ۳۶۳

قراءاتِ سبعہ کے قاری تھے۔ ان سے قرأت وغیرہ کی تکمیل کی اور خوش الحانی و تجوید سے قرآن پڑھنا سیکھا۔

بدایونی کے نانا کا نام مخدوم اشرف تھا، وہ عالمِ دین تھے اور عہدِ سلیم شاہ سوری میں ایک پنج ہزاری سردار فرید تارن کی فوج میں (جو علاقہ آگرہ میں بیانہ کے قریب بجواڑہ میں متعین تھا) ایک جنگی عہدے پر فائز تھے۔ ان کو اپنے نواسے (عبد القادر) سے انتہائی محبت تھی۔ شفیق نانا نے کچھ عرصہ ذہین نواسے کو اپنے پاس رکھا اور صرف و نحو اور عربی علوم کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں۔

۹۶۱ھ میں جب بدایونی بارہ تیرہ سال کی عمر کے تھے، والدِ مکرم (شیخ ملوک شاہ) انھیں مولانا حاتم سنبھلی کی خدمت میں سنبھل لے گئے۔ ان کے مدرسے اور خانقاہ میں انھوں نے قصیدہ بردہ یاد کیا، وظائف وغیرہ کی اجازت حاصل کی اور تبرکاً فقہِ حنفی کی کتاب کنز الدقائق کے چند سبق پڑھے۔ مولانا حاتم کے حلقۂ ارادت میں بھی داخل ہوئے۔ مولانا نے اپنے استاذ شیخ عزیز اللہ تلنبی کی طرف سے بھی کلاہ اور شجرہ عنایت کیے تاکہ ہونہار شاگرد علمِ باطنی کے ساتھ علمِ ظاہری سے بھی بہرہ ور ہو جائے۔

ایک بزرگ شیخ سعد اللہ نحوی بیانوی (متوفی ۹۸۹ھ) تھے۔ بیانہ کے رہنے والے تھے، فنِ نحو میں اپنے دَور کے امام تھے۔ اس موضوع میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ اسی سبب سے نحوی ان کے نام کا جزء ہو گیا تھا۔ سلیم شاہ سوری کے عہد میں بدایونی اپنے نانا کی معیت میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے علمِ نحو کی کتاب کافیہ کے چند سبق پڑھے۔ ۹۶۶ھ کو بدایونی اور ان کے والد شیخ ملوک شاہ آگرہ گئے۔ وہاں متعدد اصحابِ علم اور اربابِ کمال قیام پذیر تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ قاضی ابو المعالی بخاری تھے، ان سے بدایونی نے شرح وقایہ کا کچھ حصہ پڑھا۔ قاضی ابو المعالی بخاری، فروع و اصول میں یگانۂ روزگار تھے اور کبار فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ وہ ۹۶۹ھ کو بعہدِ اکبر بادشاہ آگرہ گئے اور مسندِ درس بچھائی۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ کچھ کتابیں مفتی ابو الفتح بن عبد الغفور تھانیسری (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۹۷۶ھ) سے پڑھیں اور ابتدائے عمر میں چند کتابوں کی تحصیل

ابوالفضل اور فیضی کے والد ملا مبارک ناگوری (متوفی ۱۷ ذی القعدہ ۱۰۰۱ھ) سے کی۔ میر تقی بن فارغی شیرازی سے بھی بعض کتابیں پڑھیں۔ آگرہ میں مولانا مرزا سمرقندی سے شرح شمسیہ اور بعض دیگر کتابوں کی تکمیل کی۔

مولانا مرزا سمرقندی کے بارے میں بدایونی لکھتے ہیں کہ وہ انسانی شکل میں فرشتہ تھے۔ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے اور مدینہ منورہ سے ہو آئے تھے۔ علما و طلبا کی بہت بڑی تعداد ان سے فیض یاب ہوئی۔ منطق کی مشہور کتاب "شرح شمسیہ" امیر سید محمد کی تصنیف ہے، جو امیر سید علی ہمدانی کے بیٹے تھے۔ اور امیر سید علی ہمدانی وہ بزرگ ہیں، جن کی کوششوں سے خطۂ کشمیر میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ بدایونی نے شرح شمسیہ کا کچھ حصہ اور تمام مختصرات مولانا مرزا سمرقندی سے پڑھی تھیں[۱۴۰]۔

آگرہ میں بدایونی کو بہت سے لوگوں کی صحبت و رفاقت میں رہنے کے مواقع میسر آئے اور ہر قسم کے افراد سے ان کے تعلقات قائم ہوئے، جن میں علما، امرا، مؤرخین اور دربارِ اکبری کے مختلف فکر و خیال کے حامل اصحاب کے نام کتبِ تاریخ میں مرقوم ہیں۔ ان میں نظام الدین ہروی (مصنف طبقاتِ اکبری)، غیاث الدین قزوینی، کمال الدین حسین شیرازی، ابوالفضل اور فیضی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں — انہی ایام میں فتح پور سیکری کے دورِ قیام میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے بھی ملاقاتوں کا سلسلہ رہا اور ان کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے بدایونی نہایت متاثر ہوئے[۱۴۱]۔

والد اور نانا کی وفات

بدایونی اپنے والد سمیت آگرہ میں تھے کہ ۲۷ رجب ۹۶۹ھ کو آگرہ میں والد انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کی بدایونی نے ان اشعار سے تاریخ نکالی:

سر دفتر افاضلِ دوراں ملوک شاہ ۔۔۔ آں بحرِ علم، معدنِ احسان و کانِ فضل

---

۱۴۰ منتخب التواریخ

۱۴۱ منتخب التواریخ - ج ۳، ص ۱۱۳ تا ۱۱۷

چوں بود در زمانہ جہانے ز فضل ازاں تاریخ سال فوت وے آمد جہان فضل [۱۴۲]

اس کے بعد بدایونی علاقہ سنبھل کے ایک مقام سہسوان میں تھے کہ نانا مخدوم اشرف کی وفات کی اطلاع پہنچی [۱۴۳] یعنی ایک سال میں یکے بعد دیگرے دو موتوں کے صدمے برداشت کرنا پڑے۔ ایک والد کی موت کا اور ایک نانا کی موت کا۔! نانا ان کے استاذ بھی تھے اور بے حد مہربان و شفیق بھی۔! بدایونی ان کی موت سے بہت مغموم ہوئے اور حزن وملال کی سیاہ گھٹائیں ان پر چھا گئیں۔ منتخب التواریخ میں اس سانحہ کا انھوں نے انتہائی افسوس کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

امیر حسین خاں کی ملازمت

۹۷۳ھ میں بدایونی علاقہ اودھ کے والی امیر حسین خاں کے پاس بٹیالہ پہنچے۔ بٹیالہ وہ مقام ہے، جہاں امیر خسرو پیدا ہوئے تھے۔ یہ علاقہ امیر حسین خاں کی جاگیر میں شامل تھا۔ حسین خاں عامل سنت، علم پرور، علما دوست، پابند نماز با جماعت، ہمدرد خلائق، صاحب اخلاق، درویش سیرت، پیکر جود و سخا اور متواضع امیر تھا۔ بدایونی نے اس پرہیزگار اور بہادر افغان کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس نے ہمایوں کی مراجعت ہند سے لے کر اکبر کے بائیسویں سال جلوس تک بڑی جاں نثاری اور وفاداری کا ثبوت دیا تھا اور تین ہزاری منصب سے سرفراز ہوا تھا۔ ۹۷۳ھ سے ۹۸۱ھ تک بدایونی اس کی جاگیر کی حفاظت و وکالت کے فرائض نہایت حسن و خوبی سے انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں علما و مشائخ کی مجلسیں خوب گرم رہیں اور قال اللہ و قال الرسول کی دل نواز صداؤں سے سیرابی قلب و روح کے سامان فراہم ہوتے رہے [۱۴۴] اسی دوران میں ۹۷۵ھ کو وہ رخصت لے کر بدایوں گئے اور دوسری شادی کی، جس کا ذکر انھوں نے اگرچہ صرف ڈیڑھ سطر میں کیا ہے، لیکن بڑے پرلطف انداز میں کیا ہے۔ پہلی شادی کا تذکرہ نہیں کیا۔ معلوم نہیں عقد ثانی کے وقت پہلی بیوی زندہ

---

۱۴۲ منتخب التواریخ۔ ج ۲، ص ۵۳ ۱۴۳ ایضاً۔ ص ۶۴

۱۴۴ ایضاً، ص ۱۳۶

تھی یا وفات پا چکی تھی۔

بیٹے اور بھائی کی وفات

کچھ عرصہ بعد بدایونی کو اللہ نے بیٹا عطا فرمایا۔ اس کا نام عبداللطیف رکھا۔ بیٹے کی پیدائش سے نہایت خوش ہوئے، لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ چھوٹی عمر میں بیٹا بھی فوت ہوگیا اور چھوٹا بھائی محمد بھی وفات پا گیا۔ بدایونی اس دوہرے صدمے کا بڑے افسوس کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

چھوٹے بھائی شیخ محمد کی میں نے جان کے برابر پرورش کی تھی، بلکہ میں اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ بڑے اخلاقِ حمیدہ کا مالک تھا۔ ایک اچھے گھرانے میں اس کی شادی کی۔ کیا خبر تھی کہ اس کارِ خیر میں ہزاروں حزن و ملال کی شر چھپی ہوئی ہے۔ اس کو ہم سے موت نے چھین لیا۔ اسی طرح نورِ چشم عبداللطیف جو ہنستا کھیلتا بچہ تھا، گود سے گور میں چلا گیا۔ وہ میری زندگی کا ہرا بھرا پودا تھا اور میں اپنے زمانے کا شہریار تھا۔ افسوس دونوں کو زمانے کی نظر کھا گئی اور ان کی موت نے مجھے اپنے ہی شہر میں پردیسی کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون[۱۴۵]

واقعۂ عشق اور اس کی سزا

بدایونی بڑے صاف گو مؤرخ ہیں، بعض دفعہ ایسی باتیں بھی بیان کر جاتے ہیں، بظاہر جنہیں لوگوں سے چھپانا چاہیے۔ اس ضمن میں نہ وہ اپنا لحاظ کرتے ہیں نہ دوسروں کا۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ جو حسین خاں کے دورانِ ملازمت میں ۹۷۹ھ کو پیش آیا، اور جو ان کے عشق و محبت اور اس کے نتیجے سے تعلق رکھتا ہے، منتخب التواریخ میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

"اس سال مجھے ایک ہولناک واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔ قصہ یہ ہوا کہ جب حسین خاں کو کانت و کولہ کی جاگیر دی گئی تو میں بھی تقدیر کا مارا کچھ عرصے تک اس کی ملازمت میں وہاں رہا۔ اس صوبے کی صدارت اور فقرا کی خدمت میرے سپرد کی گئی تھی۔ قنوج کے مضافات میں مکن پور کے مقام پر حضرت بدیع الدین شاہ مدار کا مزار ہے۔ میں اس کی زیارت کے لیے وہاں گیا۔ انسان کی سرشت میں غفلت و جہل

---

[۱۴۵] منتخب التواریخ۔ ج ۲، ص ۱۲۶، ۲۷

ابوالبشر آدم سے وراثت میں چلے آرہے ہیں۔ میں نے بھی انسان کا کچا دودھ پیا ہے، خطا و نسیان سے بالاتر نہیں ہوں، میری آنکھوں پر بھی غفلت و جہالت کا پردہ پڑ گیا اور وہاں ایک خوبرو کے کرشمہ و ادا نے مجھے دامِ ہوس میں پھنسا دیا۔ ہوس کو عشق سمجھ بیٹھا۔ پھر جو کچھ بیتی سو بیتی۔ اس درگاہ میں مجھ سے بے ادبانہ حرکت سرزد ہوئی، خدا کا شکر ہے کہ اس کا خمیازہ مجھے اس دنیا ہی میں مل گیا۔ میرے "معشوق" کی قوم کے چند افراد نے حملہ کر کے مجھے زخمی کر دیا۔ میرے سر، ہاتھوں اور کندھے پر پے در پے تلوار کے نو زخم لگے۔ دوسرے زخم تو مندمل ہو گئے، لیکن سر کا زخم بہت گہرا تھا، تلوار ہڈی کو توڑتی ہوئی بھیجے تک پہنچ گئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کی رگ بھی کٹ گئی تھی اور انگلی لٹکنے لگی تھی۔ زندگی کے ختم ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی، مگر خدا کا شکر ہے کہ اتنے بڑے حادثے کو برداشت کر گیا۔

"قصبۂ بانگر مئو میں ایک ماہر جراح نے علاج کیا اور ہفتہ بھر کے اندر ہی تمام زخم ٹھیک ہو گئے۔ اس بیماری اور مصیبت میں منت مانی کہ صحت یاب ہو جاؤں تو حج کروں گا۔ لیکن افسوس ایفائے عہد کی اب تک نوبت نہیں آئی۔ غرض کچھ صحت پانے کے بعد وہاں (قصبۂ بانگر مئو) کانت و کولہ گیا۔ غسلِ صحت کے بعد پھر دوبارہ بیمار ہو گیا۔ حسین خاں نے، خدا اُسے جنت نصیب کرے، باپ اور بھائی کی طرح میری خدمت کی۔ ان دنوں سخت سردی پڑ رہی تھی، لہٰذا زخم دوبارہ ہرا ہو گیا تھا۔ اس نے چوب گز[۱۴۶] کا مرہم اور کھانے کو گزر کا حلوا تیار کرایا۔ میں وہاں سے بدایوں چلا گیا۔ وہاں طبیب نے سر کے زخم کو دوبارہ کھول کر مرہم پٹی کی۔ اس علاج میں ایسی تکلیف ہوئی کہ بس موت کے مُنہ میں جا کر نکلا۔ اسی دوران میں ایک دن کچھ نیند اور کچھ بیداری کے عالم میں ایک خواب دیکھا کہ سپاہی مجھے پکڑ کر آسمان پر لے گئے ہیں، وہاں باقاعدہ کچہری لگی ہوئی ہے، جس میں دیوانی کارندے اور محرر کام میں مصروف ہیں۔ چوکیداروں کی ایک جماعت شاہی اجلاس کی طرح ہاتھ میں چھڑیاں لیے ہوئے لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹانے اور مؤدب رکھنے میں مصروف ہے۔ مجھے پیش کیا گیا تو ایک محرر ایک کاغذ ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھنے لگا۔ پھر کہا۔ "یہ وہ شخص نہیں ہے" اسی حالت میں میری آنکھ کھل گئی ـــــ میں نے بچپن میں جو افواہ لوگوں سے سن رکھی تھی، اس موقع پر مجھے اس کا یقین سا ہو گیا۔"[۱۴۷]

---

۱۴۶ ایک درخت کا نام ہے جو ندی کے کنارے ہوتا ہے۔ عربی میں اسے طرفا اور ہندی میں جھاؤ کہتے ہیں۔

۱۴۷ منتخب التواریخ ـ ج ۲، ص ۱۳۶ تا ۱۳۸

بدایوں میں آتش زدگی

۹۷۹ھ ہی کو بدایوں میں آتش زدگی کا حادثہ پیش آیا۔ بدایونی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"اسی سال بدایوں میں آتش زدگی کا ہولناک واقعہ رونما ہوا۔ اس حادثے میں اتنے ہندو اور اتنے مسلمان ہلاک ہوئے کہ ان کا شمار ممکن نہ تھا۔ جلی ہوئی انسانی لاشوں کو گاڑیوں میں بھر بھر کر دریا میں بہا دیا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان میت کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہت سے لوگ آگ کے خوفناک شعلوں سے محفوظ رہنے کے لیے قلعے کی فصیل پر چڑھ گئے تھے لیکن بھڑکتی ہوئی آگ نے پیچھا نہ چھوڑا، وہاں بھی انھیں جا پکڑا۔ بہت سی عورتیں اور مرد فصیل پر سے دوسری طرف کود گئے، بہت سے گر کر مر گئے، جو بچ رہے، وہ معذور اور اپاہج ہو گئے۔ آگ بجھانے کے لیے لوگ جس قدر پانی ڈالتے تھے، اس کے شعلے اور بلند ہو جاتے تھے۔ گویا پانی بھی تیل کا کام کر رہا تھا۔

بدایونی مزید لکھتے ہیں :

میں نے اس آتش زدگی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بلکہ اس کی پیش میرے کانوں تک پہنچ چکی تھی ۔ اس حادثے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ دوآبہ کا ایک مجذوب بدایوں آیا۔ میں اُسے اپنے گھر لے آیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ تنہائی میں اس نے مجھ سے کہا:

"اس شہر سے نکل جاؤ"

میں نے پوچھا۔ "کیوں۔؟"

مجذوب نے جواب دیا۔ "یہاں قدرت ایک کھیل کھیلنے والی ہے"

وہ عجب رند و مست معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا۔ لیکن اس نے غلط نہیں کہا تھا۔

چہ پرسی از بداؤں وز احوالِ پریشانش — کہ آیاتِ عذاب النار نازل گشتہ در شانش [۱۴۸]

ترکِ ملازمت

آٹھ برس کی رفاقت کے بعد ۹۸۱ھ کو بدایونی کا اپنے دوست اور دینی بھائی امیر

---

[۱۴۸] منتخب التواریخ — ج ۲، ص ۱۳۸، ۱۳۹

حسین خاں سے بگاڑ پیدا ہو گیا اور بدایونی اس کی ملازمت ترک کر کے بدایوں چلے گئے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس سے بگاڑ یا اختلاف کی اصل وجہ کیا تھی۔ حسین خاں سیدھا سادا سپاہی اور مخلص مسلمان تھا۔ آقائی و ماتحتی کے تصوّر کو ذہن میں نہ لاتا تھا۔ اپنے مقام و مرتبہ کی پروا کیے بغیر بدایوں گیا اور بدایونی کی والدہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بدایونی سے معذرت کی اور ماں سے سفارش کا طالب ہوا۔ ہر چند کوشش کی کہ وہ واپس چلیں مگر نہ مانے اور اکبر کے شاہی دربار میں جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

اکبر کا دربار اس زمانے میں اصحابِ علم اور اربابِ کمال کا مرکز تھا۔ خود بادشاہ اس متاعِ گراں بہا کا بہت قدر دان تھا اور علما و فضلا کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ لیکن بعض اصحابِ علم (مثلاً حاجی ابراہیم سرہندی وغیرہ) کا جو مجادلہ و مباحثہ میں بہت بے باک ہو گئے تھے، زور بھی توڑنا چاہتا تھا۔

دربارِ اکبری میں

بدایونی نے جب اکبر بادشاہ کے دربار میں جانے کا پختہ ارادہ کر لیا تو ماہِ ذی الحجہ کے اواخر میں ۹۸۱ھ کو بدایوں سے آگرہ پہنچے۔ وہاں جمال خاں قورچی اور حکیم عین الملک سے ملاقات ہوئی، اور انھی کے ذریعے دربارِ شاہی میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔

حکیم عین الملک بہت بڑے طبیب اور جالینوسِ وقت تھے۔ شیریں کلام اور خوش اخلاق تھے۔ امراضِ چشم میں اپنے دَور کے بے نظیر معالج تھے۔ اچھے شاعر تھے اور دوائی تخلص کرتے تھے۔ اسی بنا پر انھیں حکیم دوائی بھی کہا جاتا تھا۔ علامہ جلال الدین محمد دوانی کی اولاد سے تھے۔ بادشاہ کے مصاحب و ندیم تھے اور بادشاہ ان کی قدر کرتا تھا — ملّا عبدالقادر بدایونی کے علم و مطالعہ کی وسعتوں سے خوب آگاہ تھے۔ ۲۷ ذی الحجہ ۱۰۰۳ھ کو فوت ہوئے۔ اسی طرح جمال خاں قورچی اکبر کے مصاحبین میں سے تھا اور پنج صدی عہدے دار تھا۔ بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخیل تھا، خوش مزاج اور ظریف الطبع تھا۔ وسیع القلب اور مخلص مسلمان تھا۔ بدایونی کی اقتدا میں نمازیں پڑھتا رہا تھا اور ان کے اسلوبِ قرأت سے بہت متاثر تھا۔ ان کی خوش الحانی کی تعریف کرتا تھا۔ ان کی علمی تقریریں

کئی دفعہ سن چکا تھا اور ان کے طرزِ بیان کا مداح تھا۔ اس نے ۹۸۲ھ کو وفات پائی۔

ان حضرات نے بدایونی کو بادشاہ کے حضور پیش کیا اور امامتِ نماز پر تقرر کی سفارش کی۔ چنانچہ بادشاہ نے بدایونی کو دربارِ شاہی سے منسلک کر لیا۔ بلیستی کا منصب ملا اور فرائض امامت سپرد ہوئے۔ ہفتے کے سات دنوں میں سات امام نماز پڑھاتے تھے۔ ہر امام کے ذمے ایک دن کی امامت تھی۔ بدایونی کو بدھ کے روز کی امامت سونپی گئی۔

بدایونی رقم طراز ہیں:

اسی سال بادشاہ نے میرے خوش آواز ہونے کی وجہ سے، چہار شنبہ کے دن کی امامت میرے سپرد فرمائی اور مجھے سات اماموں میں داخل کیا، اور خواجہ دولت ناظر کو مقرر فرمایا کہ وہ اس دن اور رات میں پانچوں وقت حاضری کے لیے اُسے یاد کرائے۔

اس زمانے میں دربارِ اکبری میں علما کو کس عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، علم کو کیا وقعت حاصل تھی اور خود علما کا اپنا کیا انداز تھا۔ اس کے بارے میں خود بدایونی کے الفاظ کا ترجمہ پڑھیے:

ان دنوں علم کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ پہلی ہی حاضری میں بادشاہ سے مخاطبت کا اعزاز حاصل ہوا، اور ہم نشینوں میں داخل کر لیا گیا۔ بادشاہی مجلس کے علما کا یہ حال تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی علمیت کا نقارہ بجانے کی فکر میں رہتے تھے، کسی دوسرے کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہ دیتے تھے۔ بلکہ بحث مباحثہ کر کے اس کو نیچا دکھانے اور خود سر بلند ہونے کی تدبیروں میں لگے رہتے تھے۔ میری جوانی کا عالم تھا۔ اللہ کی عنایتِ خاص سے قوتِ طبع، ذکاوتِ فکر اور فہم و جرأت کے تمام سامان مہیا تھے، اس لیے جلد ہی ان علما میں سے اکثر پر چھا گیا۔

بدایونی کے فارسی الفاظ یہ ہیں:

وبعنایتِ الٰہی وبقوتِ طبع وذکائے فہم ودلیری کہ لازمۂ عہدِ شباب بود، بر اکثرے غالب می آید[۱۴۹]

---

[۱۴۹] منتخب التواریخ۔ ج ۲، ص ۱۷۲

"جب میں دربار میں حاضر ہوا تھا تو بادشاہ نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا کہ بدایوں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کا مزاج درست کر دے گا۔ بادشاہ چاہتا تھا کہ حاجی ابراہیم کو میدانِ علم میں شکست دی جائے۔

در وقتِ ملازمت تعریف کردہ بودند کہ ایں فاضل بدایونی سرکوب حاجی ابراہیم سرہندی است[۱۵۰]

چنانچہ میں نے حاجی ابراہیم سرہندی پر پے در پے سخت وار کیے اور اس کو بُری طرح ہدفِ تنقید ٹھہرایا۔ میرا یہ انداز بادشاہ کو بہت پسند آیا اور مجھے اس کی برابر داد ملتی رہی۔۔۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی کے ہاں میری آمد و رفت نہ تھی۔ اس لیے وہ مجھ سے کچھ کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ مناظرے اور مباحثے کے وقت وہ میرے فریقِ مخالف کی حمایت کرتے تھے۔۔۔ لیکن بعد میں شیخ کی یہ پرخاش اور کبیدگی ختم ہوگئی، اور ہمارے باہمی تعلقات بڑے استوار ہوگئے۔ ان ہی دنوں ابوالفضل بھی کہ اس کے علم و عقل کا ستارہ اوج پر تھا، دربارِ اکبری میں باریاب ہوا، اور بڑے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا[۱۵۱]

دربارِ اکبری میں جاتے ہی بدایونی نے علمائے دربار سے بحث و مجادلے کا سلسلہ شروع کر دیا اور اپنی حدتِ فکر، تیزیٔ طبع اور حاضر جوابی کی وجہ سے بہت جلد بادشاہ اور علما و امرا سے اپنے علم کا لوہا منوالیا، اور ان کا شمار اونچے مرتبے کے اہلِ علم میں ہونے لگا۔ بادشاہ تو ان کے علم و فضل اور فراوانیٔ معلومات سے اس درجہ متاثر ہوا کہ ان کے شاملِ دربار ہونے کے بعد جب وہ پہلے سفر پر روانہ ہونے لگا تو ان کو اپنے ہمراہ کیا اور علما کی اس جماعت میں شریک کیا جو سفر میں بادشاہ کے ہم رکاب رہتی تھی۔

دورانِ سفر میں جب بادشاہ کے سامنے بدایونی کے فکر و نظر کی مزید تہیں کھلیں اور اس کے علم و ادراک کی وسعتوں کا اندازہ ہوا تو اس نے ان کو سنسکرت کی کتاب سنگھاسن بتیسی کو فارسی میں منتقل کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ آج ہی یہ کام شروع کر دو اور اس کا ایک ورق لکھ کر دکھاؤ۔ چنانچہ بادشاہ کے اس ارشاد پر عمل کیا گیا۔ اس نے ترجمے کا ایک صفحہ دکھایا

---

[۱۵۰] منتخب التواریخ۔ ج ۲، ص ۱۷۲، ۱۷۳

[۱۵۱] ایضاً

تو نہایت خوش ہوا۔ بدایونی کے اس کام کی بہت تعریف کی اور ان کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ سنگھاسن بتیی کے ترجمے کی تفصیل آئندہ آ رہی ہے۔

جب تک بادشاہ نے اپنے آپ کو دائرۂ اسلام میں محصور رکھا اور وہ امورِ دینی کا پابند رہا، بدایونی کے اس سے اور اس کے بدایونی سے خوب مراسم رہے، لیکن جب سنِ جلوس کے تئیسویں سال کے اواخر (۹۸۵ھ) اور چوبیسویں سال کے اوائل (۹۸۶ھ) میں اس نے قبائے مذہب اوتار کر بے دینی کے دریا میں غوطہ زنی شروع کی اور فکر و عمل کے جادۂ مستقیم سے انحراف کر کے غیر دینی رجحانات کو مرکزِ توجہ ٹھہرالیا تو بدایونی اس سے کبیدہ خاطر ہو گئے اور دونوں ایک دوسرے سے ذہنی طور پر دُور دُور رہنے لگے۔ مگر سلسلۂ ملازمت اور تعلقِ دربار قائم رہا۔

معرکۂ جہاد میں شرکت

۹۸۴ھ کو بدایونی نے معرکۂ جہاد میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔ اس کی تفصیل وہ خود ہی لکھتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۹۸۴ھ میں اکبر بادشاہ اجمیر میں تھا۔ بدایونی بھی شریکِ سفر تھے۔ بادشاہ نے مان سنگھ کے زیرِ کمان ایک بڑا لشکر رانا کیکا سے لڑائی کی غرض سے کوکندہ اور کونبھل میر کی مہم پر روانہ کیا۔ کئی بہادر سردار اور درباری امیر فوج میں شامل تھے، جن کے خیمے اجمیر سے تین کوس تک نصب تھے۔ بدایونی نے فوج کی شان و شوکت دیکھی تو بے اختیار ہو گئے اور دل میں جذبۂ جہاد نے جوش مارا۔ سیدھے صدر الصدور شیخ عبد النبی گنگوہی کے پاس پہنچے اور جہاد پر جانے کے لیے بادشاہ سے رخصت لینے کی درخواست کی۔ مگر اس ذریعے سے بات بنتی دکھائی نہ دی تو اپنے ہم سبق و ہم درس میر غیاث الدین سے ملے، جس کا لقب نقیب خاں تھا۔ یہ شخص بڑا نیک تھا اور بدایونی کا دوست ــ! اس نے کہا:

اگر ہندو سردارِ ایں لشکر نمی بود نخست کسے کہ رخصت می گرفت من بودم۔

اگر امیرِ لشکر ہندو نہ ہوتا تو میں خود اس مہم میں جانے کے لیے بادشاہ سے اجازت طلب کرتا۔

نقیب خاں کی بات بظاہر وزنی معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ سپہ سالارِ لشکر مان سنگھ تھا۔ مگر بدایونی کا جواب بھی نہایت معقول ہے۔ فرماتے ہیں :

ماسر دارِ خود بندگانِ حضرت رامی دانیم برمان سنگھ وغیرہ چہ کار داریم کہ کار بہ تصحیح نیت است۔

میں نے نقیب خاں سے کہا، ہم اپنا امیر اکبر بادشاہ کو مانتے ہیں، جو مسلمان ہے اور کفار کے مقابلے میں فوج بھیج رہا ہے۔ مان سنگھ وغیرہ سے ہمیں کیا غرض ہے۔ اصل شی نیت ہے، یہ درست ہونی چاہیے۔

بہرحال بدایونی اور نقیب خاں بادشاہ کے پاس پہنچے۔ اس وقت وہ شیخ معین الدین اجمیری کے مرقد کے اونچے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ نقیب خاں نے بدایونی کے شریکِ جہاد ہونے کے لیے عرض کیا اور سفارش کی کہ انھیں اس نیک کام میں شمولیت کی اجازت دی جائے۔

بادشاہ نے کہا: فرمودند کہ او بعہدۂ امامت متعین است چوں می رود؟

یہ تو امامتِ نماز کے منصب پر فائز ہیں۔ جنگ میں کیوں کر جا سکتے ہیں؟

اس نے عرض کیا: "جہاد کی آرزو رکھتے ہیں۔"

یہ سن کر بادشاہ نے بدایونی سے دریافت کیا: "بہت جی چاہتا ہے؟"

بدایونی نے جواب دیا: "جی ہاں۔ بہت چاہتا ہے۔"

فرمایا: "کیوں۔؟"

عرض کیا: "اپنے عملوں کی سیاہی کو جاں نثاری کے ذریعے دھونا چاہتا ہوں۔"

ارشاد ہوا: ان شاء اللہ تعالیٰ خبر فتح خواہی آور۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ فتح کی بشارت لے کر آؤ گے۔")

یہ کہہ کر بادشاہ نے مراقبے میں سر جھکا کر پوری توجہ سے رخصت کی فاتحہ پڑھی (دعا کی)۔

بدایونی لکھتے ہیں کہ میں نے چبوترے پر ہاتھ بڑھا کر پا بوسی کا ارادہ کیا، مگر بادشاہ نے پیر اوپر کھینچ لیے۔ وہ اجازت لے کر دیوان خانے سے باہر نکلے تو بادشاہ نے پھر بلایا، دونوں ہاتھ

بھر کر اشرفیاں عطا کیں اور خدا حافظ کہا۔ اشرفیاں گنیں تو پینسٹھ[۶۵] تھیں۔

بعد ازاں بدایونی، جہاد پر جاتے وقت صدر الصدور شیخ عبدالنبی کی خدمت میں گئے۔ اب وہ بھی مہربان تھے۔ تاکید سے فرمایا۔ "میدانِ جنگ میں دشمن کی فوج سے مقابلہ ہو تو مجھے دعائے خیر سے یاد رکھنا، حدیث نبوی کی رُو سے یہ قبولیتِ دعا کا وقت ہوتا ہے۔ بھولنا نہیں[۱۵۲]" بدایونی نے "بہت اچھا" کہہ کر شیخ سے دعا کی درخواست کی اور گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ بدایونی کا یہ سفرِ جہاد بڑا مبارک ثابت ہوا، اور وہی بادشاہ کے پاس فتح کی خوش خبری لائے۔

اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح اور کافروں کو ہزیمت ہوئی۔ رانا بھاگ گیا۔ اس کے ایک قد آور ہاتھی کا نام "رام پرشاد" تھا۔ یہ ہاتھی کئی دفعہ بادشاہ نے رانا سے مانگا تھا، مگر اس نے نہیں دیا تھا۔ یہ ہاتھی بھی شاہی فوج کے قبضے میں آیا — امرائے فوج نے باہم مشورے سے طے کیا کہ فتح کی خوش خبری کے ساتھ یہ ہاتھی بھی بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

فتح کی خوش خبری بدایونی کے ذریعے

اب سوال یہ درپیش تھا کہ یہ اہم کام کس کے سپرد کیا جائے جو فتح کی بشارت دینے بادشاہ کے حضور جائے۔ آصف خاں نے ملا عبدالقادر بدایونی کا نام پیش کیا اور کہا کہ یہ فقط ثواب کی غرض سے شاملِ جہاد ہوئے ہیں، انھی کو ہاتھی اور فتح نامہ کے ساتھ بادشاہ کے پاس بھیجنا چاہیے — یہاں بدایونی لکھتے ہیں کہ آصف خاں کی اس سفارش

---

[۱۵۲] اس حدیث کی طرف اشارہ ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: عن سهل بن سعد رضی اللہ عنه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم۔ ثنتان لا یردان الدعاء عند النداء و عند الباس حین یلحم بعضهم بعضا۔ (مشکوٰۃ، باب فضل الاذان واجابۃ المؤذن فصل ثانی۔)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو وقت کی دعا بارگاہِ خداوندی سے مسترد نہیں کی جاتی۔ ایک اذان کے وقت کی اور دوسری جہاد کے وقت کی، جب فوجیں برسرِ پیکار ہوں۔

پر سپہ سالارِ فوج مان سنگھ نے کہا ”ابھی تو بہت سے اہم امور سر انجام دینا باقی ہیں، ان کو لشکر میں رہ کر ہر معرکے میں فوجیوں کی امامت کرنی چاہیے۔“ بدایونی نے جواب دیا۔ ”یہاں کی امامت کا اب وقت نہیں رہا۔ مجھے یہاں سے جاکر خود بادشاہ کی امامت کرنی ہے۔“ مان سنگھ اس جواب پر مسکرایا اور بہت خوش ہوا۔ اس نے تین سو سواروں کی حفاظت میں مذکورہ ہاتھی اور فتح نامہ دے کر اعزاز کے ساتھ بدایونی کو رخصت کیا اور خود بھی سیر و شکار اور مختلف مقامات پر حفاظتی چوکیاں اور تھانے قائم کرنے کے لیے بیس کوس تک ساتھ گیا۔

بدایونی نہایت تکریم کے ساتھ لشکر گاہ سے چلے اور مان سنگھ کے وطن انبیر کے راستے جو جے پور میں واقع ہے، فتح کا اعلان کرتے اور خود اپنے مولد قصبہ ٹوڈا سے ہوتے ہوئے دارالخلافہ فتح پور سیکری پہنچے۔ راستے میں جہاں جہاں سے بدایونی کا قافلہ گزرتا، لوگ بڑے احترام سے استقبال کو آتے، پورے اعزاز سے ٹھہراتے اور عزت سے رخصت کرتے۔ انبیر سے پانچ کوس کے فاصلے پر تھے کہ ہاتھی دلدل میں پھنس گیا اور بڑی مشکل سے دیہات کے لوگوں نے مل کر باہر نکالا — یہ واقعہ بدایونی نے مسرت انگیز لہجے میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

انبیر میں بدایونی کا یہ قافلہ تین چار روز مقیم رہا۔ وہاں سے قصبہ ٹوڈا کے راستے جو بدایونی کی جائے پیدائش ہے، بساور گئے، جہاں ان کا پورا خاندان آباد تھا۔ فتح پور سیکری پہنچے تو مان سنگھ کے والد راجہ بھگوان داس کی وساطت سے شاہی محل میں گئے۔ بادشاہ کو کورنش بجا لاکر امرائے لشکر کے عریضے اور ہاتھی پیش کیا۔ بادشاہ نے بدایونی سے کہا:

”امرا نے تمہاری تعریف لکھی ہے۔ سچ بتاؤ، کس فوج میں تھے اور کیا کارنامہ انجام دیا؟“

بدایونی نے جواب دیا: ”یہ ناچیز بادشاہوں کے حضور لرزاں و ترساں سچ ہی بولنے کا عادی ہے۔ بھلا کذب بیانی کس طرح کر سکتا ہے؟“

اس کے بعد پورا واقعہ من و عن بیان کیا۔

بادشاہ نے دریافت کیا۔ ”تم بلا ہتھیار تھے، یا مسلح؟“

کہا۔ "زرہ پہنے ہوئے اور تلوار بدست تھا۔"

فرمایا۔ "یہ چیزیں کہاں سے ملیں؟"

عرض کیا۔ "سید عبداللہ خاں سے!"

بدایونی لکھتے ہیں، بادشاہ نے میری بڑی تعریف اور تحسین کی۔ ان دنوں شہنشاہ کے سامنے ہمیشہ اشرفیوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ دونوں ہاتھ میں اشرفیاں بھر کر انھیں عنایت کیں۔ گنی تو چھیانوے ۹۶ تھیں۔

پھر پوچھا۔ "شیخ عبدالنبی سے مل چکے؟"

کہا۔ "راستے کی گرد و غبار جھاڑتے ہوئے، سیدھا خدمتِ عالی میں حاضر ہوا ہوں۔ اس حالت میں ان سے کیسے مل سکتا تھا؟"

بعد ازاں بادشاہ نے ایک عمدہ قسم کا نخودی دوشالہ بدایونی کو دیا کہ اسے لے جاؤ اور شیخ سے ملاقات کرو، اور ان سے کہو کہ یہ دوشالہ ہم نے خاص آپ کے لیے اپنے کارخانے میں تیار کرایا ہے، اسے زیب تن کیجیے ـــــ بدایونی دوشالہ لے کر شیخ عبدالنبی کے پاس گئے اور جو کچھ بادشاہ نے کہا تھا، بتایا۔ شیخ بہت خوش ہوتے اور بدایونی سے پوچھا:

"آپ کو رخصت کرتے وقت میں نے کہا تھا کہ دشمن سے مقابلے کے وقت مجھے دعا میں یاد رکھنا۔"

بدایونی نے جواب دیا۔ "اس وقت میں نے یہ دعا پڑھی تھی ـــــ اللّٰھُمَّ اغفر للمؤمنین والمومنات، وانصر من نصر دین محمد واخذل من خذل دین محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام۔"

شیخ نے کہا یہ بھی کافی ہے۔

بدایونی کے الفاظ یہ ہیں:

شیخ خوش حال شد و پرسید کہ در وقتِ وداع گفتہ بودم کہ ہنگامِ التقائے صفین بدعائے مارا یاد آوری ـــــ گفتم دعا اللھم اغفر للمومنین والمومنات۔

وانصر من نصر دین محمد و اخذل من خذل دین محمد علیہ الصلوۃ والسلام
خود خواندہ بودیم۔ گفت این ہم کافی است[۱۵۳]

حق گوئی و بے باکی

بدایونی حق گو اور بے باک عالمِ دین تھے۔ سچ کہنے میں حتی الامکان کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ اس ضمن میں دو واقعے قابلِ ذکر ہیں، جن سے ان کے علم و فضل کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مرزا سلیمان جو تیموری خاندان کا ایک اونچے درجے کا رکن تھا، فتح پور میں قیام پذیر ہوا۔ وہ نیک آدمی تھا اور اکبر اس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ رات کو عبادت خانے بھی جاتا تھا اور علماء و مشائخ کی محفل میں بیٹھتا تھا۔ عام طور سے اس پر وجد و حال کی کیفیت طاری رہتی تھی اور اونچی اونچی آواز میں باتیں کرتا تھا۔ نماز باجماعت کا پابند تھا۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ ایک روز میں نے نماز کی امامت کے بعد صرف دعا پڑھی، فاتحہ نہیں پڑھی۔ مرزا نے اعتراض کیا کہ "آپ نے فاتحہ کیوں نہیں پڑھی؟" میں نے جواب دیا "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں نماز کے بعد فاتحہ نہیں پڑھی جاتی تھی، بلکہ بعض روایات میں تو اس کو مکروہ بھی کہا گیا ہے۔"

مرزا نے کہا:

مگر در ولایت علم و علما نہ بودند کہ می خوانند۔

کیا ولایت (ایران) میں علم نہیں ہے یا علما نہیں ہیں کہ وہاں فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔

میں نے کہا:

گفتم کہ مارا بکتاب کار است نہ بہ تقلید۔

---

[۱۵۳] عربی کی اس دعا کا ترجمہ یہ ہے: اے اللہ! مومن مردوں اور مومن عورتوں کی مغفرت فرما، اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدد کرتا ہے، اس کی مدد فرما۔ اور جو اس کے دین کی توہین کرتا ہے، اس کو ذلیل کر۔

[۱۵۴] تفصیلات کے لیے دیکھیے: منتخب التواریخ – ج ۲، ص ۲۲۷ تا ۲۳۷

ہمارا تعلق تو اللہ کی کتاب سے ہے، تقلید سے نہیں ہے۔

بادشاہ بھی اس وقت موجود تھا۔ اس نے کہا "بحث نہ کرو، آئندہ پڑھ لیا کرو۔"

بدایونی کہتے ہیں، میں نے بادشاہ کا ارشاد مان لیا، لیکن فاتحہ پڑھنے کے مکروہ ہونے کی جو روایت مجھے معلوم تھی، وہ ان کے سامنے بیان ضرور کر دی[۱۵۵]

سوال یہ ہے کہ "فاتحہ" کیا شی ہے؟ اس کے متعلق کچھ پتا نہیں چلا کہ یہ کیا ہے۔ کسی دور میں کچھ رسوم مروج ہو جاتی ہیں، اور پھر جب وہ ختم ہو جاتی ہیں تو ان کی صحیح تعریف کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بدایونی نماز کے بعد وہی ادعیہ پڑھنے کے قائل تھے جنھیں ادعیہ ماثورہ کہا جاتا ہے اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ مرزا سلیمان ان کے علاوہ کچھ اور بھی پڑھنے کے قائل تھے اور اسے فاتحہ سے تعبیر کرتے تھے، کیوں علمائے روم میں اُسے فاتحہ ہی کہا جاتا تھا۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اس "فاتحہ" کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

دوسرا واقعہ ایک برہمن کے قتل کے بعد اس دور میں پیش آیا جب بادشاہ اسلام اور احکام اسلام سے دُور دُور رہنے لگا تھا۔ اس سلسلے میں بادشاہ نے علما کی موجودگی میں بدایونی سے شاتمِ رسول کے بارے میں استفسار کیا۔ انھوں نے نہایت جرأت سے دربار میں مسئلے کی وضاحت کی — اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قاضیِ متھرا قاضی عبدالرحیم نے صدر الصدور شیخ عبدالنبی کے پاس یہ استغاثہ بھیجا کہ "یہاں کے مسلمان ایک مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے، اس کے لیے انھوں نے جگہ کا انتخاب بھی کر لیا تھا اور عمارتی سامان بھی وہاں رکھ لیا تھا، لیکن یہاں کے ایک سرکش اور سرمایہ دار برہمن نے وہ تمام عمارتی سامان خود اٹھا لیا اور مسجد کی جگہ پر اسی سامان سے ایک بت خانہ کی تعمیر شروع کر دی۔ میں نے جب اس سے باز پرس کی تو اس نے لوگوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب و شتم کیا، اسلام کی اہانت کی اور مسلمانوں کے لیے سخت توہین آمیز الفاظ استعمال کیے۔"

---

[۱۵۵] منتخب التواریخ — ج ۲، ص ۲۱۶

ظاہر ہے، یہ معاملہ انتہائی سنگین نوعیت کا تھا اور ملک کے صدر الصدور کی حیثیت سے شیخ عبد النبی کے لیے اس کی تحقیق کرنا ضروری تھا، چنانچہ شیخ نے اس برہمن کو طلب کیا، مگر وہ حاضر نہ ہوا، بالآخر معاملہ بادشاہ تک پہنچا تو اس نے دربار کی دو شخصیتوں — ابوالفضل اور بیربر — کو متھرا بھیجا۔ انھوں نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ قاضی عبد الرحیم کا بیان صحیح ہے۔ واپس آکر انھوں نے بادشاہ کو بتایا کہ متھرا کے اس برہمن نے مسجد کی جگہ بت خانہ بھی تعمیر کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب وشتم بھی کیا ہے، اسلام کے بارے میں نازیبا الفاظ بھی استعمال کیے ہیں اور مسلمانوں کی توہین بھی کی ہے۔ انھوں نے اس ہندو کو بھی بادشاہ کے پیش کر دیا — اس برہمن کو تو جیل میں ڈال دیا گیا، مگر یہ سوال بڑی اہمیت اختیار کر گیا کہ اس جرم کی اس کو سزا کیا دی جائے؟ اس بارے میں علما کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا اور دوسرے نے تشہیر اور جرمانے وغیرہ پر زور دیا — بحث زیادہ طول پکڑ گئی تو شیخ عبد النبی نے بادشاہ سے اس کے قتل کی اجازت طلب کی اور اس پر اصرار کیا۔ بادشاہ نے صاف لفظوں میں تو اجازت نہ دی البتہ یہ کہا کہ شرعی سزاؤں کا معاملہ آپ سے متعلق ہے، ہم سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ شیخ نے مختلف مواقع پر بادشاہ سے کئی دفعہ اس کے قتل کے بارے میں کہا، مگر وہ برابر یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ شرعی سزاؤں کے سلسلے میں ہم دخل نہیں دینا چاہتے، اس کا تعلق آپ کی ذات اور علم سے ہے۔ برہمن اس جھگڑے میں مدتوں قید میں پڑا رہا۔ شاہی حرم میں ہندو عورتیں بھی تھیں، انھیں واقعہ کا پتا چلا تو وہ بادشاہ سے برہمن کی رہائی کے لیے سفارش کرنے لگیں۔ بادشاہ سب کچھ سنتا لیکن خاموش رہتا، کیونکہ اس کو شیخ کا بہت لحاظ تھا۔ نہ وہ صاف لفظوں میں اس کے قتل کی اجازت دیتا تھا اور نہ رہائی کا حکم جاری کرتا تھا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد شیخ نے بادشاہ سے پھر برہمن کے قتل کے لیے کہا تو اس نے جواب دیا کہ ہم تو آپ سے کہہ چکے ہیں کہ جو مناسب سمجھتے ہیں کریں، ہم سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بادشاہ کا یہ جواب سن کر شیخ نے برہمن کے قتل کا حکم دے دیا۔ مگر جب اسے قتل کر دیا گیا تو بادشاہ غضب ناک ہو گیا۔ ادھر شاہی حرم کی ہندو رانیوں اور دربار کے ہندو مصاحبوں

نے ہنگامہ بپا کر دیا اور بادشاہ کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ آپ کی نرمی اور مہربانی سے یہ ملّا اس قدر جری اور بے باک ہوگئے ہیں کہ آپ کے حکم اور منظوری کے بغیر ہی لوگوں کو قتل کرنے لگے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب بادشاہ مذہب سے دُور ہوتا جا رہا تھا اور علما کے خلاف اس کی نفرت کے جذبات روز بروز تیز ہوتے جا رہے تھے۔ اس واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور معاملہ اس کی قوتِ برداشت سے باہر ہوگیا۔ چنانچہ ایک روز علما کی مجلس میں اس نے یہ مسئلہ پیش کیا اور دربار کے نئے نئے مفتیوں سے اس کے بارے میں رائے طلب کی۔ ہر ایک نے اپنی فکری اور ذہنی بساط کے مطابق اس اہم بحث میں حصّہ لیا۔ کسی نے کہا، اس مقدمے میں نہ تو گواہوں پر کماحقہٗ جرح کی گئی، نہ ان کی پوری طرح تعدیل کی گئی، اور مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کیے بغیر قتل کا حکم جاری کر دیا گیا۔ کسی نے کہا، شیخ عبدالنبی اپنے آپ کو امام ابوحنیفہ کی اولاد میں شمار کرتے ہیں، حالانکہ امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے ماتحت کافر اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بدزبانی کریں تو ان کی یہ حرکت نقضِ عہد اور ابرائے ذمہ کا باعث نہیں بن سکتی۔ یہ بات حنفی فقہ کی کتابوں میں وضاحت سے موجود ہے۔ حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ شیخ کو اپنے جدِّامجد کے مذہب سے اختلاف کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ غرض مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کرنا شروع کر دیں۔

ملّا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں، اس مجلس میں، جس میں یہ گفتگو ہو رہی تھی، میں بھی موجود تھا اور بادشاہ سے کچھ دُور بیٹھا تھا۔ دورانِ بحث میں اچانک دُور سے بادشاہ کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ میری طرف متوجہ ہوا، میرا نام لے کر بلایا اور کہا:

فرمودند پیش بیا

آگے آؤ۔

میں قریب گیا تو پوچھا۔

”کیا تم نے بھی یہ مسئلہ سنا ہے کہ اگر ایک شخص کے قتل پر ننانوے (۹۹) روایتیں ہوں اور رہائی کے لیے صرف ایک روایت ملتی ہو تو مفتی کو چاہیے کہ اس ایک

روایت کو ترجیح دے۔[۱۵۶]

میں نے کہا۔ "ہاں ایسا ہی ہے، جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

ان الحدود والعقوبات تندرء بالشبہات۔ "میں نے اس کا مطلب فارسی میں سمجھایا (کہ شبہات حدود اور سزاؤں میں کمی کر دیتے ہیں)

میری یہ بات سن کر بادشاہ نے افسوس کے ساتھ پوچھا: "کیا شیخ عبدالنبی کو اس مسئلے کا علم نہ تھا۔ اس نے بیچارے برہمن کو قتل کرا دیا۔ آخر ایسا کیوں ہوا۔"[۱۵۷]

میں نے کہا۔ "شیخ خود بڑے عالم ہیں، وہ ضرور جانتے ہوں گے۔ اس روایت کے باوجود اگر انھوں نے حکم دیا ہے تو ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔"

بادشاہ نے سوال کیا "کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔؟"

میں نے جواب دیا۔ "فتنہ و فساد کی روک تھام اور عوام کی دلیری کا سدِ باب۔"

بدایونی لکھتے ہیں: میں نے اس سلسلے میں قاضی عیاض کی شفا کی ایک روایت جو میری نظر سے گزر چکی تھی، بیان کی۔ لیکن حاضرینِ مجلس میں سے بعض خبیث النفس لوگوں نے کہا۔

قاضی عیاض مالکی است، سخنِ او در دیارِ حنفی سند نیست۔

قاضی عیاض مالکی مسلک کے حامل ہیں۔ ان کی بات حنفی ملک میں سند نہیں ہو سکتی۔

ان کے اس اعتراض پر بادشاہ نے مجھ سے پوچھا: "تمھارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟" میں نے کہا: "وہ یقیناً مالکی ہیں، لیکن اگر کوئی محقق اور مفتی سیاسی مصلحت کی بنا پر ان کے فتوے پر عمل کرے تو شرعاً جائز ہے۔"

بدایونی کی یہ بات وہاں موضوع بحث بن گئی اور بحث خاصی طول پکڑ گئی۔ بادشاہ اس وقت بہت غصے میں تھا۔ بدایونی اس کے غصے کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

---

[۱۵۶] ایسی کوئی روایت ہمیں نہیں ملی، جس کے یہ الفاظ ہوں یا اس سے ملتے جلتے ہوں۔

[۱۵۷] فقہ کی کتابوں میں عام طور پر یہی الفاظ ہیں، مگر کتبِ حدیث میں یہ الفاظ ہیں: (ادرءوا الحدود بالشبہات۔ (شبہات پیدا ہو جائیں تو حدود میں ان سے کمی کرو)۔

موئے سُبلتِ شہنشاہی را دراں وقت مردم می دیدند کہ چوں موئے شیر برخاستہ بود، واز عقب سرمرا مانع از بحث می آمدند۔

یعنی لوگوں نے دیکھا کہ شہنشاہ کی مونچھوں کے بال شیر کے بالوں کی طرح کھڑے ہوگئے تھے — اور حاضرینِ مجلس پیچھے سے میرا دامن کھینچ کر مجھے بحث سے روک رہے تھے۔

اتنے میں بادشاہ نے جھلّا کر مجھ سے کہا:

فرمودند، ایں نامعقول است کہ می گوئی۔

تم یہ نامعقول باتیں کر رہے ہو

اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں:

"میں فوراً تسلیم بجالایا اور واپس آکر اپنی صف میں کھڑا ہوگیا۔ اس دن سے میں نے بادشاہ کی مجلس میں آگے بڑھنا اور کسی معاملے میں سبقت کرنا چھوڑ دیا اور بحث ومباحثہ سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ بس کبھی کبھی کورنش بجالاتا اور اپنے کام مشغول ہوجاتا[۱۵۸]"

متعہ کی بحث

اکبر کے اکیسویں سالِ جلوس (۹۸۳ھ) کے بعض واقعات سے، جو خود بدایونی نے منتخب التواریخ میں تحریر کیے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کچھ مسائل میں اپنے علم وتحقیق کے زور سے بادشاہ کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ اس زمانے میں اکبر نے سب سے پہلے یہ مسئلہ پوچھا: "کتنی آزاد عورتوں کو نکاح میں رکھنا جائز ہے؟"

علما نے جواب دیا: "چار سے زائد عورتوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا منع ہے۔"

اکبر نے کہا: "ہم تو جوانی میں اس کے پابند نہیں رہے، جتنی عورتوں کو چاہتے تھے، نکاح میں لے لیتے تھے، خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام، اب اس کی تلافی کیسے ہوسکتی ہے؟"

اس سلسلے میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں بیان کیں۔

---

۱۵۸ منتخب التواریخ۔ ج ۳، ص ۷۹ تا ۸۳ — شاتمِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سزا کے بارے میں مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو: فقہائے ہند۔ ج ۳، ص ۲۸۲ تا ۲۸۸

اکبر نے پھر کہا: "ہم نے شیخ عبدالنبی سے سنا ہے کہ ایک مجتہد کے نزدیک تو نو عورتوں سے بھی نکاح کیا جا سکتا ہے۔"

علما نے کہا: "ایک مجتہد ابن ابی لیلیٰ کا یہ رجحان ہے۔ بعض نے آیتِ مبارکہ: فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ [۱۵۹] کے ظاہری مفہوم پر تو اٹھارہ عورتوں تک کو جائز ٹھہرا دیا ہے۔ لیکن یہ تمام روایات مرجوح ہیں، ان پر عمل کرنا جائز نہیں۔"

بادشاہ نے شیخ عبدالنبی سے دریافت کرایا تو انھوں نے جواب دیا: "میں نے جو کچھ کہا تھا، اس سے کچھ اختلافات کا اظہار مقصود تھا، اس کے جواز کا میں نے فتویٰ نہیں دیا تھا۔"

شیخ عبدالنبی کا یہ جواب بادشاہ کو بڑا ناگوار گزرا، اور کہا: "اس طرح تو شیخ نے ہم سے منافقت کی، اس وقت تو کچھ اور کہا تھا۔ اب کچھ اور کہہ رہا ہے۔"

بس اسی وقت سے شیخ عبدالنبی کی طرف سے اکبر کا دل پھر گیا — بادشاہ کے اصرار کو دیکھ کر علما نے اختلافی روایات جمع کر کے آخر یہ فتویٰ دیا کہ:

"متعہ کی صورت میں جتنی عورتیں چاہیں، نکاح میں رکھنا مباح ہے۔"

بدایونی اس سے آگے لکھتے ہیں:

"اور یہ امام مالک کے مسلک میں جائز ہے۔ شیعہ تو اس لڑکے کو جو متعہ میں پیدا ہوا ہو، دوسرے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ حالانکہ اہلِ سنت کا یہ طریق نہیں ہے۔ غرض اس موضوع پر بڑی بحثیں ہوئیں۔ میر غیاث الدین نے (جو نقیب خاں کے لقب سے ملقب تھے) امام مالک کی کتاب موطا دکھائی اور بتایا کہ اس کی تو ایک حدیث میں صراحتاً متعہ کی ممانعت کی گئی ہے۔"

اس سے آگے متعہ کے جواز و عدمِ جواز کے بارے میں بدایونی کی پوری عبارت کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

---

[۱۵۹] یہ سورۂ النسا کی آیت نمبر ۳ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: جو عورتیں تمھیں پسند آئیں، ان میں سے تم دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر سکتے ہو۔

ایک رات انوپ تلاؤ کے حجرے میں بادشاہ کے پاس قاضی یعقوب، شیخ ابوالفضل، حاجی ابراہیم اور ایک دو اور عالم بیٹھے تھے۔ شیخ ابوالفضل نے علما کی مخالفت کرتے ہوئے وہ روایات جو اس کے والد — ملا مبارک — نے جوازِ متعہ کے بارے میں جمع کر کے دی تھیں، بیان کیں۔ بادشاہ نے مجھے (یعنی بدایونی کو) بھی بلایا اور پوچھا:

"تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو۔؟"

میں نے عرض کیا: "اس ضمن میں ان تمام مختلف روایات اور مسالکِ فقہی کا جھگڑا بس ایک بات پر ختم ہوجاتا ہے، اور وہ یہ کہ متعہ امام مالک اور علمائے شیعہ کے نزدیک بالاتفاق مباح ہے۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک حرام ہے۔ لیکن جب مالکی مذہب کا قاضی اس کا باضابطہ حکم جاری کر دے تو اسی وقت امام ابوحنیفہ کے مذہب میں بھی بالاتفاق مباح ہوجاتا ہے — بس یہی ایک پتے کی بات ہے، اس کے علاوہ محض قیل و قال اور بحث و جدال ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں — بادشاہ کو میری یہ بات بہت پسند آئی۔ مگر قاضی یعقوب نے مجھ سے بحث شروع کر دی اور بحث بہت طول پکڑ گئی۔ میں نے ان سے کہا۔ جو مسئلہ مختلف فیہ ہو، وہ قاضی کے حکم کے بعد متفقہ ہوجاتا ہے۔ اپنے اس دعوے پر میں نے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مسئلے کو اور بعض دوسری مثالوں کو بطور دلیل پیش کیا۔ میں نے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا قصہ بھی بیان کیا کہ جب وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں بغداد گئے تو انھوں نے شافعی مذہب کے مطابق امام کی اقتدا میں سورۂ فاتحہ پڑھی تھی۔ ان کے اس عمل کو علما نے ہدفِ طعن و تنقید ٹھہرایا تھا، مگر دہلی کے قاضیوں نے نہ صرف اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے موقف کی تائید کی، بلکہ اس کے مستحسن ہونے کا فتویٰ دیا تھا — جب میں نے یہ باتیں پوری وضاحت سے بیان کیں تو قاضی یعقوب کو اس کا قائل ہونا پڑا، اور بالآخر عاجز آکر بادشاہ سے کہا: "میں کیا کہوں، متعہ کا مباح ہونا مبارک ہو۔"

بادشاہ نے فرمایا: "اس مسئلے میں ہم قاضی حسین عرب مالکی کو قاضی بناتے ہیں، اور قاضی یعقوب کو آج سے معزول کرتے ہیں۔"

اسی وقت قاضی حسین کو قاضی بنایا گیا، اور اس نے اپنے مذہب کے مطابق متعہ کے جواز کا حکم دے دیا۔"

اس کے ساتھ ہی بدایونی لکھتے ہیں:

"اب تمام پرانے اور بوڑھے علما، صدر الصدور شیخ عبد النبی گنگوہی، مخدوم الملک شیخ عبد اللہ سلطان پوری، اور قاضی یعقوب تک کے لیے، یہ ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی، اور اسی روز سے ان کا زوال شروع ہو گیا —— اس واقعہ کے چند روز بعد اکبر نے مولانا جلال الدین ملتانی کو جو بہت بڑے عالم تھے اور جن کی مددِ معاش روک دی گئی تھی، آگرہ سے بلا کر تمام ممالکِ محروسہ کا قاضی مقرر کر دیا، اور قاضی یعقوب کو بنگال کے منصبِ قضاءت پر متعین کر دیا۔ اسی دن اختلافات کا دروازہ کھل گیا، یہاں تک کہ دین میں اجتہاد کی نوبت آگئی"[۱۶۰]

مسئلہ متعہ پر بدایونی نے اپنی تصنیف نجات الرشید میں بھی بحث کی ہے[۱۶۱] اور بحث ختم کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

ماحصل ہمہ مقدمات مذکور ایں است کہ متعہ نزد حنفی و شافعی مطلقاً حرام و نزد مالکی و شیعی بہ اتفاق حلال است۔ باآنکہ در کتاب موطا کہ تصنیف امام مالک رضی اللہ عنہ است، خلافِ او وارد است۔ اما اگر قاضی چہ بہر مذہب کہ باشد بر مذہب امام مالک رضی اللہ عنہ حکم بہ جوازِ متعہ کند، نزد ہمہ بہ اتفاق جائز باشد۔ و لے ایں صورت حق آں است کہ قائل بہ حرمت آں باید بود کہ موجبِ دلیری عوام و خلل در نسل می شود[۱۶۲]

ان تمام مقدماتِ مذکورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ متعہ حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک مطلقاً حرام ہے اور مالکیہ اور شیعہ کے نزدیک بہ اتفاق حلال ہے، اگرچہ امام مالک رضی اللہ عنہ کی تصنیف موطا میں اس (متعہ) کے خلاف لکھا گیا ہے —— لیکن اگر قاضی، بے شک وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، امام مالک رضی اللہ عنہ کے مذہب کے مطابق جوازِ متعہ کا فیصلہ دے دے تو سب کے نزدیک بہ اتفاق جائز ہو جائے گا —— اس صورت

---

۱۶۰ منتخب التواریخ — ج ۲، ص ۲۰۷ تا ۲۱۱

۱۶۱ ملاحظہ ہو: نجات الرشید از ص ۴۳۴ تا ۴۳۸

۱۶۲ ایضاً — ص ۴۳۸

پر عمل کیے بغیر صحیح بات یہ ہے کہ یہ حرام ہی رہے گا، کیوں کہ اس سے عوام میں دلیری پیدا ہوتی ہے اور نسل و نسب میں خلل پیدا ہوتا ہے۔

اس ضمن میں بدایونی کی بالکل آخری سطریں یہ ہیں:

وایں بحث بہ تقریب استفسار خلیفہ زمان از علمائے عصر بہ تفصیل در رسالہ علاحدہ نوشتہ است۔ اگر استیعاب خواہند در آں جا بنگرند[۱۶۳]

یہ بحث جو خلیفۂ وقت (اکبر) کے اس دور کے علما سے استفسار کی صورت میں سامنے آئی، ایک علیحدہ رسالے میں تحریر کی گئی ہے۔ اگر تفصیل میں جانا مقصود ہو تو وہاں دیکھ لی جائے[۱۶۴]

دربار اکبری میں متعہ کے جواز و عدم جواز کی بحث کے سلسلے میں ہم نے بدایونی کی منتخب التواریخ کی پوری عبارت درج کر دی ہے اور نجات الرشید کا ماحصل پیش کر دیا ہے۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ بادشاہ کو "اجتہاد" کی راہ پر لگانے میں بدایونی کے غلط استدلال کا بھی پورا حصّہ ہے ـــ انھوں نے جس اسلوبِ بیان اور علمِ کلام سے جوازِ متعہ کا ثبوت پیش کیا، اور اپنی قوتِ بیانیہ سے متعہ کے عدمِ جواز کے حامی علما کو خاموش کرایا، اس سے یہ بدیہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس ضمن میں ملا مبارک، ابو الفضل اور بدایونی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ بدایونی نے اس کے جواز میں جو دلائل دیے ہیں، وہ سراسر غلط ہونے کے باوجود زیادہ مؤثر اور زور دار ہیں۔ بدایونی کا یہ کہنا بھی قطعی غلط ہے کہ امام مالک جوازِ متعہ کے قائل ہیں۔ پھر اُن کی یہ بات بھی ہرگز قرینِ صحت نہیں کہ کسی ایک فقہی مسلک کے حامل قاضی کا حکم یا فیصلہ، اس کے مخالف کے لیے قابلِ تسلیم اور لائق عمل قرار پاجاتا ہے ـــ فیصلہ وہی صحیح ہوگا جو کتاب و سنت

---

۱۶۳ نجات الرشید ـ ص ۴۳۸

۱۶۴ بدایونی کا کوئی ایسا رسالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا، جس میں یہ بحث مفصل مرقوم ہو۔ منتخب التواریخ میں لکھا گیا ہے کہ نجات الرشید میں بحث کا خلاصہ موجود ہے۔ نجات الرشید میں کسی اور رسالے کا حوالہ دیا گیا ہے، جس کا نام مذکور نہیں۔ شاید اس رسالے سے منتخب التواریخ کی بحث مقصود ہو، کیونکہ یہ کتاب بادشاہ سے چھپ چھپا کر لکھی گئی تھی ـــ نجات الرشید انھوں نے بادشاہ کو پیش کر دی تھی۔

کے مطابق ہوگا، اس کے علاوہ ہر فیصلہ غلط ہوگا، خواہ اسے کسی مسلک کا قاضی جاری کرے۔ علمی اور اصولی اعتبار سے یہ بات ناقابلِ اعتنا ہے کہ متنازعہ مسئلہ میں کسی ایک مسلک کے قاضی کا فیصلہ، اس مسئلے کو جواز میں بدل دیتا ہے اور پھر اس پر سب کے لیے عمل کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

تعجب ہے، ایک طرف تو بدایونی لکھتے ہیں کہ امام مالک نے اپنی تصنیف موطا میں متعہ کی مخالفت کی ہے۔ دوسری طرف فرماتے ہیں کہ مالک متعہ کے جواز کے قائل ہیں —— بدایونی کا یہ تمام تر اندازِ استدلال غلط ہے۔

موطا حدیث کی شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ بعض علما کے نزدیک اسلوب و ترتیب کے اعتبار سے یہ اس درجہ اونچے مرتبے کی کتاب ہے کہ صحاح ستہ میں داخل ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جو ائمہ اربعہ میں سے ایک مشہور امام ہیں اور عملِ اہلِ مدینہ کے قائل ہیں، اس کتاب کے مرتب و مؤلف ہیں۔ انھوں نے کتاب النکاح کے ذیل میں ایک باب باندھا ہے، جامع ما لا یجوز من النکاح۔ اس میں مختلف عنوانات کے تحت ان کا ذکر کیا ہے، جن سے نکاح جائز نہیں ہے۔ اسی ضمن میں نکاح المتعۃ ایک باب قائم کیا ہے۔ اس میں وہ سند کے ساتھ ایک حدیث درج کرتے ہیں، جس کے الفاظ یہ ہیں:

عن علی ابن ابی طالب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن متعۃ النساء یوم خیبر وعن اکل لحوم الحمر الانسیۃ[۱۶۵]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ خیبر کے موقع پر عورتوں سے متعہ کرنے اور گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔

اس کے ساتھ ہی امام مالک نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا وہ قول بھی نقل کیا ہے، جس میں انھوں نے متعہ کرنے والے کو قابلِ رجم قرار دیا ہے[۱۶۶]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

---

۱۶۵ موطا، امام مالک۔ ص ۱۹۶ ۱۶۶ ایضاً

اتفق العلماء علی تحریم المتعۃ وھو کالاجماع بین المسلمین وکانت مباحًا فی اوّل الاسلام ثم نسخ۔[۱۶۷]

علما کا متعہ کے حرام ہونے پر اتفاق ہے، اور یوں سمجھیے کہ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ ابتدائے اسلام میں یہ مباح تھا، بعد کو منسوخ کر دیا گیا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام مالک کے نزدیک متعہ اسی طرح حرام ہے، جس طرح دوسرے مسالکِ اہلِ سنت کے نزدیک حرام ہے۔ جب مسلمانوں کا اس کی تحریم پر اجماع ہے تو مالکیہ کو اس سے مستثنیٰ کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے؟

صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

ان علیا رضی اللہ عنہ قال لابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن المتعۃ وعن لحوم الحمر الاھلیۃ زمن خیبر۔[۱۶۸]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ خیبر کے زمانے میں متعہ سے اور گھریلو گدھے کے گوشت سے منع فرما دیا۔

حرمتِ متعہ کے بارے میں صحیح بخاری کے الفاظ بھی بالکل صاف ہیں۔ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے فتح الباری میں بڑی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس ضمن میں قاضی عیاض کے، جو مالکی مسلک کے معروف عالم ہیں، یہ الفاظ بھی درج کیے ہیں،

وقال عیاض ثم وقع الاجماع من جمیع العلماء علی تحریمھا الا الروافض۔[۱۶۹]

قاضی عیاض کہتے ہیں کہ پھر شیعہ کے سوا، متعہ کی حرمت پر علما کا اجماع ہو گیا۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نکاحِ متعہ کے جواز کے قائل تھے۔ اس سلسلے میں حافظ ابنِ حجر لکھتے ہیں:

---

[۱۶۷] مسوّیٰ۔ ج ۲، ص ۱۹۶

[۱۶۸] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن نکاح المتعۃ اخیرًا۔

[۱۶۹] فتح الباری ۔ ج ۹، ص ۱۳۸، طبع مصر

واما ابن عباس فروی عنہ انہ اباحھا وروی عنہ انہ رجع عن ذٰلک۔[۱۶۰]

رہے حضرت عبداللہ بن عباس تو ان سے متعہ کی اباحت مروی ہے، اور یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے اس نقطۂ نظر سے رجوع کر لیا تھا——

یعنی بعد کو متعہ کے عدمِ جواز کے قائل ہو گئے تھے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانی، قرطبی کے حوالے سے فرماتے ہیں:

وقال القرطبی الروایات کلھا متفقۃ علیٰ ان زمن اباحۃ المتعۃ لم یطل و انہ حرم، ثم جمع السلف والخلف علیٰ تحریمھا الا من لا یلتفت الیہ من الروافض[۱۶۱]

قرطبی کہتے ہیں، تمام روایات اس پر متفق ہیں کہ اباحتِ متعہ کا زمانہ طویل نہ تھا، اسے حرام ٹھہرا دیا گیا تھا، پھر سلف و خلف کا اس کی تحریم پر اجماع ہو گیا تھا۔ مگر شیعہ نے حرمتِ متعہ کی طرف التفات نہیں کیا۔

سلف و خلف کے اس عظیم و لاتعداد گروہ علما میں ظاہر ہے کہ امام مالک اور ان کے مسلک کو ماننے والے تمام مالکیہ شامل ہیں—— اس ضمن میں حافظ ابنِ حجر مزید لکھتے ہیں کہ مالکیہ تو نکاحِ مؤقت کے سخت مخالف ہیں۔ وہ تو اس نکاح ہی کو باطل قرار دیتے ہیں، جو چند گھنٹوں یا چند دنوں کے لیے کیا جائے۔ ان کے الفاظ درجِ ذیل ہیں:

وقال ابن دقیق العید ماحکاہ بعض الحنفیۃ عن مالک من الجواز خطأ۔ فقد بالغ المالکیۃ فی منع النکاح المؤقت، حتی ابطلوا توقیت الحل بسببہ۔ فقالوا لو علق علیٰ وقت لابد من مجیئہ، وقع الطلاق الاٰن۔ لانہ توقیت للحل، فیکون فی نکاح المتعۃ۔ قال عیاض واجمعوا علیٰ ان شرط البطلان التصریح بالشرط۔[۱۶۲]

ابنِ دقیق العید کہتے ہیں، کہ بعض حنفیہ نے امام مالک سے متعہ کا جو جواز بیان کیا ہے، وہ غلط ہے۔

---

[۱۶۰] فتح الباری - ج ۹، ص ۱۳۸، طبع مصر

[۱۶۱] ایضاً [۱۶۲] ایضاً

مالکیہ تو نکاحِ مؤقت کی ممانعت میں بڑی شدت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تو اس کا مؤقت ہونا ہی اس کی حلت کو باطل ٹھہرا دیتا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر طلاق کو خاص وقت تک کے لیے معلق کر دیا جائے جس کا آنا ضروری ہے (یعنی عورت کو کہا جائے کہ کل شام کو تمھیں طلاق) تو ابھی طلاق واقع ہوجائے گی۔ کیوں نکاح کو جو حلال ہے، مؤقت قرار دینا، نکاحِ متعہ کے حکم میں آتا ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں اس بات پر علما کا اجماع ہے کہ نکاح کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کرنا ہی اس کے بطلان کی دلیل ہے۔

بہر حال اہلِ سنت کے کسی امام کے نزدیک متعہ جائز نہیں ہے، اور ان سب کا اس کی تحریم پر اجماع ہے۔ بدایونی کا یہ نقطۂ نظر بھی غلط ہے کہ جہاں کوئی عالم جائے، وہیں کے علما کے فقہی مسلک کو اختیار کرے۔

شاہ پسندوں سے بُعد

جس زمانے (۹۸۱ھ) میں بدایونی دربارِ اکبری میں پہنچے، اسی زمانے میں مُلّا مبارک کا بیٹا ابو الفضل بارگاہِ خسروی میں باریاب ہوا۔ اس سے پہلے شاعر کی حیثیت سے فیضی بھی دربارِ شاہی میں موجود تھا۔ اور بھی بہت سے علما کی بڑی تعداد، دربار سے منسلک تھی۔ ابو الفضل بڑی تیزی سے آگے بڑھ گیا، وہ باپ کی علمی مدد اور خود اپنے زورِ ذہانت سے دربار میں نمایاں نظر آنے لگا۔ اب بادشاہ کا دل چونکہ دینی اثرات اور مذہبی رجحانات سے روز بروز خالی ہو رہا تھا، اس لیے ابو الفضل نے علما کی تذلیل اور اسلامی تعلیمات کی توہین کا برملا سلسلہ شروع کر دیا، جس میں خود بادشاہ اور اس کے ہندو مصاحب بھی دلچسپی لینے لگے۔ لیکن بدایونی خالص مذہبی جذبات کے حامل تھے اور دینی تعلیمات کا اثر ان پر پوری طرح حاوی تھا، اس لیے وہ نہ صرف ابو الفضل وغیرہ سے متاثر نہیں ہوئے، بلکہ ان کی کھل کر مخالفت کی۔ انھیں ذہنی طور پر یہ شدید احساس تھا کہ ابو الفضل جیسے لوگ تو بادشاہ کے منظورِ نظر ہیں اور برابر ترقی کی منزل کی طرف گامزن ہیں، لیکن وہ (بدایونی) جو اتنے بڑے عالم، علومِ مروّجہ کے ماہر اور بادشاہ کے امامِ نماز ہیں، دربار میں کم حیثیت کے مالک ہیں۔ آخر یہ کیوں ہے؟

یہی وجہ ہے کہ بدایونی کا قلم بہت تیز ہوگیا ہے اور دربار کے ہر امیر اور عالم پر اپنی

تحریر میں طنز و استہزا کے تیز چلاتے دکھائی دیتے ہیں۔ چھوٹے کی قدر اور بڑے کی ناقدری سے انھیں شدید تکلیف ہوتی ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ نااہل کو آگے بڑھا دیا گیا ہے اور اہل کو پیچھے دھکیل دیا گیا ہے تو وہ سراپا احتجاج ہو جاتے ہیں اور نہایت دکھ کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ کئی سال کسی نہ کسی طریقے سے اکبر کے دربار سے منسلک رہے لیکن نہ کبھی بادشاہ کی زیادہ خوشامد کی، نہ ہر غلط بات میں اس کی تائید کی اور نہ ان امرا و علما سے ذہنی طور پر متفق ہو سکے جنھوں نے ہر معاملے میں بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانے کو اپنے لیے فرض قرار دے لیا تھا۔

بدایونی اپنی ملازمت کے ابتدائی دور ہی میں بادشاہ اور اس کے امرا سے کچھ کبیدہ خاطر ہو گئے تھے اور ان سے دور دور رہنے لگے تھے، کیوں کہ وہ اپنی نیکی اور افتادِ طبع کی بنا پر اس ماحول میں جو بعض لوگوں نے پیدا کر دیا تھا، اپنے آپ کو وابستہ نہیں کر سکے تھے۔ وہ کئی مرتبہ طویل رخصت لے کر گھر گئے اور پھر آگئے۔ وہ عالم دین، ذہین و طباع اور بہترین مصنف و مترجم تھے، اس لیے بادشاہ کو ان کی ضرورت رہتی تھی۔ بادشاہ کو خوب معلوم تھا کہ وہ دربار کی ملازمت سے ناخوش ہیں اور اس کے پاس رہنے سے انھیں ذہنی تکلیف ہوتی ہے لیکن ان کی قابلیت کی وجہ سے وہ ان سے تعلق قائم رکھنے پر مجبور تھا۔ اس نے قاضی علی کی کوشش سے ہزار بیگھہ زمین بھی انھیں مددِ معاش کے لیے دے دی تھی، مگر چوں کہ وہ مستقل طور سے ملازمت نہیں کرتے تھے، لہٰذا اس میں سے بھی کچھ زمین واپس لے لی گئی۔ وہ منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں:

میں عرصے سے ملازمت سے علیحدہ ہو کر گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ کے قیامِ اجمیر کے زمانے میں، قاضی علی نے مجھے بادشاہ کے سامنے پیش کیا، اور میری مددِ معاش کے لیے ہزار بیگھہ اراضی کا وعدہ یاد دلایا۔ بادشاہ نے کہا، "مجھے یاد ہے کہ اس کے متعلق جاری کردہ فرمان میں ملازمت پر قائم رہنے کی شرط تھی۔" قاضی علی نے جواب میں کہا۔ "جی ہاں! بشرطِ خدمت ان کو زمین دی گئی تھی۔" بادشاہ نے کہا، "اس سے پوچھو، کیا کوئی ضعف و عارضہ لاحق تھا کہ اس نے ملازمت ترک کر دی۔" قاضی خاں بدخشی نے فوراً جواب دیا۔ "قسمت کا ضعف تھا۔" اس موقع پر تمام مقربینِ دربار نے سابقہ امامت کا حق سمجھ کر ـــــ سابقہ

اس لیے کہ ان دنوں نماز باجماعت بالکل ہی ختم کر دی گئی تھی ـــــ (دریں ایام نماز باجماعت واذان کہ ہر پنج وقت برائے خاطر جماعت در دربار می گفتند برطرف شد[۱۷۳]) میرے لیے سفارش کی۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ "ہم کسی کو ملازمت میں رہنے پر مجبور نہیں کرتے۔ اگر یہ ملازمت نہیں کرنا چاہتا تو اس کی زمین نصف ہو جائے گی" میں نے فوراً ہی یہ بات قبول کر لی جو بادشاہ کو بڑی ناگوار گزری اور میری طرف سے رخ پھیر لیا ـــــ قاضی علی نے دوبارہ عرض کیا کہ "آخر اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔" اور اس پر بڑا اصرار کیا تو فرمایا، "شیخ عبدالنبی سے پوچھا جائے کہ یہ ملازمت کی شرط کے بغیر کتنی اراضی کا مستحق ہو سکتا ہے۔" شیخ سے پوچھا گیا تو انھوں نے مولانا اللہ داد امروہی مرحوم کے ذریعے کہلوایا کہ "چوں کہ عبدالقادر عیال دار آدمی ہے اور اس کے ذمے کافی اخراجات ہیں، لہٰذا میں حسب الحکم اس کے لیے آٹھ سو یا سات سو بیگھہ اراضی تجویز کرتا ہوں" ـــــ مصاحبوں اور مقربوں کا خیال تھا کہ اب کوئی اور عرض داشت (جو ملازمت ترک کر دینے کے متعلق ہو) مناسب نہیں ہے، وہ سب مجھے ملازمت اختیار کر لینے پر مجبور کرنے لگے۔ مجبوراً میں دوبارہ اس ملازمت کے چکر میں پھنس گیا، جس سے بمشکل نجات حاصل ہوئی تھی۔ یہ سب سزا اس لیے بھگتنا پڑی کہ میں نے قبل ازیں بادشاہ کے بار بار حکم دینے کے باوجود داغ کی تجویز قبول نہیں کی تھی۔

بدایونی اگرچہ دربارِ شاہی سے کبیدہ خاطر ہو چکے تھے اور وہاں رہنا ان کے لیے بہت مشکل ہو گیا تھا۔ بادشاہ اور بدایونی کے افکار و خیالات میں بڑا بُعد پیدا ہو چکا تھا۔ تاہم ان کی قابلیت کی وجہ سے بادشاہ کو پھر اُن کی ضرورت پڑتی تھی اور وہ آجاتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ بڑے غور و تامل کے بعد پانچ ماہ کی رخصت منظور ہوئی۔ خواجہ نظام الدین ہروی نے (جو بدایونی کے بہت مشفق اور قدر دان دوست تھے) بادشاہ سے عرض کی کہ ان کی والدہ وفات پا گئی ہیں، اہلِ خانہ کی تسکین و تسلی کے لیے وطن جانا ضروری ہے، لہٰذا رخصت عطا کی جائے۔ بادشاہ نے جانے کی اجازت تو دے دی مگر بہت ناخوشگوار انداز سے دی۔ سلام کے لیے صدر جہاں نے دو دفعہ بدایونی سے کہا "سجدہ بکن" (بادشاہ کو سجدہ کرو)۔ یہ ان سے ہو نہ سکا تو

۱۷۳ھ منتخب التواریخ۔ ج ۲، ص ۳۱۴

بادشاہ نے رنجیدگی کے عالم میں کہا، "جانے دو"

بدایونی حج کی سعادت نہ حاصل کر سکے

۹۸۵ھ کے حالات میں بدایونی لکھتے ہیں کہ اس سال کے ماہِ رجب میں، جو خواجہ معین الدین اجمیری کے عرس کا زمانہ ہے، بادشاہ نے اجمیر کا عزم کیا۔ جب سواری ٹوڈا کے مقام پر پہنچی تو شاہ ابوتراب، جو شیراز کے اکابر سادات میں سے تھے اور سلاطینِ گجرات کے شیخ و مرشد تھے، ملاقات کے لیے آئے۔ میرٹھ کے قریب پہنچے تو بادشاہ نے شاہ ابوتراب کو حجاج کا امیر مقرر کیا اور حکم دیا کہ حاجیوں کا ایک قافلہ ترتیب دیا جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ جو شخص حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کا خواہاں ہو، اس قافلے میں شامل ہوسکتا ہے۔ گجرات کے اعتماد خاں کو کثیر رقم دے کر شاہ ابوتراب کے ساتھ جانے کا حکم جاری کیا۔ بدایونی لکھتے ہیں، میرے دل میں شوقِ حج نے کروٹ لی اور شیخ عبدالنبی کی خدمت میں گیا، ان سے عرض کیا کہ میرے لیے بھی بادشاہ سے حج پر جانے کی اجازت لے دیں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا آپ کی والدہ زندہ ہیں؟"

میں نے کہا: "ہاں زندہ ہیں!"

کہا۔ "آپ کا کوئی بھائی یا ایسا رشتے دار ہے جو آپ کے بعد ان کی خدمت کرتا رہے؟"

عرض کیا۔ "نہیں، صرف میں ہی ان کا ذریعۂ خدمت ہوں!"

فرمایا۔ "اگر آپ والدہ سے اجازت لے لیں تو بہتر ہوگا۔"

غرض مجھے حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور اب میں اس محرومی پر حسرت و افسوس کرتا رہتا ہوں۔

بیٹے کا نام بادشاہ نے رکھا

ذہنی بُعد اور اختلاف کے باوجود بدایونی کے دل میں بادشاہ کا احترام تھا۔ گھریلو معاملات میں بھی وہ اس سے مشورے کو ضروری قرار دیتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بچہ پیدا ہوا تو نام بھی بادشاہ سے پوچھ کر رکھا۔ لکھتے ہیں:

میں لشکر کے ساتھ ریواڑی کے ضلع میں تھا کہ وطن سے بیٹے کی ولادت کی اطلاع موصول ہوئی۔ نہایت خوشی ہوئی اور جذباتِ مسرت سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اشرفی نذر کی اور نام کے لیے عرض کیا۔ " فرمایا" تمھارے باپ اور دادا کا کیا نام ہے؟" عرض کی "ملوک شاہ بن حامد شاہ" ان دنوں "یا ہادی" کا وظیفہ بادشاہ کے وردِ زباں تھا۔ فرمایا۔" اس کا نام عبدالہادی رکھو" حافظ محمد ابنِ خطیب بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے ہرچند کہا کہ نام رکھنے کے بھروسے پر نہ رہو، حافظوں کو بلاؤ اور لڑکے کی درازیٔ عمر کے لیے قرآن پڑھوا کر دعا کراؤ۔ میں نے ان کی بات کی پروا نہ کی۔ آخر چھ مہینے کے بعد لڑکا فوت ہو گیا۔ خدا میرے لیے اس کے ثواب کو ذخیرۂ آخرت بنائے اور اسے قیامت کے دن میرا شفیع کرے"[۱۷۴]

دوستوں کی جدائی کا غم

اس کے بعد وہ دور آیا کہ بدایونی شاہی مجالس سے اس قدر متنفر ہو گئے کہ بہت دور دور رہنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کوئی ضروریات انھیں دربار میں کھینچ لاتی تھیں اور کبھی ان کی علمی قابلیت کی وجہ سے خود بادشاہ ان کو بلانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں جن درباری علما کے وہ شدید مخالف تھے، اور جن سے ان کی بحثوں کا سلسلہ دربار میں اور دربار سے باہر جاری رہتا تھا، ان میں ابوالفضل اور فیضی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ دونوں بھائی بدایونی کے علم و فضل کے بہت مداح تھے، اور بادشاہ بدایونی سے ناراض ہو جاتا تو یہ ان کی بادشاہ سے سفارش بھی کرتے تھے۔ اس کا ذکر خود بدایونی اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں کرتے ہیں:

درباری علما میں ملّا نظام الدین ہروی، بدایونی کے مخلص و مشفق دوست تھے، اور ان کے بے حد بہی خواہ۔ ! بدایونی نے ان کی شفقتوں اور بادشاہ سے سفارشوں کا کئی مقام پر تذکرہ کیا ہے۔

درباری علما ایک بڑی جماعت پر مشتمل تھے اور مختلف مسائل سے متعلق ان کی مخالفانہ و موافقانہ بحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بدایونی کے آخری زمانے میں ان میں سے زیادہ تر

۱۷۴۔ منتخب التواریخ۔ ج ۲، ص ۲۵۲

علماوفات پا چکے تھے۔ بدایونی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

اس تاریخ سے اب تک کہ دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، مباحثہ و مجادلہ کرنے والوں کی اس جماعت میں جو سوؔ سے زیادہ افراد پر مشتمل تھی، محقق و مقلد کوئی بھی تو نظر نہیں آتا ہے۔ سب کے چہروں پر موت اپنا سیاہ نقاب ڈال چکی ہے۔ اللہ کا یہ فرمان بلاشبہ صحیح ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ــــ وہ محفلیں اجڑ گئیں ہیں، اور ایک میں سوگوار رہ گیا ہوں۔ جب ان کی یاد آتی ہے تو میری غم زدہ آنکھیں حیرت و افسوس کے ساتھ خون کے آنسو روتی ہیں، اور دل نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے۔ کاش! وہ لوگ کچھ دن اور زندہ رہتے کہ بہر نوع اس قحط الرجال میں ان کا وجود بڑا غنیمت تھا۔ اب کس سے بات کریں۔ مبادلہ خیالات کا لطف تو اُن کے ساتھ ہی رخصت ہوگیا۔ اب مجھ ناکارہ و افتادہ کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ان کی جدائی کے داغ سے جلتا اور دل ہی دل میں آہ و فریاد کرتا رہوں:

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند ۔۔۔ در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنک شراب در مجلسِ عمر ۔۔۔ یک لحظہ زما بیشترک مست شدند

علمی و تصنیفی خدمات

بدایونی کی علمی و تصنیفی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ انھوں نے دربارِ اکبری میں آنے سے پہلے بھی تصنیفی خدمات انجام دیں، دربار میں آنے کے بعد اکبر کے حکم سے بھی ترجمہ و تالیف میں نام پیدا کیا، اور پھر زندگی کے آخری وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اکبر سے انسلاک کے بعد انھوں نے بادشاہ کے حکم سے سب سے پہلے سنگھاسن بتیسی کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ۹۸۲ھ میں ماہِ صفر کی آخری تاریخ کو اکبر نے فتح بنگالہ کے ارادہ سے کوچ کیا۔ اس سفر میں بدایونی بھی اکبر کے ساتھ تھے۔ واپسی پر ۶ جمادی الاولیٰ ۹۸۲ھ کو شاہی لشکر جون پور پہنچا اور ایک مہینہ تین دن وہاں مقیم رہا۔ ۹ جمادی الاُخریٰ کو دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ اس سفر میں بادشاہ کے سامنے بدایونی کی علمی قابلیت کے مزید جوہر کھلے، اور ان کی وسعتِ معلومات کا پتا چلا تو وہ اور بھی متاثر ہوا ـــــ جمادی الاُخریٰ ہی کی کسی تاریخ کو جب قافلہ شاہی کی منزل شیر گڑھ کے قصبے میں ہوئی تو بادشاہ نے بدایونی

کو شرفِ مخاطبت سے نوازا اور حکم دیا کہ سنگھاسن بتیسی کا فارسی میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ کتاب بتیس ۳۲ کہانیوں پر مشتمل ہے، جو مالوہ کے راجہ بکرماجیت کے حالات سے متعلق ہیں۔ اصل کتاب سنسکرت زبان میں ہے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کرکے اُسے طوطی نامہ کے اسلوب پر نظم و نثر میں ترتیب دیا جائے اور ایک ورق کا ترجمہ نمونے کے طور پر آج ہی پیش کیا جائے۔ ایک صاحبِ علم برہمن کو بھی مدد کے لیے مقرر کیا۔ چنانچہ اسی دن پہلی کہانی کا ایک ورق ترجمہ کرکے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ نے بہت تعریف کی۔ کتاب کا ترجمہ مکمل ہوگیا تو اس کا نام "نامۂ خرد افزا" رکھا۔ یہ اس کا تاریخی نام ہے، کیوں کہ کتاب میں اس کا تصنیفی اور تاریخی پس منظر بھی شامل ہے۔ بادشاہ نے کتاب پسند کی اور کتب خانہ شاہی میں داخل ہوئی۔

یہاں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے جو بدایونی نے منتخب التواریخ میں چھتیسویں سالِ جلوس (۹۹۹ھ) کے واقعات کے ضمن میں بیان کیا ہے کہ شاہی کتب خانہ سے "نامۂ خرد افزا" کا نسخہ گم ہوگیا تھا۔ سلیمہ سلطان نے اس سلسلے میں بدایونی کو کئی دفعہ یاد فرمایا اور بدایوں میں ان کو بلانے کے لیے قاصد بھیجے۔ مگر وہ کچھ ایسی الجھنوں میں گرفتار تھے کہ نہ جاسکے۔ آخر بادشاہ نے حکم دیا کہ بدایونی کی مددِ معاش موقوف کردی جائے اور اُسے زبردستی بدایوں سے دربار میں لایا جائے۔ لیکن اس موقع پر مرزا نظام الدین احمد نے دوستی کا حق ادا کیا۔ ابوالفضل نے بادشاہ سے سفارش کی اور ہر بار یہی کہا کہ کوئی مشکل ضرور درپیش ہوگی، جس کی وجہ سے وہ نہیں آسکے ہیں اور بدایوں میں بیٹھے ہیں۔

۹۸۳ھ کو دکن کا ایک پڑھا لکھا برہمن شیخ بھاون دربار میں پہنچا اور اپنی مرضی سے اسلام قبول کرکے بادشاہ کے مصاحبوں میں شامل ہوگیا۔ بادشاہ نے بدایونی کو حکم دیا کہ "اتھربن بید" کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ ہندوؤں کا چوتھا وید ہے اور اس کے بعض احکام اسلام سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ترجمہ کے سلسلے میں ایک پنڈت کی خدمات بھی بدایونی کے سپرد کیں۔ کام شروع کیا گیا تو کتاب کی بعض نہایت پیچیدہ عبارتیں سامنے آئیں، جنھیں بدایونی بھی سمجھنے سے قاصر تھے، اور ان کی صحیح تعبیر وہ پنڈت بھی نہیں کر پاتا تھا۔ جب

یہ مشکل بادشاہ کے سامنے پیش کی گئی تو اس نے یہ کام پہلے تو فیضی کے سپرد کیا، اور بعد کو حاجی ابراہیم سرہندی کو اس پر مامور فرمایا۔ لیکن وہ بھی اس کا بہتر ترجمہ نہ کر سکے۔

اس چوتھے وید (اتھربن بید) کے احکام میں ایک حکم یہ ہے کہ جب تک ایسی عبارت، جس میں کئی لام آتے ہیں، مثلاً لا الہ الا اللہ نہ پڑھی جائے، نجات نہیں ہوگی۔ ایک حکم میں چند شرائط کے ساتھ گائے کا گوشت مباح قرار دیا گیا ہے۔ ایک جگہ میت کو دفن کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جلانے سے روکا گیا ہے۔

اس وید کے یہ احکام بحث میں بیان کر کے شیخ بھاون نے ہندوستان کے بہت سے برہمنوں کو لاجواب کر دیا تھا، اور اسی سے متاثر ہو کر اس نے اسلام قبول کیا تھا۔

۹۸۶ھ کے واقعات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

بادشاہ ۹۸۶ھ میں پنجاب کا دورہ کر کے دہلی پہنچا۔ وہاں سے اجمیر گیا اور عرس میں شامل ہوا۔ دوسرے دن آگرہ کا قصد کیا۔ صبح کے وقت ٹوڈا میں منزل ہوئی، تو میں بساور سے استقبال کے لیے پہنچا ہوا تھا۔ حاضر ہو کر اپنی تصنیف "کتاب الاحادیث" پیش خدمت کی۔ یہ کتاب فضیلتِ جہاد اور تیر اندازی کے اجر و ثواب کے موضوع سے متعلق ہے۔ کتاب کتب خانہ شاہی میں داخل ہوئی۔

۹۹۰ھ کو بادشاہ نے کہا کہ ہجرتِ رسولِ اکرم پر ہزار سال پورے ہو چکے ہیں۔ اب تاریخ کی ایک ایسی کتاب لکھی جائے، جس میں گزشتہ ہزار سال کے تمام شاہانِ اسلام کے واقعات و حالات درج ہوں اور تاریخ کی یہ کتاب دوسری کتبِ تواریخ کے غلط واقعات کی ناسخ اور تردید کناں ہو۔ اس کا نام "تاریخ الفی" رکھا جائے اور اس میں "سن" کے ساتھ بجائے لفظِ "ہجری" کے "رحلت" کا لفظ لکھا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لے کر اس زمانے (یعنی ۹۹۰ھ) تک کے حالات معرضِ تحریر لانے کے لیے سات اشخاص کو مامور کیا گیا، جن میں ایک ملا عبدالقادر بدایونی تھے۔ بدایونی کو جن سنین کے واقعات ضبطِ کتابت میں لانے کا کام سپرد ہوا، ان میں خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات بھی تھے۔ ایک شب یہ مسودہ بادشاہ کے ملاحظہ میں تھا۔ جب بادشاہ پڑھتے پڑھتے

حضرت عمر کے حالات کے ضمن میں کوفہ شہر کی تعمیر، قصرِ امارت کے انہدام، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی حضرت ام کلثوم سے حضرت عمر کے نکاح اور شہر نصیبین کی فتح اور وہاں سے بڑے بڑے بچھوؤں کے نکلنے کے واقعات پر پہنچا تو ان مندرجات پر بحث شروع کر دی اور خاصی رد و قدح کی۔ آصف خاں ثالث یعنی مرزا جعفر نے اس بحث میں بادشاہ کی تائید کی جو بالکل غلط تھی۔ البتہ ابوالفضل اور غازی خاں بدخشی نے ان واقعات کو صحیح قرار دیا اور تاریخی حیثیت سے مبنی بر صحت ٹھہرایا۔ اس موقع پر اکبر نے بدایونی سے ان واقعات کے ماخذ کے بارے میں بھی سوال کیا اور پوچھا کہ "تم نے یہ حالات کہاں سے لیے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "میں نے کچھ اپنی طرف سے بنا کر تو نہیں لکھا، جو کچھ کتابوں میں پڑھا ترتیب دے دیا۔" اکبر نے اسی وقت شاہی کتب خانے سے روضۃ الاحباب اور سیرت کی کچھ کتابیں منگوائیں اور نقیب خاں سے کہا کہ وہ تحقیق کر کے ان واقعات کی صحت و عدمِ صحت کے بارے میں بادشاہ کو مطلع کرے۔ کتابیں دیکھ کر اس نے تمام واقعات کے صحیح ہونے کی تصدیق کی اور بدایونی کو بادشاہ کی بے جا گرفت سے نجات حاصل ہوئی۔

بہر حال مختلف لوگوں نے اور بعد میں آصف خاں نے ۹۹۷ھ تک کے حالات "تاریخ الفی" میں جمع کیے۔ پھر ... اھ کو بادشاہ نے لاہور میں بدایونی کو اس کے تمام مسودات کے مقابلے، تصحیح اور سنین میں جو تقدیم و تاخیر ہو گئی تھی، اس کو درست کرنے کا حکم دیا۔ ایک سال تک بدایونی یہ کام کرتے رہے۔ انھوں نے اس اثنا میں پہلی دو جلدیں مکمل کیں، تیسری جلد کا کام آصف خاں کے سپرد کیا گیا۔۔۔ آئینِ اکبری میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ اس کتاب کا دیباچہ اس (ابوالفضل) نے لکھا۔

۹۹۰ھ کے واقعات میں ایک اہم واقعہ "مہابھارت" کے ترجمے کا ہے جو پہلی مرتبہ اکبر کے عہد میں فارسی میں ہوا۔ "مہابھارت" ہندوؤں کی ایک قدیم مذہبی کتاب ہے۔ اس کا سنِ تصنیف تو صحیح طور سے معلوم نہیں، البتہ اس کے مصنف کا نام پنڈت دیاس جی ہے۔ یہ کتاب قدیم ہند کے واقعات، آریوں کے عقائد، ان کے طرزِ حکمرانی، معاشرت، سماجی حالات، متعدد قصوں، عجیب و غریب کہانیوں، نصیحتوں، اخلاق و آداب، علوم و معتقدات، ہندو

مذہب کے رسوم و عقائد اور اس کے نہجِ عبادات کا مکمل مرقع ہے، اور اس ضمن کی تمام تفصیلات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کرشن جی کے اپدیش کا جو "بھگوت گیتا" کے نام سے مشہور ہے، ماخذ یہی کتاب ہے۔ کورو پانڈوؤں کی جنگ کا اصل ماخذ بھی "مہابھارت" ہی ہے۔ یہ جنگ دہلی کے قریب کوروکشیتر کے مقام پر لڑی گئی تھی، جس میں کرشن جی کی مدد سے ارجن نے کوروؤں کو شکست دی تھی۔ بعض ہندوؤں کا کہنا ہے کہ اس کتاب میں جنگ کے جو کوائف درج ہیں، وہ ساڑھے چار ہزار سال پیشتر وقوع پذیر ہوئے تھے۔ بعض کے نزدیک ان پر اسّی ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ہندو اس کتاب کے لکھنے اور پڑھنے کو عبادت سمجھتے ہیں اور ان کے مذہبی نقطۂ نظر سے اس کے مندرجات ہر اعتبار سے قابلِ اعتماد اور لائقِ اعتنا ہیں۔

بدایونی اکبر پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بادشاہ کو مہابھارت کے ترجمے کا خیال اس لیے آیا کہ انھی دنوں اس نے شاہنامہ باتصویر لکھوایا تھا، اور امیر حمزہ کا قصہ بھی سترہ جلدوں میں باتصویر مرتب ہو کر پندرہ برس کے عرصے میں تیار ہوا تھا۔ اس پر کافی روپیہ بھی خرچ ہوا تھا۔ قصہ ابومسلم اور جامع الحکایات وغیرہ بھی کئی بار سن اور لکھوا چکا تھا۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ یہ سب فرضی قصے، شاعری کی باتیں اور شاعروں کی تراشیں ہیں۔ حقیقت سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یوں ہی ان کتابوں کو شہرت حاصل ہو گئی ہے ــــ البتہ ہندی کتابیں جو عبادت گزار دانا لوگوں نے لکھی ہیں، وہ صحیح واقعات پر مشتمل اور بالکل تندرست ہیں۔ ہندوؤں کی عبادات و اعتقادات اور مذہب کا سرچشمہ اور ماخذ بھی یہی ہیں، لہٰذا کیوں نہ اپنے نام سے ان کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ کرا دیا جائے۔ یہ واقعات اب تک فارسی میں بیان نہیں ہوئے۔ قارئین کے لیے یہ دلچسپ بھی ہوں گے اور نئے بھی۔ پھر جیسا کہ مقدمہ کتاب میں درج ہے، ان میں دین و دنیا کی سعادت بھی ہے اور ذریعہ شان و شوکت بھی۔ اس سے اموال و اولاد میں بھی اضافہ ہوگا۔

چنانچہ ان امور کے پیشِ نظر خود بادشاہ نے بھی ذاتی طور پر ان کے لیے وقت دینے کا فیصلہ کیا، اور ہندو پنڈتوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ "مہابھارت" کی تعبیر و ترجمانی میں تعاون کریں۔ پہلے تو بادشاہ نے یہ کیا کہ نقیب خاں کی مدد سے رات کو اس کے مضامین سمجھتا رہا اور رہ

کے معنی فارسی میں لکھواتا رہا۔ پھر تیسری شب بدایونی کو بلایا اور حکم دیا کہ وہ نقیب خاں کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کریں۔ اس کے بعد بدایونی لکھتے ہیں :

تین چار مہینے میں اس مجموعہ خرافات کے اٹھارہ [۱۸] فنون میں سے، جن میں اٹھارہ ہزار عالم کا تذکرہ کیا گیا ہے، صرف دو فن (پرب) لکھے جاسکے۔ نہ معلوم مجھ سے کیا گناہ سرزد ہوا تھا کہ اس ترجمے سے پالا پڑا، اور بادشاہ کے طرح طرح کے اعتراضات سننے اور برداشت کرنا پڑے۔ اس کام میں بجز طعن و تعریض کے مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ بعد میں اس کا ایک حصہ ملا شیری اور نقیب خاں نے مکمل کیا، اور ایک حصے کی حاجی سلطان تھانیسری نے تکمیل کی۔ اس کے بعد فیضی کو اس کی نظم و نثر مرتب کرنے کا حکم دیا۔ وہ دو فن [پرب] سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پھر حاجی سلطان تھانیسری نے دو حصے اور لکھے اور جو فرو گزاشتیں پہلی دفعہ رہ گئی تھیں، انھیں درست کیا۔ اس طرح کتاب کے سو [۱۰۰] جز کھینچ کھانچ کر مکمل ہوئے۔ بادشاہ کو اصل کتاب اور ترجمے کی مطابقت میں کچھ ایسا اصرار تھا کہ مکھی کا داغ (نقطۂ مگس) بھی چھوٹنے نہ پائے۔

بدایونی اس ضمن میں طنز کے تیر چلاتے ہوئے مزید لکھتے ہیں :

حاجی سلطان تھانیسری کو اس شدید محنت و مشقت کا کیا صلہ ملا ؟ کچھ عرصہ بعد کسی بہانے انھیں بھکر کی طرف جلاوطن کر دیا گیا . . . مہابھارت کا ترجمہ بتانے والوں میں سے اکثر کورو اور پانڈو سے جا ملے ہیں، اور جو باقی اس دنیا میں رہ گئے ہیں، خدا ان کو نجات دے اور توبہ کی توفیق عطا کرے۔ مجھے بھی اللہ تعالیٰ اس معاملے میں معافی عطا فرمائے۔

اس سے آگے رقم طراز ہیں :

اکبر نے اس ترجمے کا نام "رزم نامہ" رکھا اور دو با تصویر نسخے تیار کرائے۔ جب یہ تیار ہوگئے تو امرا کے نام حکم جاری کیا گیا کہ وہ اس پر ہاتھ رکھ کر برکت حاصل کریں۔ ابوالفضل نے . . . اس کفر نامہ پر دو جز کا خطبہ لکھا۔

بختاور خاں نے "مرآۃ العالم" میں لکھا ہے کہ ملا صاحب کو خدمت مذکور کے صلے میں ایک سو پچاس [۱۵۰] اشرفی اور دس ہزار تنکہ سیاہ انعام ہوئے [۱۷۵]

---

[۱۷۵] دربار اکبری ۔ ص ۷۵۰

جلوسِ سلطانی کے چالیسویں سال (۱۰۰۳ھ) کے واقعات بیان کرتے ہوئے "مہابھارت" کے ترجمے کے سلسلے کا بھی بدایونی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

اس سال کے رجب کی ۹ تاریخ کو نوروز تھا، اور جلوسِ سلطانی کے چالیسویں سال کا آغاز ہوا تھا۔ نوروز سے دو دن پہلے بادشاہ نے بدایونی کو دیوانِ خاص و عام کے جھروکے میں بلایا اور براہِ راست بدایونی سے کہنے کے بجائے ابوالفضل کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"ہم تو عبدالقادر کو صوفی مشرب نوجوان سمجھتے تھے، لیکن اس نے اپنے آپ کو ایسا متعصب فقیہ ثابت کیا ہے کہ کوئی تلوار اس کی رگِ تعصب کو کاٹ نہیں سکتی۔"

ابوالفضل نے پوچھا۔ "کس کتاب میں اس نے کوئی ایسی بات لکھ دی ہے کہ آپ اس کے متعلق اس رائے کا اظہار فرماتے ہیں؟"

اکبر نے کہا: "اسی "رزم نامہ" یعنی "مہابھارت" میں کل رات ہم نے اس کی ایک تحریر پر نقیب خاں کو بھی گواہ بنایا ہے۔"

ابوالفضل نے کہا۔ "اس سے غلطی ہو گئی۔"

اس وقت آگے بڑھ کر بدایونی نے وضاحت کی۔ "کم ترین تو فقط ایک مترجم ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ جو کچھ ہندی کے عالموں نے ترجمانی کی تھی، میں نے اس کا اسی طرح ترجمہ کر دیا۔ اگر اپنی طرف سے میں نے کچھ بڑھایا ہو تو یقیناً میں قصور وار ہوں۔"

ابوالفضل نے بھی اس کی تائید کی اور بادشاہ خاموش ہو گیا۔

بدایونی لکھتے ہیں، "بادشاہ کے اس اعتراض کا سبب یہ تھا کہ (مہابھارت کے ترجمہ) "رزم نامہ" میں میں نے ایک حکایت نقل کی تھی کہ ایک پنڈت نے عالمِ نزع میں حاضرین کو نصیحت کی کہ انسان کو چاہیے کہ غفلت و جہالت کو ترک کر کے سب سے پہلے اپنے صانعِ حقیقی (خالقِ حقیقی) کو پہچانے، علم و حکمت کا راستہ اختیار کرے اور علم بے عمل پر جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا بھروسا نہ کرے۔ حسنِ عمل کو اختیار کر کے تا حدِ امکان جھگڑوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے، اور اس بات پر کامل یقین رکھے کہ ہر فعل کی باز پرس ہو کر رہے گی۔ اس موقع پر میں نے یہ مصرع لکھ دیا تھا،

ہر عمل اجرے و ہر کردہ جزائے دارد

بس یہ عبارت اور مصرع تھا جو بادشاہ کو کھٹکا اور اس نے اس کو منکر نکیر کے سوال جواب حشر و نشر، آخرت کے حساب اور میزان پر محمول کیا۔ یہ بات چونکہ اس کے عقیدۂ تناسخ کے خلاف تھی، جس کے سوا وہ کسی چیز کو صحیح نہیں سمجھتا تھا، لہٰذا اس نے مجھ پر ملّاپن اور متعصب فقیہ کا الزام لگایا۔"

اس سے آگے بدایونی رقم طراز ہیں:

یہ بات چل نکلی اور مجھے اچھا موقع مل گیا۔ چنانچہ میں نے مقربانِ شاہی کو اچھی طرح سمجھانا شروع کیا کہ ہندوستان کے تمام لوگ نیکی اور بدی کے اچھے اور بُرے انجام کے قائل ہیں، اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو ایک محرر جو بندوں کے اعمال زندگی بھر لکھتا رہتا ہے، اس کی نیکی اور بدی کے تمام اندراجات بادشاہِ عدل کے پاس لے جاتا ہے، اور پھر نیکی اور بدی کی کمی بیشی کے مطابق اس کا بارگاہِ عدل سے بدلہ دیا جاتا ہے۔ اسی کے نتیجے میں اس کو جنت یا دوزخ میں ڈالا جاتا ہے۔

۹۹۲ھ میں بادشاہ نے بدایونی کو ہندوؤں کی مشہور کتاب "رامائن" کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ کہتے ہیں، یہ کتاب تصنیف کے لحاظ سے "مہا بھارت" سے بھی پہلے کی ہے، جو بالمیک رشی کی تصنیف بتائی جاتی ہے، ہندوؤں کی مقدس اور قدیم کتابوں میں اس کا بڑا درجہ ہے، پچیس ہزار اشلوک پر مشتمل ہے۔ ہر اشلوک پچیس حروف کا ہے۔ کتاب اودھ کے راجہ رام چندر کی داستان ہے، جسے عام طور پر رام کہا جاتا ہے۔ ہندو اس کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں اور قدرتِ الٰہی کا ظہور سمجھ کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں اس کی کہانی یہ ہے کہ لنکا کے جزیرے پر راون نام کا ایک دیو حکومت کرتا تھا، جس کے دس سر تھے۔ وہ رام کی بیوی سیتا پر عاشق ہو گیا اور اُسے اغوا کر کے لنکا لے گیا تھا۔ رام نے اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اس جزیرے کا رُخ کیا۔ بے شمار بندروں اور ریچھوں کا لشکر تیار کیا اور سمندر پر چار کوس کا پُل باندھا۔ بعض بندروں کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ اس فاصلے کو ایک ہی چھلانگ میں طے کر گئے تھے، اور بعض پُل پر

سے چلتے ہوئے وہاں پہنچے۔ بدایونی لکھتے ہیں، "غرض ایسی بہت سی خرافات اس کتاب میں درج ہیں۔" وہ مزید لکھتے ہیں: "بہرحال رام چندر ایک بندر پر سوار ہو کر اس پل پر سے گزرا اور ایک ہفتہ تک جنگ کر کے راون کو اس کے اہل و عیال سمیت قتل کر دیا، اور لنکا کا جزیرہ اپنے بھائی کے حوالے کر کے اپنے شہر واپس آگیا۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ رام چندر نے ہندوستان پر دس ہزار سال حکومت کر کے وفات پائی۔ . . . . ظاہر ہے "رامائن" کے یہ مندرجات صحیح نہیں ہیں، محض افسانہ اور خیالی داستانیں ہیں۔"

اس سے آگے لکھتے ہیں:

"ماہ جمادی الاولی ۹۹۷ھ میں، میں نے رامائن کا ترجمہ مکمل کر کے بادشاہ کو پیش کیا۔ یہ ترجمہ چار سال میں ختم کیا تھا اور اس کے دو نسخے مرتب کیے تھے۔ ترجمے کے آخر میں یہ شعر لکھا تھا:

ما قصہ نوشتیم بہ سلطان کہ رساند   جاں سوختہ کردیم بہ جاناں کہ رساند

بادشاہ کو یہ شعر بہت پسند آیا اور پوچھا۔ "ترجمہ کتنے اجزا میں مکمل ہوا؟" میں نے عرض کیا، "پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً ستر اجزا میں اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ ایک سو بیس (۱۲۰) اجزا میں۔" بادشاہ نے حکم دیا کہ "مصنفوں کے دستور کے مطابق اس کا دیباچہ بھی لکھ دو۔" دیباچے کی چونکہ زیادہ ضرورت نہ تھی، اس لیے میں ٹال گیا۔ اب میں اپنے نامۂ سیاہ سے جو میرے نامۂ اعمال کی طرح داغ دار ہے، خدا کی پناہ چاہتا ہوں، لیکن نقلِ کفر، کفر نیست، پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ یہ کتاب جو میں نے کراہتاً بادشاہ کے حکم سے مجبور ہو کر لکھی ہے، میرے لیے لعنت کا باعث نہ بن جائے۔ اللہ ہی مجھے معاف کرے اور اپنی پناہ میں رکھے۔"

رامائن کے ترجمے کا بدایونی کو کیا صلہ ملا؟ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

انھی دنوں [۹۹۷ھ میں] بادشاہ کو خیال آیا کہ رامائن کے ترجمے کا کچھ صلہ مجھے دیا جائے۔ چنانچہ ایک دن . . . میرا نام لے کر کہا۔ "یہ نوجوان بدایوں کا رہنے والا ہے، اس کی مددِ معاش ہم بغیر کسی قصور کے جان بوجھ کر بساور سے منقطع کر کے بدایوں میں مقرر کر دیتے ہیں۔ . . ."

۹۹۹ھ میں بادشاہ نے بدایونی کو "تاریخ کشمیر" کو سادہ و آسان فارسی زبان میں

منتقل کرنے کا حکم دیا۔"تاریخ کشمیر" سنسکرت کی کتاب "راج ترنگنی" کا ترجمہ ہے۔ "راج ترنگنی" کشمیر کے ایک حکمران سلطان زین العابدین کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ اس کے مصنّف کا نام کلہانا ہے۔ بعد ازاں اکبر کے حکم سے علاقہ کشمیر کے قصبہ شاہ آباد کے ایک عالم ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے جو فاضل بزرگ اور جامع معقول و منقول تھے، اس کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ بعد میں اکبر کے حکم سے بدایونی نے اس کو سادہ اور آسان فارسی زبان میں لکھا۔ یہ کام دو مہینے میں مکمل ہوا۔ آخر میں یہ شعر تحریر کیا:

این نامہ شد چو خط پری پیکران سیاہ   در عرضِ یک دو ماہ بتقریب حکم شاہ

یہ نسخہ کتب خانہ شاہی میں داخل کیا گیا اور پھر باقاعدہ ایک ایک جز کی صورت میں بادشاہ کے سامنے پڑھا گیا۔

اسی زمانے (۹۹۹ھ) میں حکیم ہمام نے شہاب الدین عبداللہ یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ) کی تصنیف "معجم البلدان" کی بادشاہ کے سامنے بہت تعریف کی اور تجویز پیش کی کہ اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا جائے۔ کیوں کہ یہ کتاب بڑی عجیب و غریب حکایات اور مفید معلومات و مضامین پر مشتمل ہے۔ بادشاہ نے دس بارہ عراقی اور ہندوستانی اہل علم کو جمع کر کے اس کے مختلف اجزا ان میں تقسیم کیے۔ بدایونی کے حصے میں دس جز آئے۔ ان اجزا کا ترجمہ انھوں نے ایک مہینے میں کر دیا اور سب سے پہلے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس حسنِ خدمت کو ذریعہ بنا کر بدایوں جانے کے لیے درخواست کی جو منظور ہوئی۔

۹۹۹ھ میں بدایونی نے "نجات الرشید" تصنیف کی۔ یہ کتاب حالتِ سفر میں لکھی گئی جو قران، حدیث اور فقہ کی روشنی میں شعائرِ اسلام اور بعض دینی مسائل پر مشتمل ہے۔ تصوّف کے کچھ مسائل بھی اس میں شامل ہیں۔ بزرگانِ دین کے بعض واقعات بھی درجِ کتاب ہیں۔ کتاب کے بعض مضامین سے اختلاف کی گنجائش ہے، تاہم بڑی محنت سے لکھی گئی ہے، اچھی ضخیم کتاب ہے اور بہت سے معلومات کو محیط ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی کئی مہینے سے دربار سے غیر حاضر تھے، اس لیے بادشاہ ان سے خفا تھا۔ خفگی کیوں کر دُور ہوئی؟ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے:

سینتیسویں۳۷ سالِ جلوس (۱۰۰۰ھ) کے حالات میں بدایونی لکھتے ہیں کہ میں ماہ ذی الحجہ میں بدایوں سے حسب الحکم لشکر میں حاضر ہو گیا۔ بھمبر میں منزل ہوئی تو حکیم ہمام نے عرض کیا:

"عبدالقادر کورنش بجالانا چاہتا ہے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "وہ وعدہ کے خلاف کتنا عرصہ غیر حاضر رہا"۔

حکیم نے جواب دیا "پانچ مہینے"!

بادشاہ نے پوچھا۔ "غیر حاضری کی کیا وجہ تھی؟"

لوگوں نے کہا۔ "بیمار ہو گیا تھا۔"

تصدیق کے لیے بدایوں کے اکابر و زعما کا محضر اور حکیم عین الملک کا عریضہ بھی پیش کیا گیا۔ لیکن جب بادشاہ نے یہ تمام کاغذات پڑھ لیے تو فرمایا:

"بیماری مسلسل پانچ مہینے تک نہیں رہتی"— اور مجھے کورنش بجالانے کی اجازت نہیں دی۔

اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں:

اب میں شرمندہ و رنجیدہ اور غم زدہ ہو کر شاہزادہ دانیال کے لشکر میں، جسے رہتاس میں متعین کیا گیا تھا، جا کر ٹھہر گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و صلوٰۃ بھیجتا رہا۔ اس اثنا میں قصیدہ بردہ کا وظیفہ کر کے اور خدا سے گڑگڑا کر دعائیں کیں جو بالآخر فضلِ خداوندی سے قبول ہوئیں۔ میرے پہنچنے کے پانچ ماہ بعد جب لشکر کشمیر سے لاہور پہنچا تو بادشاہ نے میری طرف عنانِ توجہ اور نظر عنایت فرمائی اور ایک ضخیم کتاب "جامع رشیدی" کے ترجمے کے لیے خلوت شاہی میں میر نظام الدین احمد کے ساتھ میرا نام بھی میری غیبوبیت میں تجویز فرمایا، اور مجھے حاضری کا حکم ہوا۔ اس طرح کشمیر سے واپسی کے بعد ۷ ربیع الثانی ۱۰۰۰ھ کو کورنش کی اجازت دی گئی۔ میں نے حاضر ہو کر ایک اشرفی نذر کی، بادشاہ نے بڑی مہربانی فرمائی اور ساری خفگی آسانی سے رضامندی میں بدل گئی۔

بادشاہ نے ابوالفضل کے مشورے سے بدایونی کو جامع رشیدی کے انتخاب و ترجمہ کا حکم دیا۔ انھوں نے اس انتخاب میں عباسی، مصری اور اموی خلفا کے شجرے کو جس کا سلسلہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر اُن سے درجہ بدرجہ تمام انبیا اور آدم علیہ السلام تک جا کر منتہی ہوتا ہے، عربی سے فارسی میں ترجمہ کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس انتخاب اور ترجمہ کو کتب خانہ شاہی میں داخل کیا۔

جلوس سلطانی کے چالیسویں سال (۱۰۰۳ھ کے رمضان المبارک کی آخری تاریخ) کو بادشاہ نے ابوالفضل سے کہا، کہ اگرچہ فاضل بدایونی اجمیر کی خدمت بھی خوب کر سکتا ہے، مگر ہم ترجمے کے لیے اُسے اکثر کتابیں دے دیتے ہیں، یہ خوب لکھتا ہے اور ہمارے خاطر خواہ لکھتا ہے۔ اسے جدا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ابوالفضل نے بھی اور دیگر امرا نے بھی اس کی تصدیق کی۔ اسی دن بادشاہ نے بدایونی کو حکم دیا کہ کشمیر کے بادشاہ سلطان زین العابدین نے جس افسانہ ہندی کا بحر الاسما کے نام سے فارسی میں ترجمہ کرایا تھا اور اس کا بیشتر حصہ باقی رہ گیا تھا، اس کی تکمیل کرو۔ [ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحر الاسما، سنسکرت کی ایک کہانی "کتھا ساگر" کا ترجمہ ہے]۔ چنانچہ یہ کام شروع کر دیا گیا اور اس کتاب کی آخری جلد کا ترجمہ، جو ساٹھ اجزا کی ضخامت کو محیط تھا، پانچ مہینے میں مکمل ہو گیا۔ اس اثنا میں بادشاہ نے ایک شب خواب گاہِ خاص میں اپنے تخت کے قریب بدایونی کو بلایا اور تمام رات صبح تک ہر باب کی حکائتیں سنتا رہا۔ پھر حکم دیا کہ بحر الاسما کی پہلی جلد کا ترجمہ، جو سلطان زین العابدین نے کرایا تھا، قدیم اور غیر متعارف فارسی زبان میں ہے، اس کو مروجہ اور مانوس فارسی زبان میں منتقل کر دو اور اپنے اس ترجمے کے مسودہ کو حفاظت سے رکھو۔ بدایونی نے حسب الحکم یہ کام شروع کر دیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر نہایت مہربانی سے دس ہزار تنکہ اور گھوڑا انعام میں عطا فرمایا۔ بدایونی کہتے ہیں۔ میں نے کہا، ان شاءاللہ یہ کتاب ان ہی دو تین مہینے میں بحُسن و خوبی مرتب ہو جائے گی۔

بدایونی کی ایک نہایت اہم اور معروف تصنیف "منتخب التواریخ" ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۹۹۹ھ میں لکھنا شروع کی تھی۔ اس میں سبکتگین کے عہد سے لے کر ۱۰۰۴ھ تک کے شاہانِ عہد کے حالات (کہیں قدرے مفصل اور کہیں مجمل) مرقوم ہیں۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے حالات اس میں بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اکبر کے مذہبی افکار

پر کھل کر بحث کی ہے اور اس کو سخت الفاظ میں نشانۂ تنقید بنایا ہے۔ اُس دَور کے علما و مشائخ، اکبر کے ندما و مصاحبین اور دربار کی شخصیتوں کا بھی ذکر کیا ہے اور جن لوگوں نے بادشاہ کو گمراہی کے راستے پر لگایا اور جن افراد نے اس سلسلے میں اس کی تائید یا مخالفت کی، ان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ پھر اس ضمن میں جن لوگوں نے بادشاہ سے کسی قسم کی مراعات حاصل کیں اور جن کو مخالفت کی وجہ سے کسی نوع کی سزائیں دی گئیں ان کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ اس میں نہ بادشاہ کی کوئی بات مخفی رکھی ہے اور نہ اس کے مویدین و مخالفین کے بارے میں کسی قسم کی رعایت سے کام لیا ہے۔ جو بات دیکھی یا سنی حوالۂ قرطاس کردی۔ اس باب میں جو واقعہ بیان کرتے ہیں، سخت طنزیہ انداز میں کرتے ہیں۔ محرم ۱۰۰۴ھ میں کچھ لوگ اکبر کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ ان ایام کے واقعات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

”انھی دنوں چند اشخاص، اخلاصِ چہارگانہ کے مریدوں میں داخل ہوئے۔ داڑھیوں کی صفائی کی۔ ان میں بعض تو ایسے عالم تھے کہ اپنے آپ کو فاضلِ اجل سمجھتے تھے۔ بعض خرقہ پوش خاندانی مشائخ تھے۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد ہیں، اور یہ کہ ان کے شیخ طریقت کا ارشاد ہے کہ بادشاہِ ہند سے لغزش ہوئی ہے، تم ہی جا کر ان کو بچا سکو گے وغیرہ وغیرہ“۔ بدایونی ایسے لوگوں کا خوب مضحکہ اڑاتے ہیں، اور لکھتے ہیں ”موتراشِ چند“ ان کی تاریخ نکلی۔

لیکن اپنے جن رفیقوں اور ساتھیوں پر وہ بھرپور طنز کرتے ہیں، ان کی وفات اور دائمی جدائی پر انتہائی افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ کاروانِ حیات کے پرانے رفقائے سفر کے خیمے اس دنیا سے اکھڑ رہے ہیں اور موت ان کو ایک ایک کرکے اس عالمِ فانی سے ہمیشہ کے لیے دوسرے جہان میں لے جا رہی ہے، تو قلم دریائے غم کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے اور انتہائی افسردہ دلی کا شکار ہو جاتے ہیں ــــ ۱۰۰۳ھ کے اواخر میں لکھتے ہیں:

”دو اور قلبی دوست دنیا سے رخصت ہو گئے۔ شیخ یعقوب کشمیری صرفی جو بادشاہ سے رخصت لے کر وطن گئے تھے، وہیں موت کی آغوش میں چلے گئے۔ انا للہ و انا

الیہ راجعون ط

یاراں ہمہ رفتند و در کعبہ گرفتند   ماسست قدم بر درِ خمار بماندیم
از نکتۂ مقصود نشد فہم حدیثے   لا دین و لا دنیا بیکار بماندیم

"۲۷ ذی الحجہ کو حکیم عین الملک بھی سفرِ آخرت اختیار کر گئے۔[۱۷۶]"

اپنے ہم صحبت لوگوں کی موت پر حزن و ملال کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سبحان اللہ! دیکھتا ہوں کہ تمام دوست احباب اس رفاقت و صحبت سے بے زار ہو کر ایک ایک کر کے منزلِ آخرت کو روانہ ہو گئے اور جو باقی ہیں، وہ روانہ ہو رہے ہیں۔ ہم اسی سیاہ دلی اور پریشان حالی میں انجام سے غافل ہو کر بے ہودگی میں عمر برباد کر رہے ہیں:

اے دل چو آگہی کہ فنا در پے بقاست   ایں آرزوے دور و دراز از پے چراست
با روزگار عہد تو بستی، نہ روزگار   پس ایں نفیر چیست کہ ایام بے وفاست

"محرم ۱۰۰۴ھ میں حکیم حسن گیلانی نے بھی وفات پائی۔ نہایت درویش نہاد، مہربان اور مخلص آدمی تھے:

بے خار اگر گلے میسّر بودے   ہر دم بہ جہاں لذت دیگر بودے
زیں کہنہ سرائے زندگانی مارا   خوش بودے، اگر نہ مرگ بر در بودے

اسی سال ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ کو فیضی نے انتقال کیا۔ اس کی موت کا ذکر بدایونی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ بدایونی کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

ملک الشعرا شیخ فیضی متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مثلاً ضیق النفس، استسقا، ورم، خونی قے وغیرہ کئی امراض نے اس کو گھیر رکھا تھا۔ چھ مہینے تک وہ ان امراض کی سختیاں برداشت کرتا رہا۔ آخر ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ فیضی کو کتوں کے ساتھ بڑا اُنس تھا اور وہ رات دن کتوں میں گھرا رہتا تھا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ سکراتِ موت کے وقت اس

۱۷۶؎ حکیم عین الملک بادشاہ کی طرف سے راجی خاں کے پاس ایلچی بن کر گئے۔ وہاں سے ہنڈیہ گئے جو ان کی جاگیر تھی۔ وہیں وفات پائی۔ حکیم صاحب اور جلال خاں قورچی کی وساطت سے بدایونی دربارِ اکبر میں پہنچے تھے۔

کے منہ سے کتے کی آواز نکل رہی تھی۔ فیضی اسلام کا قطعی منکر اور بے دینی کا سخت حامی تھا۔ چنانچہ مرنے سے پہلے تک وہ ایک عالم شریعت سے بے ہودہ اور کافرانہ باتیں کرتا رہا۔ اس کی تاریخ وفات ہے ــــ "دے فلسفی وشیعی ودہری"ــــ ایک دوسری تاریخ ہے ــــ "قاعدۂ الحاد شکست"ــــ

فیضی کے نزع کے وقت بادشاہ سلامت آدھی رات کو اس کے پاس گئے اور اس کا سر اپنے ہاتھوں میں تھام کر آوازیں دیں کہ "شیخ جیو، ہم حکیم علی کو ساتھ لے کر آئے ہیں، تم آخر بات کیوں نہیں کرتے"۔ لیکن فیضی اپنے ہوش وحواس کھو چکا تھا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جب دوبارہ بادشاہ نے آواز دی تو اپنی پگڑی زمین پر گرا دی۔ اس کے بعد شیخ ابوالفضل کو تسلی دے کر بادشاہ وہاں سے چلا گیا۔ اسی وقت خبر ملی کہ وہ جاں نثار رخصت ہو گیا۔

چند روز بعد حکیم ہمام بھی دنیا سے منہ موڑ گئے۔ ان سے دوسرے روز کمال الدین صدر بھی رخصت سفر باندھ گئے۔ بدایونی لکھتے ہیں۔ ان کی موت واقع ہوتے ہی دونوں کے گھروں پر بادشاہی پہرے دار بیٹھ گئے اور مال خانے مقفل کر دیے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کے مردے بھی کفن کے کپڑے کے محتاج ہو گئے۔

یہ جلال الدین اکبر کے جلوس تخت کا چالیسواں سال ہے اور یہیں تک کے حالات منتخب التواریخ میں مرقوم ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف سے بدایونی جمعے کے روز ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ کو فارغ ہوئے۔ کتاب ختم کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔ اردو ترجمہ:

"میرے سودائی قلم نے دیوانہ وار ہر آشنا اور اجنبی کا دامن پکڑنے کی کوشش کی ہے اور اپنے جنون کے ہر قطرے کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا۔ نہ معلوم میرے بعد آنے والے اس نقش زاغ پا کو دیکھ کر کیا کہیں گے اور کیا رائے قائم کریں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ میرے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو میں نے دوسروں کے ساتھ کیا۔

مرا تو عہد شکن خواندہ ومی ترسم
کہ با تو روز قیامت ہمیں عتاب رود

تاہم مجھے توقع ہے کہ نکتہ شناس اس بات کو نظر انداز نہیں کریں گے کہ میری یہ تمام آفرین و نفرین شرع مبین کی حمایت اور دین متین کی طرف داری کے لیے ہے ... اگر دوسروں کو بھی دینی

خدمت کا درد اسی طرح دامن گیر ہو جائے اور وہ میرا احتساب کرنا چاہیں تو بسم اللہ، میں ان پر قربان، جو میرے عیوب سے مجھے آگاہ کریں۔ ورنہ وہ شرم سے گریبان میں منہ چھپالیں۔

" اصل میں دیکھا جائے تو میرا یہ بلند پرواز و تیز منقار قلم علامتِ قربِ قیامت کے دابۃ الارض کی مانند ہے، جو اس آخری زمانے کے لوگوں کی پیشانیوں پر "یہ مسلم" — "وہ کافر" کے نشان لگا گیا، اور کسی کو رحمت کا مستحق اور کسی کو لعنت کا سزاوار ٹھہراتا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عرب کے مشرکوں اور قریش کے سرداروں پر لعنت بھیجی ہے ۔ ۔ ۔

" ارباب تصنیف و اصحابِ تالیف کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنی اچھی بُری کاوشوں کو قلم بند کرکے اہلِ زمانہ پر بڑا احسان جتاتے ہیں، اور اپنی تصنیف کو کسی نہ کسی کے نام منسوب کرکے اپنے اغراض و منافع کی راہ نکال لیتے ہیں۔ میں اس روش کے خلاف کسی طمع اور توقع کے بغیر اپنے سے بعد میں آنے والوں کے لیے ایک تحفہ چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ وہ لوگ جو ہمارے دَور کے حالات و حقائق سے آگاہ ہونے کے متمنی ہوں، اس سے استفادہ کر سکیں:

اگر شراب خوری جرعۂ فشاں بر خاک
ازاں گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک

" اس انتخاب (یعنی منتخب التواریخ) کی ترتیب کا بنیادی سبب یہی ہے کہ موجودہ زمانے میں احکامِ دین میں جس طرح تغیر و تبدل کیا جا رہا ہے، اس کی گزشتہ ہزار سال میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہر وہ شخص جو دو حرف لکھنے پڑھنے کی استطاعت رکھتا ہے، وہ اصحابِ اقتدار کی خوشامد یا دین سے ناواقفیت یا اصل حالات سے لاعلمی کی بنا پر یا دیگر فاسد اغراض کی وجہ سے حق پوشی سے کام لینے لگا ہے اور دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے، باطل کو حق بنا کر پیش کرنے اور کفریات و لغویات کو خیرات و حسنات ثابت کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالۡہُدٰی فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُہُمۡ۔ (البقرہ: ۱۶)

(یہی وہ لوگ ہیں، جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لے لی ہے، لیکن ان کی یہ تجارت فائدہ مند نہ ہو گی)

" یہ وہ باطل امور اور خرافات و لغویات ہیں کہ آئندہ نسلوں کے لوگ انھیں دیکھ کر سخت

تذبذب اور تردد میں پڑ جائیں گے، اس لیے میں نے جو کہ ان معاملات سے بخوبی آگاہ ہوں بلکہ اس گورکھ دھندے میں مبتلا رہا ہوں، ضروری سمجھا کہ اپنے ان مشاہدات و روایات کو، جو چشم دید حقائق پر مبنی ہیں، کسی قسم کے ظن و تخمین کا نتیجہ نہیں ہیں، قلم بند کر دوں۔

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

تاکہ یہ چیز میری سابق بے ہودہ نگاری کا کفارہ ہو جائے اور اہلِ اسلام پر میری اس خدمت کا حق ثابت ہو جائے:

مگر صاحب دلے روزی برحمت
کند در کار ایں مسکین دعائے

مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ یہ مسودہ ایک بیاض کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں چند معلومات درج کر دی گئی ہیں۔ اس پر مستقل تصنیف یا تالیف کے بھاری بھرکم نام کا اطلاق نہیں ہو سکتا . . اب تو اللہ سے دعا اور مناجات کا وقت ہے اور بس۔

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردم بگوہر شناس

. . . "میں نے بروز جمعہ ۲۳ رجمادی الاخری ۱۰۰۴ھ کو اپنے راہوارِ قلم کی باگیں کھینچ لیں اور جو کچھ لکھا گیا اسی کو کافی سمجھا۔ بطور تعمیہ یہ قطعہ تاریخ کہا گیا ہے:

شکر للہ کہ باتمام رسید
منتخب از کرم ربانی
سال تاریخ ز دل جستم گفت
انتخابی کہ ندارد ثانی

منتخب التواریخ کی تصنیف کے ٹھیک دس سال بعد ۱۳ رجمادی الاخریٰ ۱۰۱۴ھ کو جلال الدین اکبر کا انتقال ہوا۔ لیکن خود بادشاہ کو یا اس کے کسی مصاحب اور درباری کو اس کتاب کا علم نہیں ہو سکا۔ اس عرصے میں یہ مسودہ بالکل محفوظ صورت میں بدایونی کے وارثوں کے قبضہ و تحویل میں رہا۔ جہاں گیر کے عہد میں اس کتاب نے شہرت پائی۔ مولانا محمد حسین آزاد

کے بقول یہ کتاب جہاں گیر" بادشاہ نے بھی دیکھی"[۱۷۷] اور ایک حکم کے ذریعے بدایونی کی اولاد اور وارثوں کو گرفتار کر کے دربار میں طلب کیا اور فرمان جاری کیا کہ بدایونی نے اس کتاب میں میرے باپ [اکبر] کو بدنام کیا ہے، لہٰذا اس کے بیٹے اور دیگر متعلقین کو قید میں ڈالا جائے اور اس کا گھر لوٹ لیا جائے۔ لیکن بدایونی کی اولاد نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہم خورد سال تھے، ہمیں اس کتاب اور اس کے مندرجات کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ چنانچہ جہاں گیر بادشاہ نے ان سے مچلکے لیے کہ ان کے ہاں کتاب پائی جائے تو جو چاہے سزا دی جائے۔ جہاں گیر نے کتب فروشوں سے بھی مچلکے لیے کہ وہ یہ کتاب نہ خریدیں گے نہ بیچیں گے۔ جہاں گیر کی اس خفگی اور سختی کی وجہ سے اس عہد یا اس کے متصل بعد تاریخ کی جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سے کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

البتہ خافی خاں جس نے شاہ جہان سے محمد شاہ تک کا زمانہ دیکھا ہے، تعجب کے ساتھ لکھتا ہے کہ جہاں گیر بادشاہ کے اس تشدّد کے باوجود دارالخلافہ میں کتب فروشوں کی دکانوں پر سب سے زیادہ بدایونی کی کتاب ہی نظر آتی ہے۔

شاعری

ملاّ عبدالقادر بدایونی شاعر بھی تھے اور قادری تخلص کرتے تھے، ان کی بعض نظمیں محمد حسین آزاد نے دربارِ اکبری میں نقل کی ہیں۔ مرثیے بھی درج کیے ہیں۔ اپنے چھوٹے بھائی شیخ محمد کی وفات پر انھوں نے جو مرثیہ لکھا، وہ بڑا مؤثر اور درد میں ڈوبا ہوا ہے، لیکن بقول آزاد" ملاّ صاحب کی زبان میں نظم کا ڈھب ایسا نہیں جیسا نثر کا"

دورِ اکبری کا آئینہ

ملاّ عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ کو دورِ اکبری کے آئینے کی حیثیت حاصل ہے، جس میں اس زمانے کے تمام واقعات کو بخوبی دیکھا اور پرکھا جاسکتا، بدایونی کے یہ حالات ان کی اسی تصنیف سے لیے گئے ہیں۔ یہ حالات کسی ایک جگہ مرقوم نہیں بلکہ ضخیم فارسی کتاب کے

---

[۱۷۷] دربارِ اکبری۔ ص ۱۶۲

مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے ہیں، جو جمع کر کے ان صفحات میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ ان کا تذکرہ اگرچہ ان کے عہد سے بہت بعد کی بعض دیگر کتابوں میں موجود ہے مگر نہایت مختصر اور مجمل صورت میں۔[۱]

تاریخ کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جس شخص نے عہدِ اکبری کے واقعات اس درجہ مفصل طور سے بیان کیے اور اس دور کے علما و فضلا کو اتنی تفصیل سے بعد میں آنے والوں سے متعارف کرایا اور ان کی علمی، مذہبی، دینی اور درباری زندگی کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا، اس کا صحیح تعارف کرانے اور اس کے سوانح ضبطِ تحریر میں لانے کی کسی کو توفیق نہ ہوئی — بدایونی دورِ اکبری کا چشم دید گواہ اور عینی شاہد ہے، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اس کی اس کتاب کے مندرجات کی صحت کو مشکوک ٹھہرایا جائے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان میں علم و علما کے اعتبار سے جلال الدین اکبر کا عہد نہایت زرخیز تھا، اکبر کے مذہبی افکار سے قطع نظر (جو ایک خاص دور سے تعلق رکھتے ہیں) یہ ماننا پڑے گا کہ جتنا علمی اور ثقافتی کام اس عہد میں ہوا ہے اور کسی بادشاہ کے عہد میں نہیں ہوا، اور برّصغیر کی قدیم کتابوں کے جس قدر تراجم اس زمانے میں ہوئے ہیں، اور کسی زمانے میں نہیں ہوئے۔ بدایونی کی منتخب التواریخ جہاں اکبر کے مذہبی افکار و رجحانات کی وضاحت کناں ہے، وہاں اس دور کی علمی، تہذیبی اور ثقافتی خدمات کی بھی پوری طرح عکاس ہے۔ افسوس ہے، عہدِ جہاں گیری اور اس عہد کے معاً بعد کے مورخین اور تذکرہ نویسوں نے بدایونی کا ذکر نہ کر کے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا، اور یہ ان کی خاص مصلحتوں کا نتیجہ ہے، ورنہ اس کی یہ کتاب تو جہاں گیر کے عہد ہی میں کتب فروشوں کی دکانوں پر آگئی تھی۔

وفات

اسی سال یعنی ۱۰۰۴ھ کو بدایونی نے کتاب ختم کی اور اسی سال کے آخر میں خود ان کی اپنی

---

[۱] مثلاً دیکھیے: مآثر الکرام، دفتر اوّل۔ ص ۲۷ تا ۲۹ — تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۲۷ — دربارِ اکبری۔ ص ۴۱۹ تا ۴۶۲ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۳۷ تا ۲۴۰ — اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور۔ ج ۴، زیرِ لفظ بدایونی۔ ص ۱۴۳، ۱۴۴ — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ ص ۲۴۵ تا ۲۴۷۔

کتابِ حیات ختم ہوگئی۔ بدایونی نے کل ستاون۵۷ برس عمر پائی اور اس مختصر عمر میں لیل و نہار کی بے شمار گردشوں کا مشاہدہ کیا اور بہت سے تغیر و انقلاب سے دوچار ہوئے۔ علم و تصنیف اور ترجمے کا بہت کام کیا۔ اپنے وطن ــــ بدایوں ــــ سے انھیں بڑا پیار تھا۔ باربار رخصت لےکر وطن جاتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ بادشاہ ان کی رخصتوں پر ناراض ہوتا ہے مگر وہ اس کی پروا نہ کرتے تھے۔ زندگی کے آخری دنوں میں بھی وطن گئے، وہیں وفات پائی اور وہیں پیوندِ خاک ہو گئے:

آخر گلِ اپنی خاک درِ میکدہ ہوئی ۔۔۔ پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

بدایونی بڑے باکمال آدمی تھے، کمال خوب صورتی سے انھوں نے یہ کتاب لکھی اور عمدہ انداز سے اس میں اپنے معاصرین کا تذکرہ کیا، اور ان کی موت پر قلم کے ذریعے خون کے آنسو بہائے۔ لیکن افسوس ہے، بدایونی کی شان کے مطابق کسی نے ان کا افسوس نہ کیا۔ وہ اپنی کتاب میں مُردوں کو زندہ کر گئے، مگر ان کے عہد میں یا اس سے کچھ بعد خود ان کا تذکرہ کسی نے اس اسلوب سے نہ کیا کہ جس سے ان کی خوبیاں اجاگر ہو سکیں۔ حالات نے نہ ان کی زندگی میں ان کا ساتھ دیا، نہ ان کے بعد کچھ عرصے تک ان سے توافق کی کوئی صورت پیدا ہو سکی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمال و عمدگی کو عام طور پر وہ درجہ نہیں دیا جاتا، جس کا وہ درحقیقت مستحق ہوتا ہے۔ بدایونی نے بلاشبہ شہرت پائی لیکن موت کے کچھ عرصہ بعد۔ احالات آہستہ آہستہ ایسے قالب میں ڈھلے کہ اس دور کی صحیح تصویر کو سامنے لانے کے لیے صرف ان ہی کی کتاب ــــ منتخب التواریخ ــــ کو بنیادی اور اصل مآخذ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

بدایونی کا مدفن اور اولاد

مُلّا عبدالقادر بدایونی بدایوں کے قریب مدفون ہیں۔ ان کے مدفن اور اولاد کے بارے میں آج سے سو برس پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے دربارِ اکبری میں خوشگو کے تذکرے کے حوالے سے لکھا تھا:

(بدایونی) باغ انبہ واقع عطاپور نواح بدایوں میں دفن ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ اُس وقت یہ نام اور مقام ہوں گے۔ اب شہر سے دور ایک کھیت میں تین چار قبریں ہیں، ان پر تین چار درخت آم کے ہیں، اور

یہ مُلّا کا باغ کہلاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان ہی میں مُلّا صاحب کی قبر بھی ہے۔ غالباً خوشگو کے بعد یہ مقام کبھی مُلّا کا باغ بھی کہلایا ہوگا۔ عطاپور اور باغ انبہ کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ البتہ جس محلے میں ان کے گھر تھے، اب بھی لوگوں میں زبان زد ہے، اور پتنگی ٹیلہ کہلاتا ہے۔ سید بارہ میں ہے، مگر ٹیلہ یا گھر کا اثر آثار کچھ نہیں۔ وہاں کے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ [ملّا عبدالقادر بدایونی کی] اولاد کا سلسلہ ایک بیٹی پر ختم ہوگیا تھا، اور اس کی نسل خیرآباد علاقہ اُودھ میں باقی ہے[۱۷۹]

مُلّا عبدالقادر بدایونی کے واقعات کے سلسلے میں ضروری مواد ان صفحات میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اور بھی بعض باتیں ان کی تصنیف منتخب التواریخ میں مرقوم ہیں، مگر خوفِ طوالت سے انھیں ترک کر دیا گیا ہے۔

۳۳۔ شیخ عبدالقادر بخاری اکبرآبادی

شیخ عبدالقادر بخاری اکبرآبادی، اپنے عصر کے فاضلِ کبیر اور فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے ماہر تھے۔ اکبرآباد (آگرہ) میں ان کا درس و افادہ کا سلسلہ جاری تھا۔ طریقت و تصوف سے بھی تعلق تھا اور مشائخ قادریہ میں سے گردانے جاتے تھے۔ ان سے علما و مشائخ کی ایک بڑی جماعت نے استفادہ و استفاضہ کیا۔ ۱۰۵۰ھ کو اکبرآباد میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے[۱۸۰]۔ اسلامی ہند کے گیارھویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

۳۴۔ مفتی عبدالقدوس امروہی

مفتی عبدالقدوس بن عبدالغفور بن عبدالملک حسینی امروہی، ہندوستان کے صوبہ یو۔پی کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ عالم باعمل اور اللہ کے نیک

---

[۱۷۹] دربار اکبری۔ ص ۴۶۱

[۱۸۰] خزینۃ الاصفیا۔ ص ۱۵۲ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۴۰

بندے تھے۔ ان کے والد مفتی عبدالغفور امروہی بھی عالمِ دین تھے۔ مفتی عبدالقدوس نے علمِ فقہ کی تحصیل ان ہی سے کی، اور ان کی وفات کے بعد ۹۹۰ھ کو مسندِ افتا پر متمکن ہوئے۔ ۱۰۶۲ھ تک اس منصب پر فائز رہے۔ غالباً وفات بھی اسی سال ہوئی، اس لیے کہ اسی سال ان کے بیٹے مفتی محمد شاہد ان کی جگہ مسندِ افتا پر بیٹھے[۱۸۱]

۳۵۔ ملا عبدالکریم پشاوری

مُلّا عبدالکریم بن اخوند درویزہ حنفی پشاوری، شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ واعظ اور مبلّغ علمائے دین میں سے تھے۔ طریقت سے بھی تعلق تھا اور اس سلسلے میں شیخ علی غواص ترمذی سے فیض یافتہ تھے، ان کے والد اخوند درویزہ بھی ان ہی سے مستفیض تھے۔ جامع طریقت و حقیقت تھے۔ ان کے والد اخوند درویزہ پشاوری بھی بہت بڑے عالم تھے[۱۸۲] دادا کا نام اخون گدا تھا، یہ بھی عالم تھے، لیکن مُلّا عبدالکریم تو علم و فضل میں اونچے مرتبے کے حامل تھے۔ خلاصۃ البحر میں انھیں "محققِ افغانستان" کا خطاب دیا گیا ہے۔ ان کے والد بزرگوار اخوند درویزہ کی تصنیفات میں سے ایک کتاب مخزن الاسلام ہے، اس کے دو باب جو حقائق و معارف سے متعلق ہیں، ان ہی ملا عبدالکریم پشاوری کے تصنیف کردہ ہیں۔ ان ابواب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ صاحبِ دل بزرگ تھے، اونچے ذوق و شوق کے حامل اور روحانی مرتبے پر فائز تھے۔ والدِ محترم کی طرح ظاہری اور باطنی علوم سے آراستہ تھے، اور ان ہی کی طرح شعر بھی کہتے تھے۔ اشعار میں انھوں نے اخوند کریمیہ کا لقب اختیار کیا ہے، اور زیادہ تر اسی لقب سے مشہور ہیں۔

مُلّا عبدالکریم پشاوری اپنے والد اخوند درویزہ کی طرح بہت بڑے مبلغ و واعظ بھی تھے۔ انداز وعظ و تبلیغ بڑا مؤثر اور میٹھا تھا۔ باپ کی طرح ان سے بھی بے شمار لوگوں نے فیض

---

۱۸۱ نخبۃ التواریخ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۸۱

۱۸۲ تفصیل کے لیے دیکھیے: فقہائے ہند۔ ج ۴، حصۂ اول، ص ۱۶۵ تا ۱۷۵

حاصل کیا اور تعلیم دین سے آراستہ ہوئے۔ گیارھویں صدی ہجری میں افغانوں میں انھوں نے اسلام کی بے حد تبلیغ کی اور لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو احکامِ دین سے روشناس کرایا۔ عہدِ شاہ جہانی میں یہ دونوں باپ بیٹا ــــ اخوند درویزہ اور مُلّا عبدالکریم پشاوری ــــ افغان قبائل میں اسلام کے نامور داعی اور دینِ حق کے زبردست مبلّغ تھے۔

مُلّا عبدالکریم پشاوری نے ۱۰۷۲ھ کو وفات پائی اور یوسف زئی علاقے میں مدفون ہوئے۔[۵۸۳]

۳۶- مولانا عبدالکریم سلطان پوری لاہوری

گیارھویں صدی ہجری میں برِّ صغیر کے دوسرے بلاد و امصار کی طرح لاہور بھی علم و فضل کا مرکز تھا۔ اس میں جن علمائے کرام کے درس و افادہ کا سلسلہ جاری تھا، ان میں مولانا عبدالکریم بن عبداللہ بن شمس الدین سلطان پوری لاہوری کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ یہ درحقیقت سلطان پور کے رہنے والے تھے، جو مشرقی پنجاب کے علاقہ کپورتھلہ میں ایک قصبہ ہے۔ بعد کو لاہور چلے گئے تھے، اس لیے دونوں شہروں کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ سلطان پوری بھی کہلائے اور لاہوری بھی۔!

مولانا عبدالکریم سلطان پوری، دسویں صدی ہجری کے مشہور عالم مولانا عبداللہ سلطان پوری کے صاحب زادۂ گرامی قدر تھے۔ مولانا عبداللہ نے ہندوستان کے چار عظیم الشان بادشاہوں ــــ نصیر الدین ہمایوں، شیر شاہ سوری، سلیم شاہ سوری اور جلال الدین اکبر ــــ کا زمانہ پایا تھا۔ ان بادشاہوں کے نزدیک ان کو بڑی عزت و منزلت حاصل تھی اور ان کے عہد میں یہ صدر الاسلام اور شیخ الاسلام کے منصب رفیع پر فائز رہے تھے۔ بہت بڑے عالم اور ملک کی عظیم شخصیت تھے۔ جلال الدین اکبر کے عہد میں ان کو

---

۵۸۳ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۳۱ ــــ حدائق الحنفیہ۔ ص ۴۱۷ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۴۲ ــــ خزینۃ الاصفیا۔ ص ۴۷۹ ــــ ادبیاتِ سرحد۔ ص ۱۵۳ ــــ رودِ کوثر۔ ص ۴۱۹ ــــ معارج الولایت۔ ج ۲، ص ۱۳۶

زوال ہوا، اور اسی عہد میں انتقال کیا[۱۸۴]

مولانا عبد الکریم سلطان پوری نے کتبِ درسیہ اپنے والدِ بزرگوار مولانا عبد اللہ سلطان پوری سے پڑھیں اور طریقت کی منزلیں شیخ نظام الدین بن عبد الشکور تھانیسری کی خدمت میں رہ کر طے کیں۔ مولانا عبد الکریم لاہوری اپنے والد کی وفات کے بعد لاہور میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے لاہور میں یہ فقہ و اصول کے جیّد عالم اور علومِ عربیہ کے ماہر استاذ تھے۔ بڑے نیک، شیخ وقت اور صالح بزرگ تھے۔ دو مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ پہلی مرتبہ اپنے والد مولانا عبد اللہ سلطان پوری کے ساتھ، دوسری مرتبہ ان کی وفات کے بعد۔!

تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ فصوص الحکم کی فارسی زبان میں شرح لکھی۔ اور ایک رسالہ "اسرار العجیبہ" کے نام سے سپردِ قلم کیا جو افکار و اشغال پر مشتمل ہے۔

مولانا عبد الکریم سلطان پوری لاہوری نے ۲۷ رجب ۱۰۴۵ھ کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے[۱۸۵]

۷۳۔ مفتی عبد الکریم گجراتی

عبد الکریم بن محب الدین بن علاء الدین خرقانی نہروالی گجراتی مفتی بہاء الدین ابو الفضائل مکی، دوشنبہ کے روز ۱۹ شوال ۹۶۱ھ کو علاقہ گجرات کے شہر احمد آباد میں پیدا ہوئے۔ یہ درحقیقت نہروالا کے باشندے تھے، جو صوبہ گجرات کا ایک شہر ہے۔ ان کا گھر نہروالا میں علم و فضل کا مرکز اور طریقت و تصوف کا گہوارہ تھا۔ ان کے جدِّ امجد علامہ علاء الدین نہروالی

---

۱۸۴ ان کے حالات میں تفصیل کے لیے دیکھیے: فقہائے ہند۔ ج ۳، ص ۲۳۶ تا ۲۵۶

۱۸۵ خزینۃ الاصفیا۔ ص ۴۷۰، ۴۷۱۔ ـــــ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۳۱ ـــــ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۴۳

دسویں صدی ہجری کے اعیانِ ہند میں سے تھے۔

مفتی عبدالکریم اپنے والدِ گرامی شیخ محب الدین کے ساتھ مکہ مکرمہ گئے اور وہیں نشوو نما پائی۔ بڑے ہوئے تو اپنے عمِ محترم مفتی قطب الدین نہروالی سے وابستہ ہوگئے۔ ان سے علمِ فقہ کی تحصیل کی اور بعض دیگر علوم کی کتابیں پڑھیں۔ شیخ عبداللہ سندھی اور علامہ شہاب الدین احمد ابن حجر ہیثمی سے علوم اخذ کیے۔ ابنِ حجر ہیثمی سے صحیح بخاری پڑھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کے علمی جوہر چمکے اور حلقہ اہلِ علم میں اپنے عصر کے منفرد عالم اور بے نظیر صاحبِ فضل وکمال قرار پائے، اسی وجہ سے ۹۸۲ھ کو مکہ مکرمہ کی مسندِ افتا پر متمکن ہوئے۔ ۹۹۰ھ کے لگ بھگ منصبِ خطابت بھی ان ہی کے سپرد ہوا، اور مکہ معظمہ کے مدرسہ سلطانیہ مرادیہ کے ناظم بھی مقرر کیے گئے۔

مفتی عبدالکریم گجراتی صاحبِ تصنیف بھی تھے۔ انھوں نے بعض نہایت عمدہ کتابیں لکھیں، جن میں صحیح بخاری کی شرح بھی شامل ہے، جو "النہر الجاری علی البخاری" کے نام سے موسوم ہے۔ افسوس ہے، لائق شارح یہ کتاب مکمل نہ کر پائے۔ دوسری اہم کتاب "الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام" ہے۔ یہ اس موضوع سے متعلق تاریخ کی ایک مختصر سی کتاب تھی جو ان کے چچا مفتی قطب الدین محمد نہروالی نے سپردِ قلم کی تھی، مفتی عبدالکریم نے اس میں بہترین اضافے کیے اور بہت سی عمدہ باتیں شامل کیں۔ اس کے بعد اس نام سے یہ کتاب اہلِ علم کے سامنے آئی۔ یہ کتاب کتبِ حوالہ میں سے ہے اور اپنے موضوع سے متعلق بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی تصنیف سے وہ یک شنبہ کے روز ۱۹ شعبان ۱۰۰۰ھ کو فارغ ہوئے۔

مفتی عبدالکریم گجراتی، علوم میں عبور رکھتے تھے اور تحقیقِ مسائل اور فہم وادراک میں انھیں امام کی حیثیت حاصل تھی۔ حافظہ تیز اور ذہن اخاذ تھا۔ زبان میں بہت اثر تھا اور تحمل اور نرمی سے بات کرتے تھے۔ مطالعے کا دائرہ وسیع تھا۔ فقہ کے عالم، اس کے احکام و قواعد سے باخبر اور مسائلِ فقہ میں مختلف ائمہ کی آرا اور اختلافی گوشوں سے آگاہ تھے۔

ادب میں دسترس رکھتے تھے اور اس کے نکات وغوامض کی زلفِ گرہ گیر کو سلجھانے

اور اس کی باریکیوں کی عقدہ کشائی میں اپنے دور کے بے مثل عالم تھے۔ اخبار و وقائع، احوالِ علما اور تاریخ و رجال پر بھی نظر تھی اور اس سلسلے کے بے شمار واقعات مستحضر تھے۔ گفتگو کرتے اور زبان کو حرکت دیتے تو اس کی پیچیدہ گرہیں کھلتی چلی جاتیں۔

اس ہندی عالم نے چہار شنبہ کے روز ۱۵ ذی الحجہ ۱۰۱۴ھ کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور اور قبرستان معلاۃ میں مدفون ہوئے[۱۸۶]

ان کے استاذ مفتی قطب الدین محمد نہروالی لاہوری

مفتی عبدالکریم گجراتی کے حالات کی مناسبت سے یہاں ان کے استاذِ محترم مفتی قطب الدین محمد کے حالات بھی درج کیے جاتے ہیں، جو عثمانی سلاطین کے محبوب عالمِ دین تھے۔ ان کے حالات پروفیسر ظہور احمد اظہر (اورینٹل کالج لاہور) نے ماہنامہ "المعارف" لاہور (بابت جون ۱۹۷۰ء) میں تحریر کیے تھے، وہیں سے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

لاہور کے مردم خیز خطہ نے عربی زبان اور اسلامی علوم کے جن نامور فضلا کو جنم دیا ہے، ان میں سے ایک مولانا مفتی قطب الدین محمد لاہوری بھی تھے۔ آپ علوم الحدیث کے نامور ثقہ اور مستند امام اور اسلامی تاریخ اور علومِ اسلامیہ کے جلیل القدر عالم ہونے کے علاوہ عربی ادب کے ماہر اور ایک عمدہ شاعر بھی تھے۔ مفتی صاحب کا شمار بجا طور پر امام حسن صغانی لاہوری اور اس قبیل کے دیگر جلیل القدر علما و فضلا میں کیا جا سکتا ہے، جو لاہور میں پیدا ہوئے اور پھر علوم و معارف کی تلاش میں دیارِ عرب گئے اور عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم کی تاریخ میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔

مفتی قطب الدین محمد ۹۱۷ھ (۱۵۱۱ء) میں لاہور میں پیدا ہوئے[۱۸۷] اور یہیں اپنے والد مولانا ابوالعباس علاء الدین احمد نہروالی سے عربی و اسلامی علوم کی متداول کتابوں کی ابتدا کی۔

---

[۱۸۶] خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر۔ ج ۳، ص ۸ ــــ نیز دیکھیے: الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۴۴، ۲۴۵

[۱۸۷] نزہۃ الخواطر۔ ج ۴، ص ۲۸۶ ــــ فہرس الفہارس۔ ج ۲، ص ۳۰۲

پھر ان کے ہمراہ حجاز چلے گئے۔ جہاں ایک طویل مدت تک ان کا خاندان مکہ میں تدریس اور افتا کے اعلیٰ منصب پر فائز رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کا خاندان خالص عربی خاندان تھا جو عدن سے ہجرت کر کے بلادِ گجرات میں وارد ہوا اور وہاں کے مشہور شہر نہروالا میں مقیم ہو گیا تھا۔ آپ کے بزرگوں کے نام یہ ہیں۔ مفتی قطب الدین محمد بن علاء الدین احمد بن شمس الدین محمد بن محمود قاضی خاں بن بہاء الدین بن یعقوب بن اسماعیل بن علی بن القاسم بن محمد بن ابراہیم بن اسماعیل حنفی خرقانی لاہوری ثم مکی، جو القطب النہروالی یا قطب الدین نہروالی (نہروانی غلط ہے) کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے۔ مفتی قطب الدین محمد کے پردادا شیخ محمود الملقب بہ قاضی خاں قاضی کے منصب پر فائز تھے، پھر نامعلوم اسباب کی بنا پر ان کے والد لاہور آ گئے، اور یہاں سے حجاز چلے گئے تھے۱۸۸

یوں تو مفتی قطب الدین کے آبا و اجداد علم و فضیلت کے مالک تھے ہی مگر ان کے والد کو یہ خصوصی شرف حاصل ہے کہ وہ اپنے عہد کے ثقہ اور مستند محدث تھے۔ اسی طرح ان کی والدہ ماجدہ خسران بنت شیخ شمس الدین محمد بن عمر و الانصاری الشافعی بڑی زاہدہ و پاک دامن خاتون تھیں اور اپنے عہد کے ثقہ راویانِ حدیث میں شمار ہوتی تھیں۱۸۹

مفتی قطب الدین کے والد علاء الدین احمد بن محمد نہروالی ثم مکی اپنے عہد کے جلیل القدر محدث اور عالم تھے۔ صاحبِ فہرس الفہارس نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں "خاتمۃ المحدثین و مفتی المسلمین"۱۹۰ کے القاب سے یاد کیا ہے۔ وہ ۸۷۰ھ میں نہروالہ صوبہ گجرات میں پیدا ہوئے اور اپنے عہد کے علما سے انھوں نے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ پھر نہروالہ سے لاہور آئے اور یہاں سے حجاز تشریف لے گئے، جہاں انھوں نے شیخ

---

۱۸۸ ایضاً۔ ۴ : ۲۵، ۲۸۶۔ ایضاً۔ ۲ : ۳۰۲۔ نیز دیکھیے : Stuart : A History of Arabic Literature, P. 377.

۱۸۹ فہرس الفہارس۔ ۲ : ۳۰۰

۱۹۰ ایضاً۔ ۲ : ۳۰۲

عزالدین عبدالعزیز اور دیگر علمائے حجاز سے حدیث کی سند لی اور ایک مدت تک مکہ میں احمد شاہ گجراتی کے مدرسہ میں تدریس کے منصب پر فائز رہے۔ مفتی قطب الدین نے خود اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے کہ بیت اللہ کے جوار میں قیام کے دوران ان کا یہ معمول تھا کہ یوم النحر کو جمرۃ العقبہ میں رمی کرنے کے بعد فوراً مکہ آجاتے۔ حطیم میں بیت اللہ کے سامنے بیٹھ جاتے۔ طواف کرنے والوں کو دیکھتے جاتے اور نمازِ مغرب تک اسی حالت میں بیٹھے رہتے۔ پھر مغرب کی نماز کے بعد سعی کرتے اور منیٰ کو لوٹ جاتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ہر سال اولیاء اللہ میں سے کوئی نہ کوئی حج کو ضرور آتا ہے۔ وہ اس موقع پر سب سے افضل کام کرے گا اور وہ ہے یوم النحر کے شروع میں طوافِ زیارت کرنا۔ میں اسی لیے یہاں بیٹھ جاتا ہوں تاکہ میں ان میں سے کسی کو طواف کرتے ہوئے دیکھ لوں یا ان کی نظر مجھ پر پڑے جو میرے لیے برکت اور سعادت کا باعث ہو[۱۹۱]۔ شیخ علاء الدین آخر عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے مگر انھوں نے پھر بھی یہ معمول ترک نہ کیا۔ ۹۴۹ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ بقول صاحب 'نزہۃ الخواطر' وہ بڑے نیک، دین دار، متقی اور پرہیزگار تھے[۱۹۲]۔

ایسے والدین کے ہاں جو بچہ پیدا ہوگا، اس کے علم و زہد اور تقویٰ و فضیلت کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ مفتی قطب الدین نے اپنے والدین کے علاوہ دیارِ عرب کے دوسرے جلیل القدر فضلا سے علومِ اسلامیہ کی سند لی جن میں شیخ احمد محب الدین بن محمد العقیلی النویری المکی، شہاب الدین احمد بن موسیٰ المغربی المصری، زین الدین علی القرمانی، جمال الدین محمد الخرقانی، عبدالعزیز بن جمال الدین العباسی القطبی الشافعی، شیخ عبدالحق سنباطی المصری، محمد بن محمد بن عبدالرحمٰن، الحطاب المالکی اور شیخ عبدالرحمٰن بن علی الربیع الشیبانی الزبیدی بھی شامل ہیں[۱۹۳]۔

---

[۱۹۱] الاعلام بالاعلام بیت اللہ الحرام
[۱۹۲] نزہۃ الخواطر۔ ۴ : ۲۶

[۱۹۳] تفصیل کے لیے دیکھیے، نزہۃ الخواطر۔ ۴ : ۲۸۵ — النور السافر۔ ص ۲۱۲، ۲۳۶ — البدر الطالع۔ ۱ : ۳۳۶ — الاعلام۔ ۷ : ۲۸۶ — شذرات الذہب۔ ۸ : ۲۸۵

مفتی قطب الدین کے اساتذہ میں سے ایک حافظ نورالدین ابوالفتوح احمد بن عبداللہ الطاؤسی الشیرازی الحنفی الخرقانی بھی ہیں، جو معمر محدثین یعنی طویل عمر پانے والے محدثین میں سے تھے اور خراسان کے ان صوفیا کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جو "طائفہ طاؤسیہ خرقانیہ" کہلاتا تھا۔[۱۹۴] حافظ ابوالفتوح بڑے نیک اور پرہیزگار صوفی اور محدث تھے انھوں نے شیخ بابا یوسف ہروی سے حدیث سنی تھی جو "سہ صدہا" یعنی تین سو سالہ کے لقب سے مشہور تھے۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں ان کا تذکرہ اکثر ملتا ہے، مفتی قطب الدین لاہوری نے حافظ ابوالفتوح سے اپنے والد کے واسطے سے بھی روایت کی ہے اور براہِ راست بھی۔ انھیں اس طریقِ اسنادِ حدیث پر بڑا فخر تھا، کیونکہ اس طرح وہ تساعی حدیث کا راوی ہونے کا شرف حاصل کرتے ہیں اور تساعی حدیث وہ ہے جس میں ایک محدث اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان آٹھ واسطے ہوں اور نواں وہ خود محدث ہو۔ اس سند کا متصل سلسلہ یوں ہے: قطب الدین محمد لاہوری عن الحافظ ابی الفتوح عن شیخ یوسف ہروی عن محمد بن شادبخت الفارسی عن یحییٰ بن عمار الختلانی عن محمد بن یوسف الفربری عن محمد بن اسماعیل البخاری صاحب الجامع الصحیح[۱۹۵]

مفتی صاحب نے تحصیلِ علوم کی خاطر مصر کا سفر بھی کیا تھا۔ اس سفر کے دوران انھوں نے جلال الدین سیوطی کے تلامذہ سے اکتسابِ فیض کیا۔ اسی طرح قاضی زکریا انصاری اور حافظ عبدالحق سنباطی سے بھی حدیث کی سند حاصل کی۔ یہ دونوں حافظ ابن حجر عسقلانی کے مشہور شاگرد[۱۹۶] تھے۔ سفرِ مصر کے دوران مفتی قطب الدین کو ایک اور اہم شخصیت سے ملاقات اور اجازتِ روایت کا شرف حاصل ہوا اور وہ تھے المتوکل الثالث محمد بن یعقوب العباسی جو بنو عباس کے ان برائے نام خلفا میں سب سے آخری خلیفہ تھے جو سقوطِ

---

[۱۹۴] دیکھیے: فہرس الفہارس - ۲ : ۲۷۴، ۳۰۴

[۱۹۵] نزہۃ الخواطر - ۴ : ۲۸۶ — فہرس الفہارس - ۲۹۹ — الامم - ص ۴ بعد

[۱۹۶] شذرات الذہب - ۸ : ۱۷۹ — فہرس الفہارس - ۲ : ۳۰۰

بغداد کے بعد مصر کے مملوکوں کے زیرِ اثر ایک مدت تک مسندِ خلافت پر فائز رہے اور بالآخر سلطان سلیم ثانی کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوگئے تھے۔ یہ محمد بن یعقوب خلیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ ادیب، عالم اور اچھے شاعر بھی تھے[۱۹۷]

مفتی صاحب نے اپنے سفرِ مصر اور عباسی خلیفہ متوکل ثالث محمد بن یعقوب سے اپنی ملاقات کے کوائف اپنی کتاب "الاعلام بالاعلام بیت اللہ الحرام"[۱۹۸] میں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"سلطنتِ عثمانیہ کے عہد تک اس عباسی خلافت کا نام باقی رہا اور خلیفہ یعقوب جس کا نام المستمسک باللہ تھا، سلطان سلیم خاں عثمانی کے عہد تک زندہ تھا۔ اگرچہ بوڑھا ہوگیا تھا اور بینائی جاتی رہی تھی۔ مستمسک باللہ ۹۲۷ھ میں فوت ہوگیا تو اس کے بعد اس کا بیٹا محمد بن یعقوب جانشین مقرر ہوا اور متوکل علی اللہ لقب اختیار کیا۔ سلطان سلیم نے جب مصر فتح کر کے چرکسی مملوکوں کا خاتمہ کر دیا تو متوکل کو اپنے ساتھ استنبول لے گیا۔ سلطان کی وفات کے بعد متوکل کو مصر آنے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ ۹۵۰ھ میں اپنی وفات تک وہ مصر میں مقیم رہا۔ بقول مفتی قطب الدین کے متوکل بڑا عالم و فاضل اور شاعر تھا۔ اس کے یہ دو شعر ہیں:

لم یبق من محسن یرجی دلا حسن　　ولا کریم الیہ مشتکی الحزن

وانما ساد قوم غیر ذی حسب　　ما کنت او ثران یمتد بی زمنی

نہ کوئی محسن باقی رہا جس سے کہ اچھائی کی امید ہو سکے اور نہ کوئی شریف باقی رہا ہے جس سے کہ رنج و الم کا شکوہ کر سکیں۔

اب تو حال یہ ہے کہ غیر شریف لوگ سردار بن گئے ہیں، اس لیے مجھے ہرگز گوارا نہ تھا کہ میری عمر لمبی ہو۔

---

۱۹۷ تاریخ ابنِ ایاس۔ ج ۴ : ۱۴۰ —— الاعلام بالاعلام بیت اللہ الحرام۔ ص ۸۴،

۱۹۸ ۱۸۴ بعد

خلیفہ سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مفتی صاحب لکھتے ہیں:[۱۹۹] "۹۴۳ھ میں جب میں حصولِ علم کی خاطر مصر گیا تو میں ان (متوکل ثالث) سے بھی ملا اور ان سے بہت کچھ اخذ کیا۔ اس زمانے میں مصر میں بڑے بڑے عالم و فاضل لوگ موجود تھے اور مشائخ کرام کی برکات بھی وہاں عام تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے مصر ایک دلھن ہے جو آفتاب و مہتاب اور ستاروں کے جھرمٹ میں رواں ہے:

ثم انقضت تلك السنون واھلھا فکانھا وکانھم احلام

پھر وہ زمانہ بھی بیت گیا اور اہلِ زمانہ بھی۔ اب یوں لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک خواب تھا۔

مفتی قطب الدین ترکوں کے محبوب عالمِ دین تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ترکوں کے دلوں میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے خلوص و محبت کے جو جذبات پائے جاتے ہیں، ان کا ایک بہت بڑا سبب ہمارے علمائے دین تھے جنھوں نے ہر مرحلے پر عثمانی ترکوں کی امداد و حمایت کو اپنے ایمان کا جزو سمجھا۔ ہر مشکل میں ان کے ساتھ رہے اور ان کی زبانی، قلمی اور مالی معاونت کرتے رہے۔ خصوصیت کے ساتھ وہ "ہندی" علما جو ترکی خلافت کے زمانے میں حرمین میں جا کر مقیم ہو گئے اور سلاطین آل عثمان کی خیر خواہی اور فتح و نصرت کے لیے ہر وقت دست بدعا رہے۔ مفتی قطب الدین بھی علما کے اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ترکوں کے دلوں میں جو قدر و منزلت پنہاں تھی، اس کا اندازہ امام شوکانی ایسے جلیل القدر محدث اور مورخ کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے مفتی قطب الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھے ہیں: "ترکوں کے ہاں انھیں بہت بڑی عزت اور منزلت حاصل تھی۔ ترک زعما و قائدین میں سے جب بھی کوئی حج کو آتا تو ان سے ملے بغیر واپس نہ لوٹتا۔ وہ مفتی صاحب کے مقابلے میں اور کسی عالم کو پسند نہ کرتے تھے اور انھیں بڑے بڑے عطیات سے نوازتے تھے۔ وہ ان گراں قدر عطیات سے نفیس قسم کی کتابیں خریدتے اور ضرورت مندوں کو دیتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس جو

---

۱۹۹ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام۔ ص ۱۸۵۔

ذخیرۂ کتب جمع ہو گیا تھا شاید ہی کسی اور عالم کے پاس ہو۔[۲۰۰]

خود مفتی صاحب کو ترکوں سے جو قلبی لگاؤ تھا، اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہو سکتا ہے:[۲۰۱] "حق و صداقت کی تلواریں صرف چار ہیں۔ ان کے علاوہ ہر تلوار آتش جہنم کے قابل ہے۔ ایک وہ شمشیرِ رسالت جو مشرکین کے خلاف اٹھی۔ دوسری وہ شمشیرِ صدیقی جو مرتدین و مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف نیام سے باہر آئی۔ تیسری شمشیرِ علوی جو باغیوں کی سرکوبی کے لیے بے نیام ہوئی۔ چوتھی شمشیرِ حق وہ ہے جو مسلمانوں کا قصاص کے لیے نیام سے نکالی جائے، اور آلِ عثمان کی تلواریں ان چار اصناف سے باہر نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ روزِ اول سے آج تک کفار و مشرکین کے خلاف مصروفِ جہاد ہیں۔ ملحدوں اور باغیوں کے سر کچل رہے ہیں اور دین اسلام کے شعائر اور مسلمانوں کی حفاظت و دفاع میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی سلطنت کا سایہ مسلمانوں پر عام کرے۔ ان کے ذریعہ اہلِ سنت کی تائید کرے اور ان کے سبب تمام ملحدین و مرتدین کا قلع قمع ہو۔ تمام فرقِ اسلامیہ کو یہ دعا کرنی چاہیے کیونکہ یہ سلاطین آلِ عثمان اسلام کے ستون، دینِ متین کو قائم کرنے والے اور دنیا میں اسے عام کرنے والے ہیں۔ اس سلطنتِ شریفہ کے لیے دعا کرنا اصل میں تمام اہلِ اسلام کے لیے دعا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دین کو عزت و سربلندی بخشنے اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی نصرت و امداد کرنے کے مترادف ہے۔"

ترک سلاطین سلیمان اعظم، سلطان سلیم خاں ثانی اور سلطان مراد خاں سے مفتی صاحب کے تعلقات رہے اور ان کی طرف سے انھیں وقتاً فوقتاً انعامات ملتے رہے۔ ۹۴۳ھ میں جب وہ استنبول گئے تو سلیمان اعظم کے دربار میں باریابی حاصل ہوئی۔[۲۰۲] سلطان مراد خاں سے تو ان کے بڑے گہرے روابط تھے۔ اس نے اپنے عہدِ سلطنت میں بیت اللہ کی تعمیر و اصلاح کی طرف توجہ دی۔ مکہ معظمہ میں ایک اسلامی درس گاہ قائم کی اور مفتی صاحب کو

۲۰۰ھ البدر المطالع۔ ۲ : ۵۷

۲۰۱ھ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام۔ ص ۳۸۸ ۲۰۲ھ ایضاً۔ ص ۲۹۹

مسندِ صدارت کا اعزاز بخشا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے ذاتی ملابس میں سے دو قیمتی شالیں ہدیۃً بھیجیں اور ایک سو دینار مقرر کیے۔[۲۰۳]

ترک وزرائے اعظم میں سے ایاس پاشا، سنان پاشا، لطفی پاشا اور علی پاشا کے ساتھ مفتی قطب الدین صاحب کے ذاتی مراسم تھے۔ ۹۴۳ھ میں جب انھیں استنبول کا پہلا سفر پیش آیا تو ایاس پاشا اس وقت سلیمان اعظم کا وزیرِ اعظم تھا، اور مفتی صاحب کے والد مولانا احمد علاؤالدین سے خط وکتابت رکھتا تھا۔ استنبول میں قیام کے دوران اس نے مفتی صاحب کی بڑی قدر ومنزلت کی اور خلیفہ سے ان کی ملاقات بھی کرائی۔[۲۰۴] سنان پاشا تو مفتی صاحب کا محبوب رہنما تھا۔ اس نے کئی ایک ممالک فتح کیے تھے، جن میں تونس اور یمن بھی شامل تھے۔[۲۰۵] لطفی پاشا بہت بڑا حنفی، فقیہ اور عالم تھا۔ ۹۴۹ھ میں جب وہ حج کے لیے آیا تو مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی اور ترکی زبان میں اپنی کتاب شرح فقہ اکبر انھیں دکھائی اور ساتھ ہی درخواست کی کہ اس شرح کو فارسی اور عربی زبانوں میں ڈھال دیا جائے۔ مفتی صاحب نے یہ کام بطیب خاطر انجام دیا اور انعام سے نوازے گئے۔[۲۰۶] ۹۶۵ھ میں جب مفتی صاحب دوسری مرتبہ استنبول گئے تو اس وقت علی پاشا وزیرِ اعظم تھا۔ ملاقات کے دوران اس نے مفتی صاحب کو اپنی بعض فتوحات کے واقعات سنائے۔ اس پر انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ جس طرح قدیم سے مسلم سلاطین کی فتوحات کو تاریخ میں محفوظ کیا جاتا رہا ہے اسی طرح ان عثمانی فتوحات کو بھی ایک کتاب میں محفوظ کر دینا ضروری ہے کیونکہ گردشِ ایام کے ساتھ یہ واقعات انسانی یادوں سے محو ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ عربی دیوان الانشا کے سربراہ مولانا علی چلپی الحمیدی کو اس کام پر مامور کیا گیا مگر مفتی صاحب کو افسوس ہے کہ یہ کام تکمیل پذیر نہ ہو سکا۔[۲۰۷]

۲۰۳ھ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام۔ ص ۲۱۶

۲۰۴ھ ایضاً۔ ص ۲۹۹

۲۰۵ھ ایضاً۔ ص ۳۶۶

۲۰۶ھ ایضاً۔ ص ۳۰۰

۲۰۷ھ ایضاً۔ ص ۳۰۴

مفتی قطب الدین ایک مدت تک مکّہ میں درس و تدریس اور روایتِ حدیث میں مشغول رہے۔ مکّہ میں احمد شاہ والیٔ گجرات کے قائم کردہ مدرسہ میں انھوں نے پڑھا بھی اور پڑھایا بھی۔ وہ سلیمان اعظم کے مکّہ میں قائم کردہ مدرسہ حنفیہ سلیمانیہ میں بھی تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور جب سلطان مراد خاں کا زمانہ آیا تو اس نے جہاں ان کے مشاہرے میں اضافہ کیا وہاں مکّہ مکرّمہ کا مفتی اعظم بھی مقرر کیا۔ اپنی وفات تک وہی یہ دونوں فریضے انجام دیتے رہے۔ مفتی صاحب کی وفات کے بارے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شوکانی[۲۰۸] نے ان کی تاریخ وفات ۹۹۰ھ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ ان کی تاریخ وفات اس جملے سے نکلتی ہے، "قد مات قطب الدین اجل علماء مکۃ"۔ النور السافر[۲۰۹] کے مصنّف نے بھی تاریخ وفات یہی لکھی ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد[۲۱۰] اور جرجی زیدان[۲۱۱] نے بھی اسی کا تتبع کیا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ۹۹۷ھ میں جب سلطان مراد نے اہلِ مکّہ کے لیے انعامات و عطیات ارسال کیے تو مفتی صاحب کو اپنے ذاتی توشہ خانے میں سے دو شالیں بھی ارسال کی تھیں اور اس کا ذکر کرتے ہوئے مفتی صاحب نے اپنی تاریخ مکّہ (الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ص ۲۱۶) میں اس بات کو مفصل طور پر بیان کیا ہے اور صاحب نزہۃ الخواطر (۴ : ۲۸۹) نے بھی اس بیان پر اعتماد کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مفتی قطب الدین لاہوری کی وفات ۹۹۷ھ / ۱۵۸۹ء میں ہوئی[۲۱۲]۔

مفتی صاحب کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ دسویں صدی ہجری میں جو عظیم محدثین ہوئے ہیں، ان میں مفتی قطب الدین لاہوری ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اس دور میں حدیث کی جو اعلیٰ سند انھیں نصیب تھی، وہ اور کسی عالم کو حاصل نہ تھی۔

---

۲۰۸ البدر الطالع۔ ۲ : ۵۸ ۲۰۹ النور السافر۔ ص ۳۸۳

۲۱۰ Contribution of India to Arabic Literature. p.444.

۲۱۱ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ۔ ۳ : ۳۳۱ — نیز دیکھیے فہرس الفہارس ۲ : ۳۰۲

۲۱۲ دیکھیے الاعلام ۶ : ۲۳۴ از خیر الدین زرکلی

اور جو طریقہ انھوں نے حدیث کی روایت کا اخذ کیا وہ ابن حجر کی نظروں سے بھی اوجھل تھا اور اس پر مفتی قطب الدین کو بجا طور پر فخر تھا۔[۲۱۳] ان سے علما کی جس کثیر تعداد نے حدیث اخذ کی ہے، ان میں مولانا عبد اللہ بن سعد اللہ لاہوری ثم مدنی، احمد الشناوی، محمد ابن العجل اور نور الدین ابن مطیر ایسے جلیل القدر محدثین بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مراکش، تونس الجزائر، مصر، عراق، شام، حجاز، ترکی، یمن اور برصغیر پاک وہند کے ہزاروں علما نے ان سے علم حدیث کی سند حاصل کی۔[۲۱۴]

اس میں شک نہیں کہ مفتی قطب الدین کی اصل شہرت زیادہ تر ایک جلیل القدر محدث اور بلند پایہ فقیہ کی حیثیت سے تھی لیکن بایں ہمہ وہ عربی زبان کے اچھے شاعر بھی تھے۔ اگرچہ ان کی شاعری نعت رسولؐ، ترک سلاطین اور وزرا کی مدح وستائش اور بعض دوستوں کے مرثیوں تک محدود تھی، مگر ان کی شاعری میں فصاحت و بلاغت اور لفظی اسلوب کے محاسن کے ساتھ معانی وافکار کی گہرائی اور ندرت کی چاشنی بھی موجود ہے۔ اس بات کا احساس خود مفتی صاحب کو بھی تھا۔ چنانچہ ترکوں کی فتوحات کے متعلق اپنی تاریخ البرق الیمانی فی فتح العثمانی کا آغاز انھوں نے اپنے ایک قصیدے سے کیا ہے۔ اس قصیدے کا ذکر وہ ایک جگہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:[۲۱۵]

وکنت صدرت ذلك التاريخ بقصيدة طنانة من نظمي الطنان، سادت بها الركبان و تلقتها بالقبول ادباء علماء البلدان اد بيت ابرادها ههنا لبلاغتها عند علماء البيان و فصحاء اللسان، تسابق الفاظها و معانيها الى الاذان والاذهان تسابق افراس الرهان بعد كل بيت

---

[۲۱۳] فہرس الفہارس ۲: ۳۰۱

[۲۱۴] تفصیل کے لیے دیکھیے، الامداد، ص ۵۷ — الامم - ص ۴ - ۵ — قطف الثمر - ص ۱۳ - اتحاف الاکابر - ص ۶۱ — نزہۃ الخواطر - ج ۴، ۳۸۶ بعد — فہرس الفہارس ۲: ۲۹۹ بعد

[۲۱۵] الاعلام باعلام بیت اللہ - ص ۳۶۶

منها بدیوان وتسحب کل کلمة منها اذیال البلاغة علی سحبان۔

میں نے اپنی اس کتاب تاریخ کا آغاز اپنے ایک پُر شکوہ قصیدے سے کیا ہے۔ یہ وہ قصیدہ ہے جسے قافلے لے کر دنیا کے ہر گوشے میں پہنچے اور جسے ہر جگہ کے ادبا و علما نے شرفِ قبولیت بخشا ہے۔ میں نے اس قصیدے کو یہاں نقل کرنا پسند کیا ہے کیونکہ علمائے بیان اور فصحائے لسان کے ہاں یہ بلند درجہ رکھتا ہے اور اس کے الفاظ گوش و ہوش کی طرف یوں سبقت کرتے ہیں جس طرح میدان مقابلہ میں دوڑنے والے گھوڑے۔ اس قصیدے کا ہر شعر دیوان کا درجہ رکھتا ہے اور ہر لفظ سحبان وائل کی بلاغت کو مات کرتا ہے۔

اس قصیدے میں سلطان سلیم خاں کی مدح کے ساتھ سنان پاشا کو یمن کی فتح پر خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ مطلع یہ ہے:

لك الحمد یا مولای فی السر والجهر علی عزة الاسلام والفتح والنصر

اے خدا خفیہ و علانیہ حمد و ستائش تیرے ہی لیے ہے کہ تو نے اسلام کو عزت، فتح اور نصرت عطا کی۔

سلطان سلیم کی مدح میں یہ دو شعر قابلِ ذکر ہیں:

شهنشاه سلطان الملوك جمیعهم "سلیم" کریم اصله اطیب النجر

عماد یلوذ المسلمون بظله وسد منیع للانام من الکفر

شہنشاہ یعنی دنیا کے تمام بادشاہوں کا بادشاہ سلیم جو بڑا کریم النفس ہے اور پاک نہاد ہے وہ ایک ستون ہے جس کے سایہ میں مسلمان پناہ لیتے ہیں اور ایک محفوظ بند ہے جو لوگوں کو کفر سے بچاتا ہے۔

مفتی صاحب کے اشعار منتشر شکل میں موجود ہیں اور زیادہ تر ان کی اپنی تصانیف البرق الیمانی اور الاعلام میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے اشعار کے منتخب نمونے دیے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ عبدالقادر بن عبداللہ عیدروس، صاحبِ النور السافر نے تو ان کے کلام کے بڑے نادر نمونے جمع کر دیے ہیں[۲۱۶]

مفتی قطب الدین لاہوری نے کوئی ایک درجن کے قریب تصانیف یادگار چھوڑی

---

۲۱۶ النور السافر۔ ص ۳۸۳

ہیں۔ ان میں سے ایک، مکہ مکرمہ کی مفصل و مکمل تاریخ ہے۔ اس میں ضمنی طور پر کئی ایک اہم تاریخی حوادث بھی قلم بند کر دیے گئے ہیں جو ایک نہایت ہی قیمتی تاریخی مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کا نام الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ہے اور یہ دو مرتبہ چھپ چکی ہے۔ دوسری اہم کتاب ترکوں کے غزوات و فتوحات کی تاریخ ہے اور اس کا نام ہے 'البرق الیمانی فی الفتح العثمانی' جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی اور اس کا خلاصہ چھپ چکا ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ مفتی صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں اور ابھی تک تحقیق و اشاعت کی منتظر ہیں۔ (۱) منتخب التاریخ فی التراجم (۲) ابتہاج الانسان (۳) التماثل والمحاضرۃ بالابیات المفردۃ النادرۃ (۴) طراز الاسمار (۵) تحفۃ الاصحاب و نزہۃ ذوی الالباب (۶) الهدایۃ الرحمانیۃ الی طریقۃ السادۃ الخرقانیۃ (۷) تاریخ فتح تونس (۸) الفوائد السنیۃ فی الرحلۃ المدینۃ والرومیۃ۔

۳۸۔ شیخ عبداللطیف سندھی

شیخ عبداللطیف بُدینی سندھی، فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے فاضل تھے۔ اچھے شاعر بھی تھے۔ ہر چھ ماہ بعد سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں جاتے اور اس کی خدمت میں ایک خاص قسم کی نرم و نفیس چٹائیوں کا جوڑا بطور تحفہ پیش کرتے تھے۔ اس کے بدلے میں بادشاہ کی طرف سے بڑا اعزاز پاتے، جو اُن کے علمی وقار کے مطابق ہوتا۔ ان کی حیثیت بادشاہ کے قابلِ احترام دوست کی تھی۔ جب بوڑھے ہو گئے تو اورنگ زیب عالم گیر نے اپنے اس دوست کی کبر سنی اور ضعیفی کی بنا پر ان کا معقول وظیفہ مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ اپنے وطن میں سکون کی زندگی بسر کریں اور کسی کی احتیاج باقی نہ رہے۔[۲۱۷]

---

[۲۱۷] تحفۃ الکرام۔ ص ۴۸۳ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۴۸

۳۹۔ شیخ عبداللہ سندیلوی

شیخ عبداللہ سندیلوی، ہندوستان کے صوبہ یو۔پی کے شہر سندیلہ کے باشندے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے، عبداللہ بن بہلول بن چاند بن جنید بن محمد بن برہان الدین بن عزالدین بن محمود بن نجم الدین احمد بن شمس الدین عثمانی ہروی سندیلوی۔ شیخ عبداللہ نمازِ عصر کے وقت دوشنبہ کے روز ۱۲ ربیع الثانی ۹۰۴ھ کو علاقہ اودھ کے شہر سندیلہ میں پیدا ہوئے۔ ابھی نو سال کے بچے تھے کہ مخدوم شیخ صفی ساقی پوری کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے، اور سولہ سال کی عمر کو پہنچے تو حصولِ علم کا شوق دل میں موجزن ہوا، جو انھیں صوبہ یو پی کے ایک علمی مرکز گوپامئو لے گیا۔ وہاں شیخ اللہ داد بن سعد اللہ عثمانی گوپاموی کی مسندِ تدریس آراستہ تھی، ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور ان سے علمِ صرف اور نحو کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ گوپامئو سے بدایوں گئے اور بدایوں سے دہلی کا عزم کیا۔ دہلی میں شیخ معز الدین بخاری کے ہاں سکونت اختیار کی۔ وہاں مدرسۂ دہلی میں لب، الارشاد، اور کافیہ کا درس لیا۔ دہلی سے حصار کا رُخ کیا، وہاں مولانا برہان الدین ملتانی سے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر ان کے ساتھ ہی گجرات روانہ ہو گئے اور اکثر علوم کی کتابیں اور تفسیرِ قرآن ان ہی سے پڑھیں۔ شرح مواقف، شرح مقاصد اور ریاضی کے کچھ رسالوں کی تکمیل کے لیے مولانا وجیہ الدین علوی گجراتی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ہدایۃ الفقہ، اصول بزدوی اور عضدی شیخ مبارک گوالیاری سے پڑھیں۔ حدیث اور اصولِ حدیث کا علم شیخ عبدالاوّل حسینی دولت آبادی سے حاصل کیا۔ فصوص اور اس کی شروح کی سند شیخ مصطفیٰ رومی سے لی۔

شیخ عبداللہ سندیلوی نے چوبیس سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم کی تحصیل سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد اخذِ طریقت کا شوق پیدا ہوا تو شیخ محمد غوث شطاری گوالیاری کی خدمت میں گئے۔ شیخ محمد غوث نے اس کی سندِ اجازت ان کو ذی الحجہ کے مہینے میں ۹۵۰ھ کو گجرات میں مرحمت فرمائی۔ دو سال تک وہ اس مسند پر فائز رہے اور مسترشدین

کو فیض پہنچاتے رہے۔ بعد ازاں حرمین شریفین کا قصد کیا اور پانچ سال مدینہ منورہ میں اقامت گزین رہے۔ ان کی زندگی کے یہ پانچ سال زہد و عبادت اور معاملاتِ دنیا سے علیحدگی و انزوا میں گزرے۔ اس اثنا میں وہ ہر سال سعادتِ حج سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ پانچ سال کے قیامِ حجاز کے بعد مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور احمد آباد میں اقامت اختیار کی۔ وہاں شادی کی اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے شروع کر دیا جو پندرہ سال احمد آباد میں جاری رہا۔ پھر گوالیار چلے گئے اور تمام امور سے منقطع ہو کر قناعت و عفاف اور توکل و استغنا کی زندگی بسر کرنے لگے۔ کبھی امراء اغنیا کے دروازے پر نہیں گئے اور نہ کسی دینوی معاملے میں کسی سے ملنے کی ضرورت محسوس کی۔

شیخ عبداللہ سندیلوی کے بیٹے شیخ عبدالنبی سندیلوی اکبرآبادی تھے، جو عالم و فاضل بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے والدِ گرامی ـــــ شیخ عبداللہ سندیلوی ـــــ کے ملفوظات اپنی کتاب جامع الکلم میں جمع کیے ہیں۔

شیخ عبداللہ سندیلوی کی تصنیفات یہ ہیں: سراج السالکین، کنز الاسرار فی اشغال الشطار، شرح رسالہ غوثیہ، اورادِ صوفیہ، انیس المسافرین، اسرار الدعوۃ، رسالۃ الصوفیہ۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم نے ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۰۱۰ھ کو آگرہ میں وفات پائی[۲۱۵]۔

۴۰۔ سید شیخ عبداللہ حضرمی

سید شیخ عبداللہ کا نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ بن حسین بن محمد بن علی بن احمد بن عبداللہ بن محمد بافقیہ حسینی حضرمی۔ یہ شافعی المسلک فقیہ تھے اور اپنے عصر کے کبار علمائے دین اور مشاہیر فضلائے کرام میں سے تھے۔ تریم میں پیدا ہوئے، عمر کی کچھ

---

۲۱۵ اذکارِ ابرار (ترجمہ گلزارِ ابرار) ص ۵۴۴ تا ۵۴۷ ـــــ نزہۃ الخواطر ـ ج ۵، ص ۲۴۹، ۲۵۰

منزلیں طے کیں تو قرآنِ مجید حفظ کیا اور قرأت کی مشہور کتاب جزری زبانی یاد کی۔ اپنے والد گرامی ـــــ شیخ حسین ـــــ سے فقہ کی مروّجہ کتابیں پڑھیں۔ علم حدیث اور علومِ ادبیہ کی اکثر کتابوں کے لیے شیخ ابو بکر بن عبدالرحمٰن بن شہاب الدین کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کیا۔ فقہ کی بعض کتابوں کی تحصیل شیخ عبدالرحمٰن بن علوی بافقیہ سے کی۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد اساتذہ سے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا۔ متعدد مشائخ سے تصوف کی تعلیم بھی حاصل کی اور اس سلسلے میں بلند مرتبے کو پہنچے۔ بعدازاں علومِ ادبیہ میں بالخصوص مہارت پیدا کی اور اس ضمن میں بڑی شہرت پائی۔ اپنے نواح کے علما و مشائخ سے استفادہ و استفاضہ کے بعد عازمِ ہند ہوئے۔ اس سفر میں بہت سے اربابِ فضل اور اصحابِ کمال ان کے ساتھ تھے۔ پھر "کنور" شہر کا قصد کیا۔ وہاں سیّد کبیر بن محمد بن عمر بافقیہ اور دیگر اصحابِ علم کی مسندِ درس آراستہ تھی، ان سے اخذِ علم کیا۔ اس اثنا میں ان کی علمی قابلیت کے جوہر چمکے اور شہرت کا دائرہ وسیع ہوا۔ وہاں کے وزیر عبدالوہاب کو ان کی وسعتِ علم کا پتا چلا تو اُن سے بھی ملاقات کی۔ یہ شیخ عبداللہ کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ وزیر عبدالوہاب ان کے علم و فراست سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی اور وزارت میں اپنا معاون مقرر کیا۔ شیخ عبداللہ نے مسندِ تدریس بچھائی اور علما و طلبا کی ایک جماعت ان کے گرد جمع ہوگئی۔ اب ان کی شہرت اس نواح کے مشرق و مغرب میں پھیل گئی اور مسلمانوں نے ان کی علمی و تدریسی قابلیت سے بہت استفادہ کیا۔ شیخ بڑے حاضر جواب اور مناظر تھے۔ تحقیقی مباحث میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کر پاتا تھا۔

شیخ عبداللہ کئی کتابوں کے مصنّف اور شارح بھی تھے۔ مثلاً شرح الاجرومیہ، شرح الملحہ، اس کی مختصر اور مختصر شرح ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں نظم و نثر میں کئی عمدہ رسالے تصنیف کیے۔

نہایت نیک، متقی، راسخ العقیدہ، عالی ہمت اور صاحبِ صلاح و تقویٰ بزرگ تھے۔ زبان میں بڑا اثر تھا۔ میٹھے اور پیارے انداز سے بات کرتے، ہر لفظ دل میں اتر جاتا، حسنِ اخلاق کے حامل اور عذوبتِ کلام کے مالک تھے۔ ہمیشہ خوش رہتے اور ہر شخص

پر احسان کرتے، نہایت سخی تھے، کھلے دل سے لوگوں پر خرچ کرتے اور قسم قسم کی استعمال کی چیزیں انھیں عنایت فرماتے، شان دار محل میں رہتے اور عمدہ گھوڑے پر سوار ہوتے تھے، لوگوں کو فائدہ پہنچانے میں مشہور تھے، وقت کا زیادہ حصہ طلبا کو علم سکھانے میں صرف کرتے، رات کو بھی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ غرض یہ شافعی المسلک فقیہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وفات کے وقت منصبِ وزارت پر فائز تھے[۹۱۵]

۱۴۲۔ شیخ عبداللہ حضرمی

سید شیخ عبداللہ حضرمی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبداللہ بن زین بن محمد بن عبدالرحمٰن بن زین ابن محمد مولی عبدید حضرمی۔ یہ مسلکاً شافعی تھے اور اپنے دور کے اجل فقیہ تھے۔

ان کا مولد تریم ہے۔ کچھ بڑے ہوئے تو پہلے قرآنِ مجید حفظ کیا۔ پھر طلبِ علم کی طرف متوجہ ہوئے، اور جزری، عقیدہ غزالیہ، اربعین نبویہ، ملحہ، قطر اور الارشاد حفظ کیں، اور اپنی یہ تمام محفوظات اور حفظ شدہ کتابیں اس زمانے کے اجل علما کو سنائیں۔ قاضی احمد بن حسین سے علمِ فقہ حاصل کیا اور ایک عرصہ تک ان کی خدمت میں حاضر رہے، یہاں تک کہ ان سے تکمیل کی منزلیں طے کیں اور بہت سے علمی فوائد و فیوض حاصل کیے اور متعدد علوم پڑھے، مثلاً تفسیر اور حدیث کی تحصیل انہی سے کی۔ کچھ علوم شیخ ابوبکر عبدالرحمٰن سے پڑھے۔ ان کے بھائی شیخ محمد ہادی سے حدیث اور تصوف کا علم حاصل کیا۔ ان کے مشائخ و اساتذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں شیخ عبدالرحمٰن بن محمد عیدروس اور شیخ عبدالرحمٰن بن علوی بافقیہ وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

شیخ عبداللہ حضرمی نہایت قوی الحافظہ اور ذہین و فطین عالم و فقیہ تھے۔ علومِ مروجہ کا کوئی گوشہ ان کے حافظے کی گرفت سے باہر نہ تھا۔ علمِ فقہ میں ان کے اقران و معاصرین میں سے کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ ان کی علمی جامعیت، دینی حزم و احتیاط اور

---

[۹۱۵] خلاصۃ الاثر۔ ج ۳، ص ۳۹ ـــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۵۰، ۲۵۱

تحقیقی حیثیت کے پیشِ نظر ان کے کئی اساتذہ و مشائخ نے انھیں افتا و تدریس کی اجازت دے دی تھی۔ وہ مسندِ درس پر متمکن ہوئے تو تشنگانِ علوم کی ایک بڑی تعداد نے ان سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ وہ فروع و اصول میں بدرجہ غایت عبور رکھتے تھے، نہایت محقق اور زیرک عالم تھے، لیکن ان کا علم ان کی عقل پر حاوی تھا۔ یعنی وہ کوئی ایسی بات نہ کرتے جو علم و تحقیق کے ترازو پر پوری نہ اُترتی ہو۔ خلافیات کے تمام پہلوؤں پر ان کی نظر تھی اور اپنے دَور کے بہت بڑے مناظر تھے۔ چنانچہ بعض اہم اور پیچیدہ مسائل کی توجیہ و تعبیر میں ان کے اور اس عصر کے ایک اور عالم و شیخ، قاضی عبداللہ بن ابوبکر خطیب کے درمیان کچھ اختلاف پیدا ہوگیا تھا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں کے درمیان مناظرے اور مباحثے کا سلسلہ شروع ہوگیا، جو کافی عرصے تک جاری رہا اور یہ مناظرے اور مباحثے بسا اوقات دن کے علاوہ رات کو بھی منعقد ہوتے۔

شیخ عبداللہ حضرمی، دینی معاملات پر عمل کرنے میں نہایت سخت تھے۔ رشد و ہدایت اور صلاح و تقویٰ میں بہت مشہور تھے۔ مگر اس ضمن میں بدخو یا غلیظ القلب ہرگز نہ تھے۔ ریا اور دکھاوے سے متنفر تھے۔ بصیرتِ قلبی سے بہرہ وَر تھے۔ حلیم الطبع اور نرم طبیعت تھے۔ دنیوی منافع اور اس کے ساز و سامان سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔

یہ جلیل القدر شافعی المسلک فقیہ اپنے وطن تریم سے ہندوستان آئے۔ یہاں کے علما و صوفیا کے فیوض سے بھی اپنا دامن بھرا، اور جو کچھ استفادہ یا استفاضہ کرسکتے تھے، کیا۔ چنانچہ سیّد عمر بن عبداللہ باشیبان کے بابِ عالی پر علومِ تصوف اور ادب کے حصول کے لیے دستک دی اور پھر انھی سیّد عمر بن عبداللہ باشیبان نے ان سے علومِ شرعیہ حاصل کیے۔ بعدازاں سیّد عمر نے ان سے اپنے یہاں قیام کرنے کی درخواست کی، اور وہ عرصہ تک ان کے ہاں مقیم رہے۔ اس اثنا میں بہت سے ہندی اصحابِ تحقیق نے ان سے اخذِ علم کیا۔

وہاں سے بیجاپور کا عزم کیا۔ بیجاپور میں شیخ ابوبکر بن حسین بافقیہ کی مسندِ رشد و صلاح بچھی ہوئی تھی، ان سے علومِ طریقت و حقیقت کی تحصیل فرمائی۔ پھر وہیں درس و

افادہ میں مصروف ہوگئے۔ بیجاپور ہی میں وفات پائی۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس اجلّ شافعی فقیہ کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہوسکا۔[۲۲۰]

۴۳۔ مولانا عبداللہ سیالکوٹی

مولانا عبداللہ بن مولانا عبدالحکیم بن شمس الدین سیالکوٹی، ارضِ ہند کے مشاہیر اور نامور علما میں سے تھے۔ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، گھر میں علم کی نہر جاری تھی، اس سے خوب سیراب ہوئے۔ ان کے والدِ گرامی قدر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ہنگامۂ درس و تدریس زوروں پر تھا اور دُور دراز کے علما و طلبا کی بہت بڑی جماعت ان کے حلقۂ درس میں شامل تھی، مولانا عبداللہ بھی اس میں شریک ہوگئے اور باپ کی فراوانیٔ علم و فضل سے خوب استفادہ کیا۔ مولانا عبدالحکیم نے متعدد درسی کتابوں پر ان ہی کے لیے حواشی تحریر کیے۔ علمِ حدیث شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزندِ ارجمند اور گیارھویں صدی ہجری کے مقتدر عالمِ دین مفتی نورالحق دہلوی سے حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود سلسلۂ درس جاری کیا، جس سے بے شمار طالبانِ علم کے سینے علم کی روشنی سے منور ہوئے، کتابیں تصنیف کیں، کئی درسی کتابوں پر حواشی تحریر کیے اور اس باب میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ ہند اور بیرونِ ہند میں اپنے فضل و کمال میں بڑی شہرت پائی اور خلقِ کثیر کو علومِ مروّجہ کے مختلف گوشوں سے بہرہ مند کیا۔

مولوی رحمان علی ان کے علم وادراک کی وسعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

ملّا عبداللہ سیالکوٹی بن ملّا عبدالحکیم بگرد آوری علوم از پدر فائق برآمدہ[۲۲۱]

مولانا عبداللہ بن مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی وسعتِ علوم میں اپنے باپ سے فوقیت رکھتے تھے۔

۲۲۰۔ خلاصۃ الاثر۔ ج ۳، ص ۴۰ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۵۱ تا ۲۵۳

۲۲۱۔ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۲۶۸

محمد صالح کنبو، جو شاہ جہان کے دور کا مؤرخ ہے، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے تذکرے میں ان کے بیٹے مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا بھی ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے خلف الصدق مولانا عبداللہ سیالکوٹی ہیں، جو تمام علوم کے جامع، مکارمِ اخلاق کے حامل، بہترین اوصاف کے مالک، عمدہ خصائل سے بہرہ ور اور لائقِ ستائش عادات و اطوار سے متصف ہیں۔ الفاظ یہ ہیں:

مولانا عبداللہ خلف الصدق آں حضرت است کہ جامع جمیع علوم است و صاحب مکارمِ اخلاق و کرائم اعراق و محاسن شمائل و محامد خصائل است[۲۲۲]

مغل حکومت کے آخری دور (بارھویں صدی ہجری) کے مصنف محمد اسلم پسروری (جو ۱۱۹۸ھ میں زندہ تھے) اپنی مشہور تصنیف فرحت الناظرین میں شاندار الفاظ میں مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا ذکر کرتے ہیں۔ محمد اسلم پسروری خود بھی عالم تھے اور ان کے پردادا ملا عبدالوہاب پسروری (متوفی ۱۰۵۹ھ) بھی بہت بڑے عالم، پرہیزگار، جامع معقول و منقول اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے شاگرد تھے۔ محمد اسلم پسروری کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

ملا عبداللہ، علمائے عصر کے سردار ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے فرزند تھے۔ علوم کی تحصیل، مشکلات کے حل، دقائق کی تحقیق اور حقائق کی تشخیص جس طرح ہونی چاہیے، اسی طرح وہ اس میں مشغول ہوئے۔ قرآن مجید کے حفظ اور صلاح و تقویٰ نے ان کے فضائل و کمالات میں اضافہ کر دیا تھا۔ ترکِ تعلق، گوشہ نشینی اور اربابِ دول سے کم آمیزی میں وہ اپنے باپ (ملا عبدالحکیم) سے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کی تصانیف میں حاشیہ ہدایہ بہت مشہور ہے۔

جس زمانے میں عالم گیر (بادشاہ) لاہور کے معاملات میں مشغول تھا، اس نے ملّا عبداللہ کو نہایت اعزاز و احترام سے طلب کیا، اور وہ مدد (معاش) جو اُن کے والد (ملّا عبدالحکیم) کے لیے مقرر تھی، اس سے زیادہ سرخیل علما (ملا عبداللہ) کے لیے مقرر فرما دی[۲۲۳]

۲۲۲ھ عمل صالح (شاہ جہان نامہ)۔ ج ۳، ص ۹۵

۲۲۳ھ فرحت الناظرین (شخصیات) اردو ترجمہ۔ ص ۱۰۴، ۱۰۵

سلطان اورنگ زیب عالم گیر، مولانا عبداللہ سیالکوٹی کی انتہائی تکریم کرتا تھا، جس کا اندازہ سلطان کے وقائع نگار محمد ساقی مستعد خاں کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب "مآثر عالم گیری" میں ان کے لیے استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے تین مقامات پر مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا ذکر کیا ہے، اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ایک اورنگ زیب کے انیسویں[19] سال جلوس میں، دوسرے پچیسویں[25] سال جلوس میں اور تیسرے چھبیسویں[26] سال جلوس میں۔!

سلطان اورنگ زیب عالم گیر کا انیسواں سال جلوس ۱۰۸۶ھ میں پڑتا ہے۔ اس سال بادشاہ نے حسن ابدال کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس نے ۱۵ شوال ۱۰۸۶ھ کو حسن ابدال سے کوچ کیا۔ وہاں سے چل کر پہلا قیام کالا باغ میں ہوا۔ کالا باغ سے روانہ ہو کر ۱۵ ذیقعدہ کو لاہور پہنچا اور باغ فیض بخش میں نزول اجلال ہوا۔ اب تک بادشاہ کی مولانا عبداللہ سیالکوٹی سے ملاقات نہ ہوئی تھی، کیوں کہ مولانا موصوف امرا و سلاطین سے ملنے اور ان کے دربار میں جانے کے عادی نہ تھے۔ بادشاہ کو مولانا کے علم و فضل کی وسعت کا علم ہو چکا تھا اور وہ علم و علما کا بے حد قدر دان بھی تھا۔ لہٰذا اس کے دل میں مولانا سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا، اور پیغام بھجوایا کہ وہ لاہور میں اسے ملاقات کا موقع دیں۔ یہ دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ بادشاہ علم پرور کے قیام لاہور کے دنوں میں یہ ملاقات کئی مرتبہ ہوئی اور بادشاہ ان کے علم و فضل اور تقویٰ و تدین سے بہت متاثر ہوا۔ وطن واپس جاتے وقت انھیں انعام و اکرام اور خلعت خاص سے بھی نوازا۔ محمد ساقی مستعد خاں اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

قدوۃ الافاضل مولوی عبداللہ سیالکوٹی پسر ملا عبدالحکیم مرحوم کہ فقر را بہ افضل ہم نشین دارد و مکارم اخلاق را با محامد اداب قرین۔ تا حال بہ ملاقات تمام حسنات خلاصہ مکونات خرسندی نیندوختہ بود۔ از حسن ابدال احکام شوق پیام بنام آں اعز انام رفتہ بود کہ بعد تشریف شریف بہ لاہور از وطن بدانجا بیاید۔ مولوی پیش از ورود لشکر دو سہ روز بہ لاہور رسید و چند مرتبہ بہ ادراک صحبت فیض خاصیت احتیاط اندوز گردید۔ خلعت

در دو صد مہر و مادہ فیل یافتہ، بہ اعزاز واحترام تمام بہ مسکنِ خود مرخص شد[۲۲۴]

ملا عبد الحکیم مرحوم سیالکوٹی کے بیٹے مولوی عبد اللہ سیالکوٹی جو علما و فضلا کے سردار تھے اور فقر و درویشی کی زندگی بسر کرتے تھے، اخلاق و اعمال کے اعتبار سے ان کا اسلوبِ حیات ایک بہترین نمونہ تھا۔ وہ ابھی تک بادشاہِ عالی مقام کی ملاقات کے شرف سے سرفراز نہ ہوئے تھے۔ بادشاہ نے اس معزز و محترم عالم کے نام حسن ابدال سے پیامِ شوقِ ملاقات بھیجا کہ لاہور پہنچنے پر وہ اپنے وطن (سیالکوٹ) سے تشریف لاکر اس سے ملاقات کریں۔ چنانچہ مولوی عبد اللہ لشکرِ شاہی کے ورودِ لاہور سے دو تین روز پہلے ہی یہاں پہنچ گئے اور چند مرتبہ خدمتِ شاہی میں حاضر ہو کر صحبت فیض اثر سے بہرہ اندوز ہوئے۔ بادشاہ نے ان کو خلعتِ خاص، دو سو اشرفیاں اور مادۂ فیل عطا فرما کر وطن جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

دوسری جگہ محمد ساقی مستعد خاں نے مولانا عبد اللہ سیالکوٹی کا ذکر عالم گیر کے پچیسویں[۲۵] سالِ جلوس (۱۰۹۲ھ) کے واقعات بیان کرتے ہوئے بالکل آخر میں کیا ہے۔ آخر شعبان ۱۰۹۲ھ کو مولانا عبد اللہ سیالکوٹی نے اپنے ایک شاگرد کو جو واقعہ نگار تھا، شرفِ اسلام کے لیے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ بادشاہ نے اس کی طرف خصوصیت سے عنانِ توجہ مبذول فرمائی، اور وہ اپنی وفاشعاری و حسنِ کارکردگی کی بنا پر بادشاہ کا منظورِ نظر ہوا۔ یہاں تک کہ امورِ خانہ اس کے سپرد کیے گئے۔ الفاظ یہ ہیں:

واقعہ نگار از شاگردانِ اسوۂ فضلا ملا عبد اللہ سیالکوٹی، روزِ مبارک یک شنبہ کہ بوساطت مومی الیہ بشرف اسلام تحصیل سعادت نمودہ، باین نام خاص اختصاص گرفتہ منظورِ نظر تربیت است، بمشرفی ابتیاع خانہ مقرر شد[۲۲۵]

---

[۲۲۴] مآثر عالم گیری۔ ص ۱۴۸، ۱۴۹

[۲۲۵] مآثر عالم گیری۔ ص ۲۲۰ —— مآثر عالم گیری کے لفظ "بشرف اسلام" سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبد اللہ سیالکوٹی کا یہ واقعہ نگار شاگرد غیر مسلم ہوگا، جس کو شرفِ اسلام کے لیے انھوں نے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا اور پھر وہ اپنے عمل و کردار کی وجہ سے بادشاہ کے نزدیک

اورنگ زیب عالم گیر کے درباری وقائع نگار محمد ساقی مستعد خاں نے مآثر عالم گیری میں تیسرے مقام پر مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا ذکر جلوس عالم گیری کے چھبیسویں[۲۶] سال (۱۰۹۳ھ) کے واقعات بیان کرتے ہوئے کیا ہے۔ یہ ۳۰ر رجب ۱۰۹۳ھ کی تاریخ ہے، جب بادشاہ کو مولانا کی وفات کی اطلاع دی گئی۔ ان کی وفات کی خبر سن کر بادشاہ بڑا مغموم ہوا، اور اس فاضل نواز و معارف پرور شاہِ ہند نے مولانا کے چاروں بیٹوں اور ان کی پاک باز بیوہ کے نام ان کو الگ الگ خلعتِ تعزیت روانہ کیے اور وظائف میں اضافہ فرمایا۔ اس موقع پر محمد ساقی مولانا مرحوم کے علم و فضل کی کھل کر وضاحت کرتا ہے اور یہ واقعہ بھی بیان کرتا ہے کہ بادشاہ نے اپنے مقربِ خاص بختاور خاں کے ذریعے خود اپنے قلم سے اس مضمون کا خط لکھ کر مولانا سے درخواست کی تھی کہ وہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کی صدارت کا عہدہ قبول فرمالیں، مگر انھوں نے کبر سنی کی بنا پر معذرت کر دی —— اس سلسلے کی پوری عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

"جہاں پناہ کے حضور معروضہ پیش ہوا کہ فاضلِ اجل، عارفِ اکمل ملا عبداللہ بن ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے رحلت فرمائی۔ شہریارِ فاضل نواز و بادشاہِ معارف پرور نے ملائے مرحوم کے ہر چہار پسر اور ان کی زوجہ عفیفہ کے لیے خلعتِ تعزیت ارسال فرما کر ان کے وظائف میں بھی اضافہ فرمایا۔ حضرت ملائے مذکور اپنے زمانے کے مشہور فاضل و عارف اور جامع شریعت و طریقت تھے۔ عمر کے آخری دور میں ملا صاحب پر جذبۂ فقر غالب آگیا تھا اور دنیا کے ساتھ آخرت کے بھی سرمایہ دار

انتہائی قابلِ اعتماد قرار پاگیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "بشرفِ اسلام" کتابت کی غلطی ہو، اصل لفظ "بشرف سلام" (بغیر الف) ہو۔ اسے سلام نیاز مندانہ کے لیے مولانا نے بادشاہ کے حضور بھیجا ہو —— اردو ترجمہ دیکھا تو وہاں بھی "شرفِ اسلام" ہی مرقوم ہے۔ اس پوری عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

ایک واقعہ نگار ملا عبداللہ سیالکوٹی کا شاگرد دیک شنبہ کے روز اپنے استادِ گرامی کے واسطے سے شرفِ اسلام کے لیے حاضر ہوا۔ جہاں پناہ نے اس شخص کو اخلاص کیش کا خطاب عطا فرما کر، مشرفِ ابتیاع خانہ مقرر فرمایا۔ قبلۂ عالم اس کے حال پر بے حد توجہ فرماتے ہیں۔ (اردو ترجمہ۔ ص ۲۴۱)

ہو گئے تھے۔ قبلہ عالم (بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر) ایسی پایہ شناسی ہے۔ اس طرح کے جامع فضل و کمال حضرات کی ہمیشہ قدر دانی فرماتے ہیں۔ جہاں پناہ نے اجمیر کے زمانہ قیام میں ارادہ فرمایا کہ حضرت ملا عبد اللہ کو اجمیر کی خدمت صدارت عطا فرمائیں۔ چنانچہ قبلہ عالم نے اپنے قلم خاص سے فرمان تحریر فرما کر بختاور خاں کے حوالے کیا، جو مقرب سلطان ہے اور اپنی فقر دوستی کی وجہ سے ہمیشہ عرفا اور بادشاہ کے درمیان (ملاقات اور خط و کتابت کا) ذریعہ بنتا ہے۔ بادشاہ نے یہ فرمان تحریر کر کے بختاور خاں کو یہ بھی حکم دیا کہ وہ ملا صاحب کو یہ فرمان روانہ کر کے خود ذاتی طور پر بھی خط کے ذریعے اس خدمت کے قبول کرنے کی درخواست کرے۔

"ملا عبد اللہ کو (بادشاہ کا) فرمان اور (بختاور خاں کا) خط وصول ہوئے، اس بے نیاز عارف نے جواب میں بختاور خاں کو لکھا کہ:

زمانِ فراق است۔ نہ اوانِ تحصیلِ شہرہ در آفاق۔ بہ امتثال حکم جہاں مطاع بحضورِ کرامت ظہور می رسد۔

یعنی یہ کوچ کا زمانہ ہے، نہ کہ دنیا میں شہرت و ناموری حاصل کرنے کی خواہش کا وقت۔ تاہم بندہ بادشاہ کے حسب الحکم حاضر ہوتا ہے۔

مولانا مرحوم کا یہ خط بادشاہ کو دکھایا گیا تو

بندگانِ حضرت را ایں حرف از آں ممتازِ دانشوراں پسند افتاد۔

(انہیں اس ممتاز عالم دین کا جواب بہت پسند آیا)۔

فاضل مرحوم اپنی تحریر کے مطابق اجمیر تشریف لے گئے اور اثنائے قیام اجمیر میں کئی مرتبہ بادشاہ سے ملے۔ بعد ازاں بادشاہ سے وطن واپس جانے کی اجازت طلب کی، اور وطن (سیالکوٹ) پہنچنے کے چند ماہ بعد دار آخرت کو روانہ ہو گئے۔ اللھم اغفرہ۔

کوتاہی امل بہ ہمیں عقدہ بند بود — افسانہا بہ بستنِ مژگان تمام شد[226]

مولانا عبد اللہ سیالکوٹی نے کچھ کتابیں تصنیف کیں اور متعدد درسی کتابوں پر حاشی

---

[226] ماثر عالم گیری۔ ص ۲۲۸ تا ۲۳۰

تحریر کیے، مثلاً التصریح علی التلویح، یہ اصولِ فقہ کی کتاب ہے، انھوں نے ابتدائے کتاب سے مقدماتِ اربعہ تک اس پر حواشی لکھے۔ تفسیر سورۂ فاتحہ اور حقائق التوحید کے بارے میں اورنگ زیب عالم گیر کے کہنے سے ایک رسالہ تحریر کیا۔

برصغیر کے اس نامور و ممتاز عالم و فقیہ نے ماہِ رجب ۱۰۹۳ھ میں وفات پائی۔

۴۳- خواجہ عبداللہ دہلوی

خواجہ عبداللہ دہلوی، حضرت مجدد الف ثانی کے مرشدِ شہیر حضرت خواجہ عبدالباقی [باقی باللہ] نقشبندی کابلی دہلوی کے چھوٹے لڑکے تھے۔ یہ اپنے والدِ گرامی کی وفات سے تقریباً دو سال پہلے ۶ رجب ۱۰۱۰ھ کو پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی خواجہ عبیداللہ دہلوی [جو حضرت خواجہ باقی باللہ کی دوسری بیوی سے تھے] چار مہینے کے تھے۔ خواجہ عبداللہ کی ولادت پر عظیم المرتبت باپ نے اظہارِ مسرت میں متعدد اشعار کہے اور بیٹے کی نیکی و تقویٰ کے لیے اللہ سے دعائیں مانگیں۔ خواجہ عبداللہ نے اپنے والد کے مریدِ خاص شیخ حسام الدین دہلوی (متوفی صفر ۱۰۴۳ھ) کی نگرانی میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ابتدائی درسی کتابیں شیخ شاکر محمد اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے پڑھیں۔ پھر عازمِ سرہند ہوئے، وہاں حضرت مجدد الف ثانی کا درس و تدریس اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری تھا، ان سے کچھ کتابیں پڑھیں اور فیضِ طریقت بھی حاصل کیا۔ خاصی مدت ان کی صحبت میں رہے اور بڑا استفادہ کیا۔ پھر دہلی واپس گئے، وہاں شیخ حسام الدین اور شیخ اللہ داد نے شرفِ اجازہ سے نوازا۔ بعد ازاں خواجہ ممدوح نے خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔

خواجہ عبداللہ دہلوی عالمِ کبیر، شیخِ وقت، نامور فاضل اور مشہور صوفی تھے، اور خواجہ خرد کے عرف سے معروف تھے۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی خواجہ عبیداللہ دہلوی (یعنی خواجہ کلاں) کی نسبت حضرت مجدد سے زیادہ استفادہ کیا اور ان سے علمِ کلام کی بعض کتابیں، مثلاً شرح مواقف وغیرہ اور صوفیا کے بعض رسائل پڑھنے کا موقع ملا۔ خود فرماتے ہیں کہ انھیں حضرت مجدد سے "اجازتِ عمل طریقہ و اجازتِ تعلیم ہا" حاصل تھی۔

کئی مرتبہ شیخ مجدد سے ملاقات کے لیے دہلی سے سرہند گئے۔ ایک دفعہ لاہور بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت مجدد ان سے بہت الطاف فرماتے تھے۔ اس ضمن میں ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

این فقیر چند مرتبہ از وطنِ مالوف بخدمتِ ایشاں در سرہند و یک بار در لاہور مشرف شدہ و ہر بار چندگاہ در خدمت بسر بُردہ۔ الطاف بسیار می فرمودند، و امیدوار چنانست کہ آں الطاف سببِ نجاتِ اُخروی گردد۔ اجازت عمل طریقہ و اجازت تعلیم ہا نیز فرمودند، و بشارت ہا می دادند۔

یعنی یہ فقیر کئی مرتبہ اپنے وطن دہلی سے ان کی خدمت میں سرہند گیا اور ایک دفعہ لاہور جاکر شرفِ زیارت سے بہرہ یاب ہوا۔ ہر مرتبہ کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہا۔ وہ مجھ پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ امیدوار ہوں کہ یہی الطاف و مہربانی نجاتِ اُخروی کا باعث ہوگی۔ اجازتِ طریقہ عمل اور کئی قسم کی تعلیمات سے نوازا اور کئی بشارتیں بھی دیتے ہیں۔

خواجہ عبداللہ کے مزاج میں وجد و حال کی کیفیت زیادہ تھی، اس لیے کسی کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرنے سے گریز کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ان کے والد شاہ عبدالرحیم دہلوی، خواجہ عبداللہ کی خدمت میں رہا کرتے تھے اور وہ ان پر مہربانی بھی فرماتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم نے ان سے حاشیہ خیالی کے چند سبق بھی پڑھے تھے۔ لیکن جب انھوں نے خواجہ سے بیعت کے لیے درخواست کی تو ٹال دیے گئے اور فرمایا، مجھ سے بعض بے قاعدگیوں کا صدور ہوا ہے، لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے علاقۂ بیعت کی وجہ سے آپ کو کوئی ضرر پہنچے اور ساتھ ہی مشورہ دیا کہ حضرت آدم بنوری کے کسی خلیفے کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو جائیں۔

خواجہ عبداللہ دہلوی تصنیف و تالیف کے ذوق سے بھی بہرہ اندوز تھے۔ چنانچہ تفسیر بیضاوی اور بعض کتب درسیہ پر تعلیقات و حواشی سپردِ قلم کیے۔ ایک کتاب زادالمعاد لکھی، شیخ حسام الدین کے مناقب میں ایک رسالہ تحریر کیا، میراث کے موضوع سے متعلق بھی ایک رسالہ تصنیف فرمایا۔ محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیہ

پر تعلیقات لکھیں۔ اور بھی کئی رسائل لکھے اور کتابیں تالیف کیں، ان کا یہ تصنیفی کام تقریباً محفوظ ہے۔ بقول شیخ محمد اکرام کے "شاید ان کا مکمل مجموعہ انڈیا آفس لائبریری (ذخیرۂ دہلی) میں موجود ہے۔"

اس صوفی عالم و فقیہ نے بدھ کے روز ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۰۴۷ھ کو وفات پائی۔[۲۲۷]

۴۴۔ مولانا عبداللہ سنبھلی

مولانا عبداللہ سنبھلی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبداللہ بن عبدالعظیم بن منور بن منصور بن شیخ عبداللہ بن عثمان حسینی مودودی امروہی ثم سنبھلی، شیخ صالح اور عالم و فقیہ تھے۔ تصوف اور معرفتِ الٰہیہ میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ شیخ تاج الدین نقشبندی سنبھلی کی اولاد سے تھے۔[۲۲۸]

۴۵۔ مولانا عبداللہ برہان پوری

مولانا عبداللہ برہان پوری کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبداللہ بن عبدالنبی بن نظام الدین بن محمد ماہ بن صفی الدین عمری چشتی گجراتی ثم برہان پوری، گیارھویں صدی ہجری کے متقی اور پرہیزگار ہندی عالم و فقیہ تھے۔ صاحب فضل و کمال اور صاحب دعوت و ارشاد تھے۔ ۲۹ محرم ۱۰۹۸ھ کو برہان پور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔[۲۲۹]

۴۶۔ قاضی عبداللہ بیجاپوری

قاضی عبداللہ گجراتی بیجاپوری، حنفی المسلک تھے اور اپنے دور کے شیخ اور صاحبِ

---

۲۲۷ زبدۃ المقالات، ص ۶۶ تا ۷۰ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۵۵ ــــ رود کوثر ص ۲۱۳ تا ۲۱۵

۲۲۸ نخبۃ التواریخ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۵۴

۲۲۹ تاریخ برہان پور ــــ ایضاً

علم و فضل بزرگ تھے۔ حدیث اور فقہ کے متبحر علما میں سے تھے۔ علامہ وجیہ الدین گجراتی سے اخذِ علم کیا اور عرصہ تک باقاعدہ ان سے فیض یاب ہوتے رہے۔ پھر بیجاپور تشریف لے گئے۔ وہاں کی مسندِ قضا پر متمکن ہوئے اور مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ بیجاپور میں مدفون ہیں۔[۲۳۰]

۴۷۔ علامہ عبداللہ چلپی رومی

علامہ عبداللہ رومی، دیارِ ہند کے مشہور صاحبِ علم تھے اور چلپی کی نسبت سے معروف تھے۔ بہت بڑے عالم اور فاضلِ وقت تھے۔ علومِ ظاہری اور معارفِ باطنی سے بہرہ ور تھے۔ صوفیا کے اونچے طبقے کی اصطلاحات سے پوری طرح باخبر تھے۔ عربی، ترکی اور فارسی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ فقہ اور اصولِ فقہ کے ماہر تھے۔ دراصل روم (ترکستان) کے باشندے تھے۔ شاہ جہان بادشاہ کے زمانے میں واردِ ہند ہوئے اور فقیرانہ ہیئت میں دہلی میں رہنے لگے۔ شاہ جہان کے وزیر علامی سعد اللہ خاں تھے، جو خود بھی صاحب علم و فضل تھے اور اصحابِ علم کے انتہائی قدردان بھی تھے۔ انھیں علامہ عبداللہ چلپی کے بارے میں پتا چلا تو ان سے ملاقات کی اور ان کی ضروریات کے کفیل ہوئے۔ علامی سعد اللہ خاں ان کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ انھوں نے ان کا باقاعدہ وظیفہ بھی مقرر کیا جو اپنی جیبِ خاص سے انھیں دیتے تھے۔ شاہ جہان کو علامہ عبداللہ چلپی کی علمی وسعت کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں تو اس نے ان کا یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ چونکہ علامہ عبداللہ چلپی جلیل القدر عالم تھے، بہت دُور کے ملک روم (ترکی) سے ہندوستان آئے تھے اور فقیروں اور درویشوں کی سی سادہ زندگی بسر کرتے تھے، اس لیے شاہ جہان ان سے بہت متاثر ہوا۔ پھر وہ چونکہ ذاتی طور پر علما و فضلا کا قدردان تھا اور صوفیا کی دل سے تکریم

---

۲۳۰ روضۃ الاولیا۔ —— نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۵۷

کرتا تھا، اس لیے بھی علامہ چلپی کا احترام اس کے دل میں جاگزین ہو گیا تھا۔

شاہ جہان کی جگہ اس کا لائق و عالم بیٹا اورنگ زیب عالم گیر تخت ہند پر بیٹھا تو وہ بھی علما کی قدر و منزلت میں باپ کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔ اس نے علامہ چلپی کو اور بھی اعزاز و قبولیت سے نوازا۔ اس زمانے اورنگ زیب کی کوشش اور حکم سے فتاویٰ ہندیہ جسے فتاویٰ عالم گیری بھی کہا جاتا ہے، عربی زبان میں زیرِ ترتیب تھا، اور علمائے ہند کی ایک بڑی جماعت جو اجلاّ فقہا پر مشتمل تھی، سرکاری طور سے اس اہم خدمت پر متعین تھی۔ نیک اطوار بادشاہ نے علامہ چلپی کو فتاویٰ ہندیہ کے فارسی ترجمے پر مامور کیا۔

بہر حال علامہ عبداللہ چلپی رومی، تمام مروّجہ علوم و فنون پر گہری نظر رکھتے تھے۔ حکمت و تصوف کے موضوع سے متعلق کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے اسلامی ہند کی یہ ایک نادرۂ روزگار شخصیت تھے۔[۲۳۱]

۴۸۔ شیخ عبدالمجید امروہی

شیخ عبدالمجید بن معروف بن خداوند بن گلاب بن یحییٰ علوی امروہی، ۹۰۰ھ کو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ بڑے ہوئے تو حصولِ علم کی غرض سے نارنول کا عزم کیا۔ وہاں شیخ نظام الدین بن اللہ داد بن عبدالکریم نارنولی کے مدرسے میں حاضری دی اور کتبِ درسیہ پڑھیں۔ یہ شیخ نظام الدین نارنولی سے اخذِ طریقت بھی کیا اور کافی مدت ان سے منسلک رہے۔ تحصیلِ علم و طریقت کے بعد اپنے شہر امروہہ تشریف لے گئے اور وہاں کی مسندِ مشیخت پر فائز ہوئے۔

شیخ عبدالمجید امروہی اپنے عصر کے عالم و فقیہ اور زاہد و عابد بزرگ تھے۔ ان سے بہت سے تشنگانِ علم نے استفادہ کیا، جن میں ان کے برادرِ کبیر فیض اللہ بھی شامل ہیں۔ شیخ عبدالمجید نے ”الذکر الاعلیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ“ کے نام سے

---

۲۳۱ انفاس العارفین۔ ص ۵۳ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵۔ ص ۲۵۸، ۲۵۹ ــــ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۲۴ ــــ بزمِ تیموریہ۔ ص ۲۴۳ ــــ ماہنامہ ”معارف“ اعظم گڑھ (جنوری ۱۹۳۰ء)۔ ص ۵۲ تا ۵۴

ایک کتاب بھی تصنیف کی، جس میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی شرح کی گئی ہے۔ اس عالم دین نے ۱۱ ربیع الثانی ۱۰۴۶ھ کو امروہہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے[۲۳۲]

۴۹۔ مولانا عبدالمجید لاہوری

مولانا عبدالمجید بن مفتی محمد لاہوری، عالم و فقیہ، عبادت گزار اور اللہ کے صالح بندے تھے۔ لاہور کے اس جلیل القدر عالم نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو عربی زبان میں ایک خط لکھا تھا، جس میں روح اور نفس کے تعلق کی وجہ، ان کے عروج و نزول کی کیفیت اور روح اور جسدی اعتبار سے فنا اور بقا کے بارے میں سوال کیا تھا، حضرت مجدد نے ان کو اس کا جواب لکھا تھا[۲۳۳]

۵۰۔ خواجہ عبدالمنعم احراری

خواجہ عبدالمنعم دیارِ ہند کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے پوتے تھے، اس لیے عبدالمنعم احراری کی نسبت سے معروف ہوئے۔ والد کا اسم گرامی خواجہ عبداللہ تھا۔ نہایت نیک، شیخ وقت اور فقیہ تھے۔ اُس دَور کے کبار اور مشاہیر ہندی مشائخ میں گردانے جاتے تھے۔ مغل حکمران شاہ جہان ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ سلیم پور کے نواح میں کئی گاؤں اس نے بطور جاگیر ان کو عطا کیے تھے۔ یہ اپنی اسی جاگیر میں رہتے تھے اور وہیں ان کا سلسلۂ فیض جاری تھا۔ ان سے خلقِ کثیر نے استفادہ کیا۔ اندازِ کلام نہایت پیارا اور موثر تھا۔ جس شخص نے اس عالمِ دین کی صحبت اختیار کر لی، وہ کندن بن گیا۔ انھوں نے ۱۰۵۰ھ کے لگ بھگ وفات پائی[۲۳۴]

---

۲۳۲ نخبۃ التواریخ۔ ــــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵۔ ص ۲۵۹

۲۳۳ خزینۃ الاصفیا۔ ــــــ ایضاً

۲۳۴ زبدۃ المقامات۔ ص ۲۷۶ ــــــ ایضاً۔ ص ۲۶۰

۵۱- مولانا عبدالمومن لاہوری

مولانا عبدالمومن لاہوری کی کنیت ابوالمراد تھی۔ والد کا نام محمد اور دادا کا نام طاہر تھا۔ نیک اور پرہیزگار عالم تھے۔ حدیث، فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ ان کا ایک مختصر رسالہ ہے جو اپنے اندر بڑی لطافت لیے ہوئے ہے۔ اس کا نام القصر المنین من الحص والحصین ہے۔ اس کی تصنیف سے وہ جمعہ کی رات ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۰۰۴ھ کو آگرہ میں فارغ ہوئے۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: الحمد للہ احمد اللہ علی ما ھدانا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدٰنا اللہ[۲۳۵]

۵۲- مولانا عبدالنبی اکبرآبادی

مولانا عبدالنبی اکبرآبادی، گیارھویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے نامور شیخ، فاضلِ کبیر اور معارفِ الٰہیہ میں مشہور تھے۔ شیخ عبداللہ شطاری سندیلوی ثم اکبرآبادی کے فرزند تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ مولانا عبدالحی انصاری لکھنوی نے اپنی تصنیف "طرب الاماثل بتراجم الافاضل" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۱۲۸۷ھ میں مجھے مولانا عبدالنبی کی کتاب فواتح الانوار شرح لوائح الاسرار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ کتاب خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔ اس کے آخر میں مولانا ممدوح نے اپنی تصنیفات کی ایک فہرست درج کی ہے، جن کے نام یہ ہیں: ذریعۃ النجاۃ شرح المشکوٰۃ، شرح الفصوص وشرح ترجمہ الفصوص، مختصر الفوائح المسمیٰ بالروائح شرح اللوائح، شوارق اللمعات شرح اللمعات، شرح خلاصۃ العشق، شرح جام جہان نما، شرح الغیبہ، شرح شرح نخبۃ الفکر، شرح معمار المیر حسین، شرح الجواہر الخمسہ، شرح کلید مخازن،

۲۳۵ھ خزینۃ الاصفیا ـــــ نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۶۰

شرح تحفۃ حل الودود، شرح علی حاشیۃ السید علی العضدی المسمیٰ بفیض الخبیر، رسالہ فی تعریف الفقر، رسالہ کشف الجواہر، رسالہ فی اسم الذات، رسالہ لطائف العشر فی حقیقۃ البشر، رسالہ فی المعراج، رسالہ فی شرح خیر الاسماء عبداللہ و عبدالرحمٰن، رسالہ کنوز الاسرار فی اشعار الشطار، جوامع کلم الصوفی، مقامات العارفین، فتوحات المغیبہ، حدائق الانشاء رسالہ فی الناسخ والمنسوخ المسمیٰ دستور المفسرین، بحر الکرم شرح عین العلم، حاشیہ علی شرح الجامی من مبحث الحال الی المجرورات، سواطع الہام شرح تہذیب الکلام، شرح حدیث معراج المومنین، شرح حدیث "کنت کنزا مخفیا" رسالہ دستور السعادہ فی بیان الولایہ، فیض القدوس منتخب نقد النصوص، مطالع الانوار الخفی شرح اجوبۃ الولی، جواہر الاسرار، شرح فصوص الفارابی، فیض الملک المبین شرح حق الیقین، حاشیہ علی نقد النصوص، لوامع الانوار فی مناقب السادۃ الاطہار، رسالہ فی السماع، رسالہ فی جواب اسئلۃ الفاضل النارنولی، شرح جواب ابن سینا، جو کہ ابوالخیر مولانا ابوسعید کے مکتوب کے جواب میں لکھا۔ مواہب الٰہی شرح اصول ابراہیم شاہی، شرح ارشاد النحو للقاضی شہاب الدین دولت آبادی، روح الارواح شرح الحکمۃ الاشراقیہ، رسالہ فی ایمان فرعون، رسالہ فی خلوات الوجود، رسالہ ناسخ التناسخ، شرح حضرات الخمس وغیرہ ــــ ان کی تصنیفات میں سے کشف الانوار شرح جواہر الاسرار فارسی میں ہے، جو علم دعوت سے متعلق ہے، اس میں شیخ محمد غوث گوالیاری کی جواہر خمسہ کے جوہر ثالث کی شرح کی گئی ہے۔ کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: منک العون فی الابتداء والانتہاء یا کریم۔[۲۳۶]

۵۳۔ مفتی عبدالنبی کشمیری

مفتی عبدالنبی کشمیری، مشہور عالم و فقیہ مفتی یوسف کشمیری کے بیٹے تھے۔ شیخ

---

[۲۳۶] طرب الاماثل بتراجم الافاضل۔ ص ۲۲۷ تا ۲۲۹ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ص ۲۶۱، ۲۶۲ ــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۳۴، ۱۳۵

وقت اور اپنے دَور کے نامور عالم تھے۔ ان کا شمار اپنے علاقے اور زمانے کے کبار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ خلافیات میں ماہر کامل اور فقہی مسالک میں اختلافی رجحانات و آرائے ائمہ سے پوری طرح آگاہ تھے۔ علم فقہ اپنے والدِ گرامی مفتی یوسف کشمیری سے حاصل کیا، اس میں خوب مہارت پیدا کی اور اس درجہ کمال کو پہنچے کہ روایاتِ فقہی کی جزئیات و افتا کے استخراج میں یگانۂ روزگار ہوئے۔ ان کی بالغ نظری اور فقہی عظمت کا موافق و مخالف سب نے لوہا مانا ہے[۲۳۷]

۵۴۔ شیخ عبدالواحد مندسوری

شیخ عبدالواحد مندسوری کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبدالواحد بن محمد بن عبدالکریم بن ابراہیم بن نعمت اللہ بن سالار بن وحید الدین یوسف چندیری مندسوری۔ شیخ عبدالواحد مندسوری نے بعض درسی کتابیں سید عبدالاوّل شیرازی کے شاگرد شیخ محمد سے پڑھیں۔ باقی کتبِ درسیہ کی تحصیل مشہور فاضل شیخ مبارک گوالیاری سے کی۔ ذکر و اذکار کے مختلف طریقے بھی ان سے اور شیخ عبداللہ بن بہلول شطاری اکبرآبادی سے سیکھے، یہاں تک کہ ان حضرات کی تعلیم و صحبت سے تمام علومِ مروّجہ بالخصوص دعوت و تبلیغ اور فقہ و تصوف میں درجہ بلند کو پہنچے۔ صاحب وجد و حال بھی تھے۔ دنیا اور اس کے مال و متاع سے بے نیاز رہتے تھے۔ "تارک الماء" مشہور تھے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے ستائیس ۲۷ سال پانی نہیں پیا تھا ــــ ۱۰۱۴ھ کے آخر میں گلزارابرار کے مصنف محمد غوثی شطاری ان سے ملے تھے۔ ایک رات ان کے ہاں رہے اور تصوف و طریقت کے سلسلے میں باتیں ہوئیں۔ ۱۰۱۷ھ کو فوت ہوئے[۲۳۸]

۲۳۷ھ حدائق الحنفیہ۔ ص ۴۲۸ ــــ تاریخ کشمیر اعظمی۔ ص ۱۴۸ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۶۲

۲۳۸ھ اذکارِ ابرار (ترجمہ گلزارِ ابرار)۔ ص ۴۸۷ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ۲۶۴، ۲۶۵۔

برّصغیر پاک و ہند کے بعض بزرگوں کے حالات میں اس قسم کے واقعات بھی بیان کیے جاتے ہیں کہ انھوں نے اتنے سال پانی نہیں پیا تھا، اتنے سال کھانا نہیں کھایا تھا، اتنے سال کنوئیں میں الٹے لٹکے رہے تھے، ان کی آنکھوں میں اس قدر جلال تھا کہ آدمی اس کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہو جاتا یا مر جاتا تھا، وہ کئی کئی مہینے متواتر روزے رکھتے تھے، ایک ایک رات میں ہزار ہزار نفل پڑھ لیتے تھے، ایک دن میں قرآنِ مجید ختم کر لیتے تھے اور ساتھ ہی دیگر عبادات — فرائض و سنن — بھی ادا کرتے تھے، وغیرہ وغیرہ یاد رہے، اس قسم کی مشقتیں اور تکلیفیں اسلام ہرگز کسی کو دینا نہیں چاہتا۔ اسلام دینِ سہل ہے۔ تکلّف اور مشقت کا مذہب نہیں ہے۔ پھر ان میں سے بعض چیزیں خلافِ شرع ہیں اور بعض بالکل ناممکن ہیں۔ وہ پاک باز حضرات اس نوع کی باتیں کس طرح کر سکتے تھے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان ناممکن الوقوع امور کو "کرامات" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ سب سے بڑی اور اصل کرامت خود اسلام اور اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ جو چیزیں شرعاً ناجائز ہیں یا جن کا عمل میں آنا ناممکن ہے، ان کو ان ہستیوں کی طرف منسوب کرنا نہ اسلام کی کوئی خدمت ہے اور نہ اس سے ان بزرگوں کی شان میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ اس سے ان کی ذاتِ گرامی اور خود اسلام پر جو اُن کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا، نقد و تنقید کی راہیں کھلتی ہیں۔ کوئی مان سکتا ہے کہ پورے ستائیس سال تک پانی نہ پیا جائے اور انسان زندہ رہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو پیاس اور بھوک کے وقت ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگ لیتے تھے، یہ حضراتِ علمائے کرام جو آپ کے اطاعت گزار تھے، کیوں کر بھوک پیاس میں رہنے کو دینی حکم تصوّر کر سکتے تھے۔

۵۵۔ شیخ عبدالوہاب مُتقّی مکّی

شیخ عبدالوہاب متّقی مکی، دسویں اور گیارھویں صدی ہجری کے بہت بڑے ہندی عالم و فاضل، محدث و فقیہ اور صاحبِ ورع و تقویٰ بزرگ تھے۔ ۹۰۲ھ کو، ہندوستان

کے علاقہ مالوہ کے قدیم دارالسلطنت مانڈو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ ولی اللہ تھا۔ شیخ ولی اللہ کا شمار مانڈو کے اعیان و اکابر اور رؤسا و امرا کے طبقے میں ہوتا تھا۔ لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا اور انقلاب و تغیر کی ایسی لہریں چلیں کہ انھیں مانڈو کی سکونت ترک کر کے برہان پور جانا پڑا، اور پھر اسی شہر کو اپنا وطن ٹھہرا لیا۔ برہان پور میں اللہ نے انھیں اسی عزت و احترام اور اکرام و شہرت سے نوازا جس سے وہ زمانۂ ماضی میں اپنے قدیم وطن مانڈو میں سرفراز تھے۔ برہان پور جانے کے تھوڑے ہی عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی زمانے میں شیخ ولی اللہ کی اہلیہ محترمہ (شیخ عبدالوہاب کی والدہ ماجدہ) بھی وفات پا گئیں۔ یعنی شیخ عبدالوہاب کم سنی ہی میں والدین کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے اور ایک یتیم بچے کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔

جب ان کے والد [شیخ ولی اللہ] نے مانڈو سے ترکِ وطن پر مجبور ہو کر برہان پور کی راہ لی تو اس سفرِ بے چارگی میں عبدالوہاب ان کے ساتھ تھے۔ اس میں ان کو بہت سی مشکلات سے گزرنا اور اثنائے راہ میں کئی قسم کے مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کا ذکر ان کے شہرۂ آفاق شاگرد و مرید شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے استاد کی زبانی اپنی تصنیف اخبار الاخیار میں کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

یک بارے در صغر سن ہمراہ والدِ خود بتقریب بعضے حوادث کہ در دیارِ مندو حدوث یافتہ بود در بیابانہا افتادہ و راہ گم کردہ بودیم، و ہیچ چیز از جنس طعام و شراب ہمراہ ماند، گرسنگی بر ما غلبہ کردہ۔ چنانچہ عادتِ اطفال باشد کہ در گریہ آمدیم، والد دل داری می داد و می گفت کہ صبر کن طعام در پیش است[۲۳۹]

مانڈو میں کچھ حوادث سے دوچار ہو جانے کی وجہ سے، میں ایک مرتبہ بچپن میں والد کے ساتھ جنگلوں میں تھا کہ ہم راستہ بھول گئے۔ کھانے پینے کی کوئی چیز پاس نہ تھی، بھوک کی شدت بڑھی، بچوں کی عادت کے مطابق، میں نے رونا شروع کر دیا۔ والد نے تسلی دی اور فرمایا صبر کرو

۲۳۹ھ اخبار الاخیار۔ ص

کھانا آگے ہے۔

فقر و تجرید کی راہ پر

والد اور والدہ کی وفات کے بعد اللہ نے شیخ عبدالوہاب کی دست گیری کی اور وہ طلب حق کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ فقر و تجرید کی راہ کو اپنایا اور سفر و سیاحت کی زندگی اختیار کر لی۔ نواحِ گجرات، علاقہ دکن کے اطراف واکناف، سیلون، لنکا اور جزائر سراندیپ میں گھومنے پھرنے لگے۔ اس دوران میں ان کا معمول یہ تھا کہ تین دن سے زیادہ کہیں قیام نہ کرتے، البتہ تحصیلِ علم کی غرض سے یا مشائخ و صلحا سے استفادے کی خاطر بقدرِ ضرورت کہیں اقامت پذیر ہو جاتے —— لیکن اس اثنا میں کس مقام پر کس عالمِ دین سے استفادے کی منزلیں طے کیں، کس شیخ اور صاحبِ طریقت کے بابِ عالی پر استفاضے کے لیے دستک دی، اور کہاں کتنا عرصہ ٹھہرنے کے مواقع میسر آئے، افسوس ہے اس کی تفصیلات ہماری نظر سے نہیں گزریں۔ ہمارا زیادہ تر اعتماد اس سلسلے میں ان کے تلمیذِ رشید شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار پر ہے۔ انھوں نے ان کے ان اسفارِ دشت و صحرا کا صرف ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے، بعض واقعات بھی بیان کیے ہیں، مگر تفصیلات سے تعرض نہیں فرمایا۔ لہٰذا اگر قارئینِ گرامی قدر کو اس ضمن میں تشنگی کا احساس ہو تو ہم ان سے معذرت کرتے ہوئے عرض کریں گے کہ اس کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔ لیکن جیسا کہ واقعات کے تسلسل سے پتا چلتا ہے، بلاشبہ وہ علم و فضل کی اچھی خاصی مقدار سے متمتع تھے اور حسنِ خط کی صفت سے بھی متصف تھے۔ ان کے والد بھی چونکہ عالمِ دین تھے، ان سے بھی انھوں نے آغازِ عمر میں ضرور استفادہ کیا ہوگا۔ وہ انھیں بعض بزرگوں کی صحبت اختیار کرنے اور مواقع میسر آنے کی صورت میں ان سے فیض حاصل کرنے کی بھی تلقین کرتے تھے، مثلاً شیخ علی متقی سے استفادہ و استفاضہ کی تلقین ان ہی نے کی تھی۔

ورودِ مکہ مکرمہ اور شیخ علی متقی سے حصولِ فیض

دیارِ ہند کے مختلف مقامات کی سیاحت اور صحرانوردی کے بعد شیخ عبدالوہاب

نے مکّہ معظمہ کا عزم فرمایا۔ اس وقت شیخ ممدوح کا عنفوانِ شباب تھا، عمر بیس سال سے کم تھی اور چہرہ ابھی موئے لحیہ سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ شیخ محدث کے الفاظ میں:

وہم در عنفوانِ شباب کہ سال عمر بہ بست نہ رسیدہ بود، و ملتحی نہ شدہ بودند کہ بمکّہ معظمہ آمدند[۲۴۰]

یعنی شیخ کی جوانی کا عالم تھا، قافلہ عمر بیس سال کی منزل میں داخل نہ ہوا تھا اور داڑھی کے بال نہ اُگے تھے کہ مکّہ معظمہ تشریف لے گئے۔

مکّہ معظمہ میں اس دَور میں دیارِ ہند کے مشہور عالم و فاضل اور معروف بزرگ شیخ علی متقی کی مسند علم و عرفان آراستہ تھی اور حلقہ اصحابِ نظر و فکر میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ شیخ عبدالوہاب کے والدِ گرامی سے بھی ان کی ملاقات و شناسائی تھی۔ انھیں شیخ عبدالوہاب کی آمد کی اطلاع ملی تو خود ان کی قیام گاہ پر ملاقات کے لیے تشریف لائے اور کمال شفقت سے اپنے ساتھ قیام کرنے کی استدعا کی۔

پیش ایشاں آند و مہربانی ہا نمودند و استدعائے صحبت فرمودند[۲۴۱]

ان کے ہاں آئے، بڑی مہربانیوں سے نوازا اور اپنے ہاں رہنے کی درخواست کی۔

یہ الفاظ واضح کرتے ہیں کہ شیخ علی متقی اپنی بے پناہ مقبولیت اور وسعت علم و معارف کے باوصف جس نوجوان [عبدالوہاب] کے پاس آئے، وہ کوئی معمولی درجے کا نہ تھا، بلکہ کم عمری ہی میں اس نے معرفت و طریقت کے بہت سے اہم مراحل طے کر لیے تھے۔ پھر جب شیخ علی متقی نے شیخ عبدالوہاب کی تحریر دیکھی اور یہ معلوم ہوا کہ وہ انتہائی خوش خط بھی ہیں تو اصرار کیا کہ وہ ضرور ان کے ہاں تشریف لے جائیں، اور ان کی کتابوں کی کتابت و تصحیح کی خدمت انجام دیں، کیوں کہ اس زمانے میں ان کی کئی تصنیفات ایسی تھیں، جن کی وہ کتابت کرانا چاہتے تھے اور بعض مسوّدات کو بہترین خط میں لکھوانے کی فکر میں تھے۔ لیکن اس پہلی مجلس میں تو شیخ عبدالوہاب

۲۴۰ھ اخبار الاخیار۔ ص ۲۶۹ ۲۴۱ھ ایضاً

نے کمال بے نیازی سے ان کی یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا، البتہ بعد کو ان کے ہاں قیام پر رضا مند ہو گئے۔

ایشاں بہ مقتضائے استغنائے ذاتی و بے نیازی کہ مسافرانِ راہِ مجرداں را می باشد، در مجلسِ اوّل اجابتِ دعوتِ شیخ نہ کردند و گفتند کہ ان شاء اللہ تعالیٰ بہ بینیم، تا نصیب چیست۔ در آخر بہ مشاہدۂ فضل و کمال و استقامت احوال حضرت شیخ اختیار صحبت نمودند۔ و سابقاً والدِ بزرگوار ایشاں نیز وصیّت کردہ بود کہ اگر ترا توفیقِ سلوکِ راہِ حق دست دہد، ملازمت شیخ علی متقی و امتثالِ ایشاں اختیار کنی، و از صحبتِ فلاں و امثالِ وی۔ و یکے از شیخانِ زمانہ را نام بردند کہ بہ دعوت اسما و تسخیرِ ملوک مشہور بود، پرہیز نمائی[۲۴۲]

شیخ عبدالوہاب نے اپنے اس ذاتی استغنا اور کمال بے نیازی سے کام لیتے ہوئے، جو مسافروں اور مجردوں کا خاصہ ہے، پہلی مجلس میں شیخ علی متقی کی دعوت قبول نہ کی، اور صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ ان شاء اللہ دیکھتے ہیں، قسمت میں کیا لکھا ہے۔ لیکن بالآخر شیخ کے علم و فضل اور استقامتِ حال کا مشاہدہ کر کے ان کی خدمت میں قیام کی منظوری دے دی۔ علاوہ ازیں انھیں اپنے والد [شیخ ولی اللہ] کی یہ وصیت بھی یاد تھی کہ اگر تمھیں راہِ حق کے سلوک کی توفیق میسر آئے تو شیخ علی متقی اور ان کی طرح کے بزرگوں کی صحبت ضرور اختیار کرنا، اور فلاں فلاں بزرگوں کی معیت و ملازمت سے استفادہ کرنا ـــــ ان بزرگوں کے ساتھ ایک ایسے بزرگ کا نام بھی لیا تھا، جو دعوتِ اسما میں معروف اور تسخیرِ ملوک کے سلسلے میں مشہور تھا، اس کے بارے میں فرمایا تھا کہ اس شخص کی صحبت سے پرہیز رکھنا۔

شیخ عبدالوہاب پیکر زہد و عبادت تھے اور صالحیت، پاک بازی اور تقویٰ میں بہت معروف تھے۔ ان کا خطِ نستعلیق نہایت عمدہ تھا، لیکن شیخ علی متقی نے انھیں خطِ نسخ میں مشق کرنے کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ وہ اس خط میں حسن و زیبائی پیدا

۲۴۲۔ اخبار الاخیار۔ ص ۲۶۹

کریں، کیوں کہ قرآن مجید اسی خط میں ضبط تحریر میں لایا جاتا ہے اور صلحائے امت کی عادت و روش بھی یہی رہی ہے کہ وہ خط نسخ میں لکھتے تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالوہاب نے خطِ نسخ میں بھی بہت جلد مہارت حاصل کرلی، اور پھر اسی خط میں شیخ علی متقی کی تصنیفات و تالیفات کی کتابت اور تصحیح و مقابلے میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے شیخ کی متعدد کتابوں کو زیورِ کتابت سے آراستہ کیا۔ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے۔

برائے شیخ کتابت بسیار کردند بحدے کہ تصورِ آں از حیطۂ حصر خارج بود[۲۴۳]

انھوں نے شیخ علی متقی کی اتنی بہت سی کتابوں کو کتابت کا جامہ پہنایا کہ ان کو حیطۂ شمار میں لانا حدِ امکان سے باہر ہے۔

کتابت کے بارے میں شیخ عبدالوہاب متقی کا کمال یہ تھا کہ وہ نہایت زود نویس بھی تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ شیخ علی متقی نے بارہ ہزار اشعار پر مشتمل اپنی ایک کتاب انھیں دی۔ اس کی کتابت انھوں نے بارہ راتوں میں مکمل کر دی۔ وہ ایک ہزار شعر ایک رات میں لکھ لیتے تھے۔ اس کے علاوہ دن کو شیخ کی دوسری کتابوں کی کتابت کرتے تھے۔ بہر حال شیخ کی زیادہ تر کتابوں کی ترتیب اور اصلاح و تصحیح ان ہی کی سعیِ مسلسل سے تکمیل پذیر ہوئی۔

واکثر ترتیب و اصلاح توالیفِ شیخ بر دستِ ایشاں بود۔

شیخ عبدالوہاب متقی مکہ معظمہ میں دوسرے اصحابِ تصانیف کی کتابوں کی تصحیح و کتابت بھی کرتے تھے اور ان دیارِ پاک میں ان کے اخراجات کا یہی ذریعہ تھا۔ اس زمانے میں ایک مرتبہ مکہ معظمہ میں شدید قحط پڑا، اور لوگ فقیر و فاقہ کی زد میں آ گئے تو ان دونوں استاد اور شاگرد کو بھی اس سے دوچار ہونا پڑا۔ ان دنوں شیخ عبدالوہاب ایک دوسرے صاحب علم کی کتابوں کی کتابت کرتے تھے اور اس سے جو اجرت حاصل ہوتی، اس سے ان دونوں بزرگوں کی گزر بسر کا سلسلہ چلتا تھا۔ قحط سالی کے ان ایام میں

۲۴۳۔ اخبار الاخیار۔ ص ۲۶۹

سب سے ارزاں چیز ایک سبزی تھی جو بڑے بینگن کی قسم کی تھی، یہ اسے سستے داموں خرید لیتے اور اس میں تھوڑا سا نمک ڈال دیتے، جس سے وہ اچار کی شکل میں بدل جاتی۔ پھر تھوڑی تھوڑی مقدار میں یہ بزرگ اُسے روزانہ تناول کرتے۔

شیخ عبدالوہاب متقی، اپنے مرشد شیخ علی متقی کے بہت ہی فرماں بردار تھے، ہر آن اُن کی خدمت میں مصروف رہتے اور دنیا کی کسی بات کو شیخ علی متقی کی بات پر ترجیح نہ دیتے ۔۔۔ شیخ علی متقی بھی ان کا بڑا احترام کرتے اور اپنا بھائی قرار دیتے تھے۔ فرمایا کرتے :

و برادر کہ در راہِ خدا یافتیم عبدالوہاب بود[۲۴۴]

میں نے اللہ کی راہ میں ایک بھائی پایا ہے جو عبدالوہاب ہے۔

یہ دونوں بزرگ اصحابِ ثروت اور مال دار لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے ہاں آمد و رفت سے پرہیز کرتے تھے۔ انھوں نے یہ بات دل میں عقیدے کی طرح بٹھالی تھی کہ مال و دولت پر فقر و درویشی کو بہرحال ترجیح حاصل ہے۔ اللہ اور اس کے رسول سے تعلق رکھنے والوں کو دنیا داروں کی مصاحبت و مجالست سے ہر صورت میں بچنا چاہیے۔ شیخ علی متقی نے شیخ عبدالوہاب کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرتے وقت اس بات کا اقرار لیا تھا اور فرمایا تھا کہ عالمِ فقر کو عالمِ دولت سے مقدم گر دانتا اور یہ بات دل میں ہمیشہ جمائے رکھنا۔ شیخ عبدالوہاب کے الفاظ یہ ہیں :

چوں شیخ مارا مرید می ساختند اول از ما بہ تفضیلِ فقر بر غنا اقرار گرفتند و گفتند بریں اعتقاد باشید و ما نیز ہم بریں عقیدہ ایم۔ بعد ازاں دست بیعت بما دادند[۲۴۵]

جب شیخ مجھے اپنے دائرۂ ارادت میں داخل فرمانے لگے تو پہلے یہ اقرار لیا کہ دولت پر فقر کو فضیلت حاصل ہے، اور فرمایا یہ عقیدہ دل میں ہمیشہ مستحکم رکھنا۔ اس پر اقرار و عدہ کے بعد بیعت کے لیے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ چنانچہ میرا اب تک یہی عقیدہ ہے۔

---

۲۴۴ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۰ ۲۴۵ ایضاً

شیخ عبدالوہاب نے جمادی الاولیٰ ۹۶۳ھ کو شیخ علی متقی کی بیعت کی، اور پھر ان کی وفات، یعنی ۲ جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ تک پورے بارہ سال ان کی خدمت و مصاحبت میں رہے۔ جب وہ شیخ علی متقی کی خدمت میں گئے ہیں، اس وقت شیخ علی کی عمر تقریباً چونسٹھ سال تھی۔

شیخ علی متقی سے ان کی گرویدگی و شیفتگی اس انتہا کو پہنچی اور وہ ان کے زہد و تقویٰ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بالآخر ان ہی کے رنگ میں رنگے گئے، اور استاذ و مرشد کے لقب — "متقی" — سے ملقب ہوئے۔ اور پھر یہی لقب استاذ کی طرح ان کے نام کا بھی مستقل جز بن گیا۔ رحمہما اللہ تعالیٰ۔

قیامِ مکہ مکرمہ کے دوران میں شیخ عبدالوہاب متقی کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی تھی۔ وہ ہمیشہ علم و عمل میں مشغول رہے۔ افادۂ طلبا، غربا و فقرا کی امداد، مخلوقِ خدا کو نصیحت و موعظت اور زہد و عبادت کی تلقین ان کا شب و روز کا معمول تھا۔ مصر، شام اور یمن کے علمائے عظام اور اصحابِ تقویٰ سے ان کے تعلقات اس نوعیت کے تھے کہ یہ سب لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

صوفیا کی تصنیفات کے بارے میں شیخ کا نقطۂ نظر

شیخ عبدالوہاب متقی معتدل مزاج صوفی اور عالم دین تھے — بعض فقہا کی طرح وہ صوفیا پر طعن و تشنیع کرنے کے عادی نہ تھے، نہ ان کی تصنیفات کو ہدف تنقید ٹھہراتے اور نہ ان کے افکار و خیالات کی تردید کرتے — اس ضمن میں وہ خاموشی کو ترجیح دیتے — مثلاً ابن العربی کی فصوص الحکم یا اس قسم کی دیگر کتابوں کے بارے میں وہ کسی کو کوئی رائے نہ دیتے تھے۔ نہ اس نوع کی کتابیں خود پڑھتے، نہ کسی کو پڑھاتے اور نہ ان کے مطالعہ سے کسی کو منع فرماتے۔ البتہ اگر کوئی پوچھتا تو کہتے کہ پہلے اپنا عقیدہ طریق اہل سنت کے مطابق درست اور پختہ کر لو، پھر بے شک ہر قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرو۔ فرمایا کرتے، حقائق و اسرار سے متعلق کتابوں کے ان مشکل مقامات پر جو عقل و فہم کی گرفت میں نہ آسکیں اور ان کی کوئی معقول توجیہ

حیطۂ فہم میں نہ آسکے، پریشان ہونے اور رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ دل میں کوئی وسوسہ ڈالنے اور خلجان پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسے مقامات پر بالکل نہ رکیے اور بلا تکلف آگے نکل جایئے۔ پھر ایک موقع پر شیخ عبدالوہاب نے جو پتے کی بات کہی، وہ یہ ہے جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی درجِ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

نہ آنکہ اعتقاد را ابتدا از ہمیں کتب راست کنند۔ و از ہر کس ہر چہ بشنوند تابع شوند، می فرمودند باید کہ ہر چہ بہ شنوند اگرچہ سخن باطل باشد زود بہ انکار و تعصب پیش نیایند، اوّل خود بہ شنوند کہ چہ می گوید، و بفہم سخن نیک دررو ند کہ قائل آں چہ مقصود دارد۔ بعد ازاں اگر توانند آں را موافق حق سازند، وگرنہ رد کنند۔ و اگر ایں را نہ توانند از سرآں بگزرند، و خلل در عقیدۂ خود نہ بیندازند[۲۴۶ھ]

یعنی اس قسم کی کتابوں کے مندرجات سے اپنے عقیدے کو درست کرنے کا آغاز کرنا یا اصلاحِ عقائد کا ذریعہ ٹھہرانا مناسب نہیں۔ ہر شخص کی بات سُن کر، اس سے تاثر پذیری اچھی چیز نہیں ہے۔ جو شخص جو بات کہتا ہے، اس کو غور سے سنو۔ از راہِ تعصّب، عجلت سے کام لے کر اسے باطل قرار نہ دو۔ پہلے پوری بات سن لو، اس میں سے جو موافقِ حق ہو، اسے قبول کر لو، باقی رد کر دو۔ اور اگر تم اپنے اندر قوتِ برداشت نہیں پاتے تو اس قسم کے لوگوں کی باتیں سننے ہی کی ضرورت نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ اپنے عقیدے میں کسی نوع کا خلل نہ پیدا ہونے دو۔

شیخ عبدالوہاب متقی کے نزدیک راہِ سلوک پر قدم زن ہونے کے لیے ابن العربی کے افکار و خیالات اور فصوص الحکم کے اندراجات سے رہنمائی حاصل کرنا شرطِ اوّل نہیں ہے۔ بلکہ عمل و کردار کو سنوارنا اور عاملینِ سنت کے نقشِ قدم پر چلنا ضروری ہے۔ وہ عقیدے کی اصلاح اور باطن کی پاکیزگی کے لیے بنیادی ذریعہ سنت پر عمل کی دیواریں استوار کرنے کو قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کلمہ طیبہ پڑھتا ہے، اس نے اسلام قبول کر لیا ہے، مسلمان ہونے کا اقرار کرتا ہے،

۲۴۶ھ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۱

باقاعدہ نماز ادا کرتا اور روزے رکھتا ہے، اسلام کے اوامر و نواہی کو مانتا اور ذریعۂ نجات ٹھہراتا ہے، اس کے قول و عمل کا وہی معیار اور پیمانہ ہے جو کتاب و سنت کی رو سے صحیح ہے، تو اس پر اگر ذوق وحال اور جذب و ادراک کی کیفیت طاری ہو جائے اور اس سے ایسی چیزوں کا صدور ہو جائے جو اس کیفیت میں بعض دفعہ صادر ہو جاتی ہیں تو اسے مطعون نہیں ٹھہرانا چاہیے، اس کی تکفیر نہیں کرنا چاہیے۔ اور اسے ملحد نہیں قرار دینا چاہیے ـــــ البتہ اس کے برعکس جو شخص ارکانِ اسلام پر عامل نہیں ہے، وہ اگرچہ کتنا بھی مدعی توحید ہو، اور ادراک و سلوک اور ذوق وحال کے کتنے بھی نکات بیان کرتا ہو اور اس سے دوچار ہونے کا دعوے دار ہو، وہ پکا ملحد اور بے دین ہے۔ اس کی باتوں کا فوراً انکار کر دینا چاہیے۔ وہ یقیناً منکرِ اسلام اور مخالفِ کتاب و سنت ہے[۲۴۷]

سماع اور قوالی کے بارے میں شیخ کا فرمان

شیخ عبدالوہاب متقی رحمۃ اللہ علیہ سماع اور قوالی کو ناجائز قرار دیتے تھے، اپنے کسی مرید کو اس کی اجازت نہ دیتے تھے اور اس باب میں ان مشائخ کی، جو قوالی کے جواز کے قائل ہیں، سختی سے تردید کرتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں ان کے اس نقطۂ نظر کو خصوصیت سے اجاگر کیا ہے۔ چوں کہ ہمارے ہاں مشائخ کرام اور بزرگانِ دین کے بارے میں یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ وہ قوالی کو جائز سمجھتے، بلکہ بعض حالات میں ضروری قرار دیتے ہیں، اس لیے ہم شیخ محدث دہلوی کی پوری فارسی عبارت درج کرنا چاہتے ہیں، تاکہ اس ضمن میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان سے خصوصیت سے سماع کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ یہ عبارت جو شیخ محدث کے استفسار اور شیخ عبدالوہاب متقی کے جواب پر مشتمل ہے، مندرجہ ذیل ہے، اس کے نیچے اس کا اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔

---

۲۴۷ اخبار الاخیار۔ ص ۱۷۱

وطریقۂ ایشاں در سماع نیز نزدیک بہمیں طریق است۔ از مرید بہ تعمل آں راضی نیستند و بر فعل مشائخ منکر اند۔ ایں فقیر عرض کرد کہ در دیارِ ما ایں رسم سماع عجائب متعارف شدہ است، واگر کسے از وے اجتناب کند و براہ انکار رود او را بتمامہ خلق مخالف باید شد، وہمہ مردم بوی از ممر آں بدمے شوند، و بہ مخالف مشائخ او را اتہام کنند، کسے چہ کار کند۔ فرمودند اگر احیاناً با یارانِ موافق و اہل معنی و ہم مسر گاہی غزلے یا جگرے شنیدہ شود باکے نیست۔ عرض کردم کہ آں جا اجتماعہا کنند و اہل و نا اہل و فاسق و صالح واز ہر جنس مردم جمع شوند و چنیں و چناں کنند، براں وجہے کہ در دیارِ ہندوستان مشاہدہ فرمودہ باشند، ایں چہ حکم است۔ فرمودند ایں چنیں خود اصلاً جائز نہ باشد و نباید کرد، واجتناب ازاں از واجبات وقت طالب حق است۔ دریں صورت قطعاً مساہلہ و مسامحہ نہ کردند۔[۲۴۸]

سماع و قوالی کے بارے میں بھی ان کا یہی طریق تھا، (یعنی جس طرح وہ ارکانِ اسلام کی پابندی نہ کرنے والے صاحبِ ذوق و حال کو ملحد و بے دین گردانتے تھے، اسی طرح قوالی کے دلدادہ لوگوں کو بھی غیر دینی راہ پر گام فرسا قرار دیتے تھے) وہ اپنے کسی مرید کو سماع کی اجازت نہ دیتے تھے اور اس ضمن میں مشائخ کے عمل کی نکیر فرماتے تھے۔ (شیخ عبدالحق محدث دہلوی کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے ان سے عرض کیا کہ ہمارے ملک (برصغیر ہندوستان) میں رسمِ قوالی عجیب طریقے سے متعارف اور عام ہو گئی ہے۔ اگر کوئی شخص قوالی سننے سے انکار یا پرہیز کرتا ہے تو سب لوگ اس کی مخالفت پر اُتر آتے ہیں، اُسے بُرا مانتے ہیں اور مشائخ کا حوالہ دے کر اُسے متہم ٹھہراتے ہیں۔ آپ فرمایئے، ایسے موقع پر کوئی کیا کرے۔؟ فرمایا۔ اگر کبھی ہم خیال اصحاب جمع ہوں، یا اصحابِ معنی کا مجمع ہو اور ہم مشرب دوست مل بیٹھے ہوں تو پھر قوالی میں مقررہ شدہ شرائط کے ساتھ کوئی غزل سنی جائے تو مضائقہ نہیں ــــ اس پر میں (عبدالحق دہلوی) نے عرض کیا کہ ہندوستان میں قوالی کے بارے میں یہ قاعدہ رواج پذیر ہے کہ مجلسِ

---

[۲۴۸] اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۱، ۲۷۲

قوالی میں ہر قسم کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں، جن میں اہل و نااہل اور فاسق و صالح افراد موجود ہوتے ہیں، اور جیساکہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا، اِدھر اُدھر کی ہر قسم کی باتیں کرتے ہیں، ایسی مجلسِ قوالی کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ جواب میں فرمایا، ایسی مجلسِ قوالی قطعاً جائز نہیں۔ طالبِ حق کے لیے ضروری ہے کہ اس سے پرہیز کرے۔ جب کبھی ایسی صورتِ حال پیدا ہو تو اس میں ہرگز مسامحت یا چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے۔ (یعنی اس میں خود بھی شامل نہیں ہونا چاہیے اور دوسروں کو بھی شامل ہونے سے روکنا چاہیے)۔

قوالی کے عدمِ جواز کے سلسلے میں شیخ عبدالوہاب متقی کے یہ الفاظ بالکل صاف ہیں، ان میں کسی قسم کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

شادی

اپنے مرشد و استاذ شیخ علی متقی کی زندگی میں شیخ عبدالوہاب ان ہی کی خدمت میں رہے اور ان کی کتابوں کی ترتیب و تصحیح اور نقل و کتابت میں مصروف رہے۔ اس کے علاوہ مطالعۂ کتب، تعلیم و تعلم اور ذکر و شغل کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس اثنا میں انھوں نے شادی نہیں کی۔ شیخ کی وفات کے بعد بھی وہ عرصہ تک مجرد رہے۔ جب عمر چالیس اور پچاس سال کے درمیان پہنچی تو شادی کی۔ شادی سے پہلے کتابت و تصحیح اور نذرانوں وغیرہ کی جو رقم ان کے پاس تھی، وہ سب فقرا و مستحقین میں تقسیم کر دی۔ البتہ اپنے ذاتی استعمال کے کپڑے، کچھ غلّہ اور کتابیں پاس رکھیں۔ شادی کے بعد اہل و عیال کے حقوق کا ہر لمحہ خیال رکھا اور دیگر حقوق پر انھیں ترجیح دی۔ اس کے ساتھ ہی فقرا، غربا اور مستحقین کی مدد میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہندوستان کے جو لوگ ارضِ حجاز میں جاتے ان کی بے حد امداد کرتے، ان کے لیے کھانا، ضروری سامان، لباس اور رقم وغیرہ کا بھی کھلے دل سے انتظام کرتے۔

علم و فضل

شیخ عبدالوہاب متقی گیارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر ہندی عالم تھے۔ حافظے کا یہ عالم تھا کہ لغت کی مشہور کتاب قاموس انھیں زبانی یاد تھی۔ حدیث، فقہ اور علم

فلسفہ کی اکثر کتابیں ازبر تھیں ۔ عربی ادبیات کے ماہر تھے ۔ برسوں حرم شریف میں حدیث، فقہ، عربی ادب اور کتبِ فلسفہ کا درس دیتے رہے ۔ مشکل سے مشکل مسائل کی پیچیدہ گرہیں فوراً کھول دیتے ۔ اللہ نے انھیں بے شمار خوبیاں عطا فرمائی تھیں ۔ بڑھاپے میں ضعفِ بصارت کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، اور خانہ نشین ہو گئے تھے، تاہم کسی نہ کسی صورت میں افادے کا سلسلہ بدستور جاری رکھا ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ان کے علم و فضل کی بے حد تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ ہمہ گیر عالمِ دین تھے اور ہر موضوع کی کتابوں پر کامل عبور رکھتے تھے ۔

ومی تواں گفت کہ دریں زمان بدانش ایشاں در علومِ شرعیہ کم تر کسے خواہد بود[۲۴۹]

یعنی کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ زمانے میں (شیخ عبدالوہاب متقی) جیسا علومِ شرعیہ کا ماہر کوئی کم ہی ہو گا ۔

حصولِ علم ہی درحقیقت ذکرِ الٰہی ہے

شیخ عبدالوہاب متقی فرمایا کرتے تھے کہ علم، غذا کی مانند ہے، جس کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے ۔ اس کا نفع عام ہے ۔ علم کی مثال دوا سے بھی دی جا سکتی ہے، جو ایک ذریعۂ علاج ہے ۔ یعنی جس طرح جسمانی امراض کا علاج دوا کے ذریعے کیا جاتا ہے، اسی طرح روحانی اور قلبی بیماریوں کا علاج علم کے ذریعے سے کیا جاتا ہے ۔ طالب کو چاہیے کہ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر عالمِ خلوت میں فراغتِ قلب اور حضورِ خاطر کرے ۔ بالخصوص رمضان المبارک کے عشرۂ آخر میں اور ذی الحجہ کے عشرۂ اوّل میں خلوت گزیں ہو کر ذکر و شغل اور عبادت میں مصروف رہے ۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ باقی دنوں میں حصولِ علم میں مشغول اور پڑھنے پڑھانے میں منہمک رہے ۔ کچھ لوگوں نے شیخ سے سوال کیا کہ مشائخ جو اس بات کی ترغیب دیتے رہے ہیں کہ ہمیشہ اور ہر آن ذکرِ الٰہی میں مشغول رہنا چاہیے تو اس کا کیا مطلب ہے ؟ اس سوال کا نہایت عمدہ جواب دیا، انھی کے

---

۲۴۹ اخبار الاخیار ۔ ص ۲۷۲

الفاظ میں سنیے - فرمایا :

ہر کہ با عملِ خیر مشغول است ، دائم در ذکر است ، نماز گزاردن ذِکر است ، وتلاوتِ قرآن ذکر است ، درسِ علومِ دینیہ ذِکر است - وہ ہر چہ عمل خیر است ، ذِکر است ، ایں دائم است [۲۵۰]

جو شخص امورِ خیر میں مشغول ہے ، وہ درحقیقت ہمیشہ ذکرِ الٰہی میں رہتا ہے۔ نماز ادا کرنا ذکر ہے ، تلاوتِ قرآن ذِکر ہے ، علومِ دین کا درس و تدریس ذِکر ہے ، اور ہر اچھا کام جس پر دوام کیا جائے ، ذِکر ہے -

آگے چل کر فرمایا :

روش سلف متقدمین ہمیں ست کہ تثبت بہ انواعِ اعمالِ خیر و تہذیب اخلاق و نشر علوم می کردند [۲۵۱]

ہمارے اسلاف کا یہ طریقہ رہا کہ ہمیشہ ہر قسم کے اچھے کاموں مثلاً تہذیبِ اخلاق اور اشاعتِ علوم وغیرہ میں مصروف رہتے -

شیخ عبدالوہاب متقی حصولِ علم کی ہمیشہ ترغیب دیتے رہے ، اور ان کے نزدیک درحقیقت یہی ذکرِ الٰہی ہے ، اس سے رُوگردانی ان کے نقطۂ نظر کے مطابق صحیح نہیں۔ اس ضمن میں ان کے یہ الفاظ یاد رکھنے کے قابل ہیں - فرماتے ہیں :

علم ازاں قبیل نیست کہ ہیچ کس ترک آن فرماید سعی و تصحیح نیت باید کرد [۲۵۲]

یعنی علم وہ شے نہیں ہے ، جسے ترک کر دیا جائے - بلکہ یہ وہ دولتِ بے بہا ہے ، جس کے ذریعے بہتر امور کی انجام دہی کے لیے جدوجہد کی جائے اور قلب و نیت کے زاویوں کو صحیح سمت پر رکھا جائے -

ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ جس انداز سے بعض درویش دعوتِ حق دیتے ہیں ، یہ وصولِ حق کا طریقہ ہے یا نہیں - ؟

---

[۲۵۰] اخبار الاخیار - ص ۲۷۲ [۲۵۱] ایضاً [۲۵۲] ایضاً

فرمایا، ممکن ہے، یہ بھی ایک طریقہ ہو، لیکن اس قسم کے داعیانِ حق بہتر اور عمدہ اخلاق کے حامل نہیں ہوتے۔ ان میں سے اکثر کج خُلق ہوتے ہیں، جو لوگوں کی ایذا رسانی برداشت نہیں کرسکتے۔ حالانکہ غلط آدمی جلد ہی مکافاتِ عمل کی زد میں آجاتا اور بُرے کام کا بدلہ پالیتا ہے۔ داعیانِ حق کو خوش اخلاق اور شائستہ مزاج ہونا چاہیے، اور اس دل گردے کا مالک ہونا چاہیے کہ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والے مصائب و آلام کو برداشت کرسکے[۲۵۳]

مشائخ کے مروجہ اندازِ ذکر کے بارے میں

شیخ عبدالوہاب متقی نے اس ذکرِ الٰہی کے بارے میں بھی اظہارِ رائے کیا ہے، جو مشائخ و صوفیا ایک خاص انداز سے حلقہ باندھ کر کرتے ہیں، اور جو متعدد مقامات میں اب رواج پاگیا ہے۔ اس مروجہ اسلوبِ ذکر کے بارے میں وہ وضاحت سے کہتے ہیں کہ یہ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، تاہم صوفیا کا یہ ایک طریقہ ہے، جو مستحسن ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

ایں کیفیت حلقہ، ذکر و بعضے اوضاع و انواعِ ذکر کہ درویشاں می کنند، اگرچہ آں را سندے صحیح در سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نیست، اما از مستحسناتِ مشائخ است۔[۲۵۴]

یعنی حلقہ باندھ کر ذکرِ الٰہی کی ان کیفیتوں اور اس سلسلے کی بعض ان شکلوں کی جو درویشوں اور صوفیوں میں رواج پذیر ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں تو کوئی صحیح سند موجود نہیں ہے، مگر یہ مشائخ کا ایک اسلوب ہے جو ان کے مستحسنات میں سے ہے۔

ہندو جوگی کا قبولِ اسلام

شیخ ممدوح کا اندازِ تبلیغِ اسلام بڑا حکیمانہ تھا۔ ان کی ہر بات دل میں اُتر تی جاتی تھی۔ ان کی صحبت سے بے شمار مسلمانوں نے اسلام میں رسوخ حاصل کیا اور متعدد غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں ایک ہندو جوگی کا

---

۲۵۳ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۳ ۲۵۴ ایضاً

ذکر بھی اخبار الاخیار میں مرقوم ہے۔ اس کے قبولِ اسلام کا واقعہ جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، ان کا ترجمہ یہ ہے:

ایک دن جنگم جوگی کی ریاضت و تصوّف کا تذکرہ شیخ عبدالوہاب متقی کی مجلس میں ہوا تو فرمایا کہ دورانِ سیاحت میں ہماری بھی ایک جوگی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت ریاضتیں کرتا اور خوارقِ عادات کا اظہار کرتا تھا۔ مجھ سے وہ کہا کرتا تھا کہ میرے پاس سونے کا ایک قلعہ ہے۔ تم (عبدالوہاب) اگر میرے ساتھ ریاضت کرو تو میں تمھیں اس طلائی قلعے کے اندر لے جاؤں گا۔ شہر کے مرد و زن کا ہجوم اس کے پاس رہتا، وہ لوگ ہر قسم کے تحفے تحائف، کھانے پینے کی مختلف چیزیں اور نقدی کی صورت میں مال و دولت اس کو پیش کرتے، لیکن وہ جوگی کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھتا، اسی وقت سب چیزیں لوگوں میں تقسیم کر دیتا۔ میں نے اس کو اسلام کی کچھ باتیں سنائیں تو اس نے بڑے شوق اور توجہ سے سنیں۔ چوں کہ اس نے طلائی قلعہ دکھانے کا کئی بار مجھ سے وعدہ اور تذکرہ کیا تھا، لہٰذا میں نے خاص طور پر اس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ مگر وہ ایفائے عہد نہ کر سکا اور مضمحل و پریشان سا رہنے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میری یہ بات سننے کے بعد اپنے روزمرہ کے جوگی گری کے معمولات میں مشغول ہو جاتا تھا۔ بالآخر اس نے اسلام قبول کر لیا اور میرے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا[۲۵۵]

ریاضت اور ترکِ سوال کا دَور

شیخ عبدالوہاب متقی ابتدائے عمر میں جب کہ وہ بیس سال کی عمر کو بھی نہیں پہنچے تھے، شدید ریاضتوں کے عادی تھے۔ وہ جنگل میں نکل جاتے اور ریاضت میں مشغول ہو جاتے۔ ان کی زندگی کا یہ وہ دَور تھا جب انھوں نے اپنے چند ساتھیوں سمیت سخت سے سخت ضرورت کے موقع پر بھی ترکِ سوال اور کسی سے کوئی چیز نہ مانگنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس ضمن میں اخبار الاخیار کے حوالے سے شیخ ممدوح کے دو واقعے

۲۵۵ھ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۷

ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ درویشوں کی ریاضت، ترک سوال اور غذا و خوراک سے دامن کشاں رہنے کے سلسلے میں شیخ عبدالوہاب متقی نے اپنا ایک واقعہ یوں بیان کیا کہ ایک زمانے میں ہماری غذا کی یہ کیفیت تھی کہ ہم دو آدمی تھے، ہم میں سے کوئی ایک قصائی کی دکان سے وہ ہڈیاں اٹھا لاتا، جنھیں قصائی گوشت اُتار کر پھینک دیتا تھا۔ پھر کھیتوں میں جا کر گیہوں کے تنکے چن کر لاتا۔ ہم ان ہڈیوں اور گیہوں کے تنکوں کو اچھی طرح پانی سے دھو کر اور ان کی مٹی اُتار کر دیگچے میں اُبال لیتے اور پھر اس شوربے کا ایک ایک پیالہ پی لیتے ــ ارد گرد کے لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ ہماری غذا یہ ہے تو وہ ہمارے لیے انواع و اقسام کے کھانے لانے لگے، مگر ہم وہاں سے چلے گئے تاکہ لوگ ہمیں کچھ نہ دے سکیں۔ اس کے بعد ہم نے یہ معمول بنا لیا کہ تین دن سے زیادہ کہیں قیام نہ کرتے تھے[۲۵۶]

ان کا ایک اور واقعہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ان کے ایک دوست کی زبانی مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

فقیر از یکے از یاران ایشاں شنیدہ است کہ می گفت، یک بارے در ایام قحط، در مسجدے با یک یارِ دیگر نشستہ بودند۔ در یک گوشۂ مسجد ایشاں مشغول بودند و در گوشۂ دیگر آں یارِ دیگر۔ و قرار دادہ بودند کہ با یک دیگر سخن نہ کنند و از کسے طعام نہ طلبند۔ بست روز بریں حالت گزشتہ بود کہ ہیچ چیز از طعام نہ خوردہ بودند۔ شخصے حلوا فروش طعام درمیان ایں دو کس می نہاد و می رفت۔ ہیچ کدام از ایشاں آں طعام را نہ خورد۔ چوں مکرر شد دیگر آں مرد حلواتی لقمہ می کرد و در دہانِ ایشاں می نہاد و می خوردند[۲۵۷]

شیخ عبدالوہاب متقی کے ایک دوست نے انھیں (شیخ محدث کو) بتایا کہ ایک مرتبہ زمانہ

---

۲۵۶ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۷ ۲۵۷ ایضاً۔ ص ۲۷۸

قحط میں شیخ عبدالوہاب اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک مسجد میں مقیم تھے۔ مسجد کے ایک گوشے میں یہ (عبدالوہاب) اور دوسرے گوشے میں وہ (ان کا دوست) عبادتِ الٰہی میں مصروف تھے۔ دونوں نے باہم عہد کر رکھا تھا کہ نہ آپس میں ہم کلام ہوں گے اور نہ کسی سے کھانے کو کچھ طلب کریں گے۔ بیس دن اسی طرح گزر گئے، کسی نے کھانا نہ کھایا۔ اکیسویں دن ایک حلوہ فروش نے دونوں کے درمیان کھانا رکھا اور چلا گیا۔ لیکن دونوں نے اس میں سے کچھ نہ کھایا۔ پھر دوسری مرتبہ بھی یہی ہوا۔ یہاں تک کہ تیسری مرتبہ اس حلوائی نے خود اپنے ہاتھ سے لقمے بنا کر دونوں کو کھلائے۔

یہاں قدرتی طور سے یہ سوال سطحِ ذہن پر ابھرتا ہے کہ کیا یہ طریقِ عبادت اور نہجِ ریاضت اسلامی اسلوبِ عبادت سے ہم آہنگ ہے؟ ذکر و سلوک کا یہ مشقّت انگیز انداز قرآن و سنت سے ثابت ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے اس کی تائید ہوتی ہے؟ آثارِ صحابہ یا عملِ صحابہ (رضوان اللہ علیہم) سے یہ منقول ہے؟ تابعین و تبع تابعین کے خیر القرون میں اس کا کہیں سراغ ملتا ہے؟ ائمہ حدیث و فقہ نے اس منہاجِ عبادت کی تصریح کی ہے اور اسے قرینِ صواب اور مطابق قرآن و حدیث قرار دیا ہے؟۔ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہے۔ مگر ہم یہاں اس بحث سے تعرض نہیں کرنا چاہتے۔ صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ طریق عبادت بہت بعد کی ایجاد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تو یہ تھا کہ آپ بھوک پیاس کے وقت کھانے پینے کی چیزیں کسی دوسرے شخص سے مانگ لیتے تھے۔ صحابۂ کرام بھی اپنی ضروریات کا اظہار بے تکلفی سے ایک دوسرے سے کرتے تھے، ان کے بعد وہ بزرگانِ دین بھی جنھیں سلف صالحین کے مقدس لقب سے ملقب کیا جاتا ہے، اشیائے ضروریہ کے آپس میں لین دین میں نہ صرف کوئی قباحت محسوس نہ کرتے تھے، بلکہ اس کو نیکی سمجھ کر ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ مقصد یہ ہے کہ حدیث و فقہ کے اس پورے ذخیرے میں جو آج باقاعدہ مرتب و مدوّن شکل میں ہمارے سامنے ہے، کہیں اس قسم کی عبادت کا پتا نہیں چلتا، جو بعض مشائخ و صوفیا سے منقول ہے۔

لیکن ان صوفیائے کرام اور مشائخ عظام کے اس طرزِ عبادت میں علیحدگی وانزوا، امورِ دنیا سے بے تعلقی اور اصحابِ دولت سے انقطاع کا جو پہلو موجود ہے، وہ بہر حال فائدے سے خالی نہیں۔ اس میں ان کی خود اپنی ذاتی ضروریات سے بے نیازی اونچاپن، بے پناہ قوتِ برداشت، حرص و آزِ دنیوی سے کنارہ کشی اور اربابِ سلطنت سے بے اعتنائی کا بہت ہی بلند تصور پایا جاتا ہے۔ پھر اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس عالمِ رنگ و بو میں جہاں جاذبِ نظر اور اپنی طرف کھینچنے والی بے شمار بوقلموں چیزیں ہر سو پھیلی ہوئی ہیں، اللہ کے نیک بندوں کا ایک ایسا گروہ موجود ہے، جس نے مفاداتِ عاجلہ کو ترک کر کے اپنے آپ کو صرف اللہ کے حوالے کر رکھا ہے، ان کا تمام وقت ذکرِ الٰہی میں گزرتا ہے اور وہ ہر طرف سے منقطع ہو کر عبادتِ الٰہی کے لیے وقف ہو گئے ہیں۔

شیخ کا موقف

یہ بحث اس وقت ہمارے دائرۂ موضوع سے خارج ہے۔ ضمناً چند باتیں نوکِ قلم پر آگئی ہیں۔ اس موقع پر ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اکثر مروّجہ معمولات میں شیخ عبدالوہاب متقی کا موقف اپنے اندر اعتدال و توازن لیے ہوئے تھا۔ وہ محض اختلافِ عمل کی بنا پر کسی پر فتویٰ لگانے کے عادی نہ تھے۔ بلاشبہ وہ خود وجد و حال اور جذب و سلوک کی بعض ان کیفیات کے مخالف تھے، جو صوفیا کے ایک طبقے میں پائی جاتی ہیں، لیکن ان کے صدور کو وہ الحاد و زندیقیت کی حد تک نہیں لے جاتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان صوفیا کو ملحد قرار دیتے تھے جو عمل کے اعتبار سے طریقِ اہلِ سنّت سے ہٹے ہوئے ہوں اور خلافِ اسلام امور کے مرتکب ہوتے ہوں۔ پھر وحدت الوجود کے وہ شدید مخالف تھے، جبکہ اس دور کے اکثر صوفیا و مشائخ اس کے حامی تھے۔ وہ شیخ محمد غوث گوالیاری کے بھی مخالف تھے، کیوں کہ وہ وحدت الوجود کے حامی تھے اور اسی بنا پر شیخ عبدالوہاب کے والد شیخ ولی اللہ مانڈوی نے ان کی صحبت سے ان کو گریزاں رہنے کی وصیّت کی تھی۔ شیخ عبدالوہاب نے ابن العربی کی کتابوں کے بارے میں بعض مواقع پر سکوت اختیار کیا ہے اور بعض مواقع پر لوگوں کو ان کے مطالعہ سے منع بھی کیا ہے۔

سکوت ان اہلِ علم کے لیے اختیار فرمایا ہے، جن کا مطالعہ وسیع ہو، اور وہ عقائد اہلِ سنت میں راسخ ہوں، خلافِ شرع امور سے ان کے متاثر ہونے کا کوئی اندیشہ نہ ہو— اور منع ان لوگوں کو کیا ہے جو ابھی تصوف و سلوک کی ابتدائی منزل میں ہوں، عقیدہ و فکر کے اعتبار سے زیادہ پختگی اور رسوخ کے حامل نہ ہوں، اور ان کے حدودِ مطالعہ بھی وسعت پذیر نہ ہوں۔

حلقۂ تلامذہ

جیساکہ گزشتہ صفحات میں بتایا جاچکا، شیخ عبدالوہاب بیس سال سے بھی کم عمر میں مکہ مکرمہ پہنچ گئے تھے۔ یہ ماہِ جمادی الأولیٰ ۹۶۳ھ کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں وہاں ایک بہت بڑے ہندوستانی عالم شیخ علی بن حسام الدین متقی گجراتی قیام فرما تھے۔ ان سے سلسلۂ ارادت استوار کیا، علم و معرفت سے بہرہ ور ہوئے اور ان سے اور وہاں کے دیگر علما و مشائخ سے سندِ حدیث حاصل کی۔ بارہ سال یعنی شیخ علی متقی کی وفات (۲ر جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ) تک ان کی خدمت میں رہے۔

مکہ مکرمہ میں شیخ عبدالوہاب متقی نے خود بھی درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا، جس سے علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے استفادہ کیا۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے اصحابِ علم اور اربابِ ورع و تقویٰ ان سے بہت متاثر تھے، وہ ان کی اصلاحی اور تبلیغی سرگرمیوں سے بھی اثر پذیر تھے، زہد و اتقا کی وجہ سے بھی ان کی قدر کرتے تھے اور علوم و معارف میں مہارت کی بنا پر بھی وہ ان کے مداح تھے۔

شیخ عبدالوہاب متقی کے ارشد اور مشہور تلامذہ و معتقدین میں سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا اسمِ گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے۔ وہ ۹۹۶ھ کو حجاز پہنچے اور ۹۹۹ھ تک وہاں مقیم رہے۔ تقریباً یہ تمام عرصہ شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں گزرا۔ علم کی تکمیل کی اور احسان و سلوک کی راہوں سے آشنا ہوئے۔ شیخ متقی سے مشکوٰۃ کا درس لیا، کچھ اور کتابیں بھی پڑھیں۔ صحیح مسلم کی قرأت کی اجازت بھی لی۔ پھر فرمایا۔

اکنوں عزیمتِ ہندوستان بکنید۔

اب ہندوستان جانے کا عزم کرو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے قیام مکہ مکرمہ کے دوران شیخ عبدالوہاب متقی سے بڑا استفادہ کیا اور علم حدیث کا زیادہ تر درس ان ہی سے لیا۔ اس کا تذکرہ خود شیخ عبدالحق اپنی کتاب تالیف قلب الالیف میں ان الفاظ میں کرتے ہیں اور اپنے عظیم القدر استاذ کی بے حد تعریف فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

تمامہ کتب احادیث و سائر علوم دینیہ از علمائے آں عالی مقام علیہم رحمۃ اللہ الملک العلام، خصوصاً از حضرت شیخ اجل و اکرم، اوحد و اعدل عبدالوہاب متقی قادری شاذلی قدس اللہ روحہ و اوصل الینا فیوضہ و فتوحہ بہ تلقین ذکر و ایثار خلوت و برکت مشرف و فائز شد، و نعمتہا و بشارتہا از خدمت وے در حصول انوار و آثار نتائج و ثمرات برکت و التزام مقام صدق و استقامت در نشر علوم دینی و حصول مواہب یقینی مشرف و مبشر گشتہ، برجوع و عود بوطن مالوف مامور و مکلف شد۔

تمام کتب احادیث اور علوم دینیہ حجاز کی مقدس سرزمین کے علمائے کرام سے حاصل کیے۔ بالخصوص حضرت شیخ عبدالوہاب متقی قادری شاذلی قدس اللہ روحہ سے ذکر الٰہی وغیرہ کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہوا۔ ان کی صحبت بابرکت سے بہت سی نعمتیں حاصل کیں، اور حصول انوار و برکات اور علوم دینی کی نشر و اشاعت میں استقامت کے بارے میں کئی قسم کی بشارتیں سننے کے بعد وطن مالوف (ہندوستان) کو واپس لوٹا۔

وفات

بہرحال شیخ عبدالوہاب متقی اس برصغیر کے جلیل القدر عالم دین، عظیم المرتبت محدث و فقیہ اور نامور سالک و صوفی تھے۔ وہ چھتیس [۳۶] سال مکہ مکرمہ میں اقامت گزیں رہے اور اتنے ہی مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ ۱۰۰۱ھ کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ [۲۵۸]

---

۲۵۸ شیخ عبدالوہاب متقی کے حالات کے لیے دیکھیے: اخبار الاخیار۔ ص ۲۶۹ تا ۲۷۰۔

۵۶ - قاضی عبدالوہاب گجراتی

قاضی عبدالوہاب احمد آبادی گجراتی، "مجمع البحار" کے مصنّف شیخ محمد بن طاہر بن علی پٹنی کی اولاد سے تھے، اور اپنے زمانے کے شیخ اور عالم وفقیہ تھے۔ شاہ جہان کے عہد میں اپنے مولد "مونگی پٹن" کے جو احمد نگر کے نواح میں واقع تھا، قاضی مقرر ہوئے اور مدت تک اس منصب پر فائز رہے۔ جب عالم گیر بلادِ دکن کا والی مقرر ہو کر آیا تو اس سے قرب و تعلق پیدا ہو گیا۔ پھر ملک کی زمامِ حکومت اس کے ہاتھ میں آئی تو اس نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں ہندوستان کی مسند قاضی القضاۃ پر مامور کیا۔ اورنگ زیب عالم گیر ان کی بہت توقیر کرتا اور ان پر اعتماد کرتا تھا۔ وہ ملک کے اس درجہ عظیم المرتبت قاضی القضاۃ تھے کہ ان سے پہلے کوئی قاضی ان کے درجے کو نہیں پہنچا ــــ ان کی ہیبت و شخصیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تمام امرائے مملکت ان سے لرزتے تھے۔ شرعی احکام کے اجرا اور فیصلوں کے نفاذ میں نہایت سخت تھے۔ ان سے قبل اس حکومت میں کوئی قاضی ان کا مثل و ہمسر نہ گزرا تھا۔ صدق و دیانت اور نیکی میں منفرد حیثیت کے مالک تھے، مگر اس کے باوجود لوگ ان پر رشوت ستانی کا الزام بھی لگاتے تھے ــــ ان کی وفات ۱۸ رمضان ۱۰۸۶ھ کو دہلی میں ہوئی [۲۵۹]

خزینۃ الاصفیا - ج ۱، ص ۱۳۸ تا ۱۴۰ ــــ تاریخ برہان پور - ص ۱۲۰ ــــ حدائق الحنفیہ - ص ۳۹۲ تا ۳۹۴ ــــ تذکرہ علمائے ہند - ص ۱۳۹ ــــ تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان - ص ۳۶۸ تا ۳۷۰ ــــ رودِ کوثر ۳۵۲، ۳۵۳ ــــ نزہۃ الخواطر - ج ۵، ص ۲۶۶، ۲۶۷ ــــ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی - ص ۱۰۲ تا ۱۱۱

[۲۵۹] مآثر الامرا - ج ۱، ص ۲۳۲ تا ۲۳۸ ــــ ج ۳، ص ۹۳ ــــ منتخب اللباب ص ۲۱۶ ــــ مآثر عالمگیری - ص ۱۳۴ ــــ یاد ایام - ص ۷۷، ۷۸ ــــ بزم تیموریہ - ص ۲۴۷ تا ۲۴۹ ــــ فرحت الناظرین (شخصیات) - ص ۱۱۱، ۱۱۲ ــــ نزہۃ الخواطر - ج ۵، ص ۲۶۷، ۲۶۸

۵۷ - ملا عبدالوہاب پسروری

ملا عبدالوہاب پسروری، فرحت الناظرین کے مصنف محمد اسلم انصاری پسروری کے جدِ امجد تھے - اپنے عہد کے مشہور فاضل اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ عقل و دانش، تبحر علمی اور کثرتِ معلومات میں مشہور تھے - ضرورت مندوں کے کام آتے اور لوگوں کے کام کاج کے لیے بہت دوڑ دھوپ کرتے تھے - چھوٹے بڑے کے سامنے کسر نفسی اور تواضع ان کی پسندیدہ عادت تھی - اکثر متداول کتابیں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے پڑھیں، جن کا سلسلہ درس ان کے زمانے میں زوروں پر تھا، علم فقہ، اصول اور معانی میں دست گاہ رکھتے تھے متوکل علی اللہ اور فقیر منش تھے - علوم دینی کی نشر و اشاعت ان کا محبوب مشغلہ تھا - مغل حکمران شاہ جہان کئی مرتبہ ان کی خدمت میں گیا اور انھیں مناصب و وظائف سے نوازنا چاہا - بالآخر شاہ جہان کے وزیر علامی سعداللہ خاں کی کوشش سے جو خود بہت بڑے عالم، ذہین اور علم پرور تھے، ملا عبدالوہاب نے اپنے بیٹوں کے لیے دو گاؤں بطور جاگیر قبول کیے - بعد ازاں بادشاہ نے ان کے بیٹوں کو چار گاؤں عطا کیے، جو سکھوں کے ہنگامے تک ان کے قبضے میں رہے - ملا عبدالوہاب پسروری نے ۱۰۵۹ھ کو انتقال کیا۔[۲۶۰]

صاحبِ "فرحت الناظرین" محمد اسلم پسروری نے اپنی اس کتاب کے ایک اور مقام پر ان کا ذکر "قاضی عبدالوہاب پرسروری" کے عنوان سے کیا ہے، اور سالِ وفات ۱۰۸۶ھ لکھا ہے - مصنف کے فارسی الفاظ یہ ہیں:

قاضی عبدالوہاب پرسروری[۲۶۱] جدِ ماجد راقم، عالم متبحر، جامع معقول و منقول چندے بقضائے لشکر عالمگیر قیام داشت، و پیوستہ باستفادہ و افادہ طلبہ علوم اشتغال

۲۶۰ھ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۱۰، ۱۱۱

۲۶۱ھ اس زمانے میں "پسرور" کو "پرسرور" لکھتے تھے۔

می ورزد، وسلسلۂ ارادت خود در قادریہ داشت۔ ۱۰۸۶ھ در ماہ رمضان فوت شد[۲۶۲]

یعنی قاضی عبدالوہاب پسروری راقم [مصنف فرحت الناظرین] کے جد بزرگوار، متبحر عالم اور علوم معقول و منقول کے جامع تھے۔ کچھ عرصہ اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے لشکر میں منصب قضا پر مامور رہے۔ طلبائے علوم کو تدریس و افادہ ان کا مشغلہ تھا۔ تعلق ارادت سلسلہ قادریہ سے تھا۔ ماہ رمضان المبارک ۱۰۸۶ھ میں فوت ہوئے۔

۵۸۔ شیخ عبدالوہاب قدوائی راجگیری

شیخ عبدالوہاب قدوائی راجگیری نواب منعم خاں، فاضل کبیر اور شیخ وقت تھے۔ علوم نحو، لغت، اصول اور کلام میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان مضامین سے متعلق بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں علم صرف کی مفتاح الصرف، علم کلام کی بحر المذاہب اور عقائد کی کتاب الصدرہ شامل ہیں۔ ان کی کتاب بحر المذاہب کا ایک قلمی نسخہ رام پور (ہندوستان) کے کتب خانہ حامدیہ میں موجود ہے، جو ۱۰۲۹ھ کا مکتوبہ ہے[۲۶۳]

۵۹۔ خواجہ عبیداللہ دہلوی

خواجہ عبیداللہ دہلوی، حضرت خواجہ عبدالباقی نقشبندی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے لڑکے تھے۔ یہ وہی خواجہ عبدالباقی ہیں جو خواجہ باقی باللہ کے لقب سے معروف ہیں، اور گیارھویں صدی ہجری کے دیار ہند کے مشہور بزرگ اور حضرت مجدد الف ثانی کے مرشد ہیں۔

۲۶۲ھ فرحت الناظرین۔ ورق ۷۷ لباب، نسخہ بوڈلین لائبریری

۲۶۳ھ ابجد العلوم۔ ص ۹۳۴ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۶۸

حضرت خواجہ باقی باللہ ۵ ذی الحجہ ۹۷۱ھ کو کابل میں پیدا ہوئے۔ والدین نے محمد رضی الدین نام رکھا۔ لیکن بڑے ہو کر باقی باللہ، یا محمد باقی باللہ یا عبدالباقی کے اسمائے گرامی سے شہرت پائی۔ والد کا نام قاضی عبدالسلام تھا، جو اپنے علاقے کے اہلِ علم میں سے تھے۔ انھوں نے لائق بیٹے کی تعلیم و تدریس کی طرف توجہ مبذول کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھیں ملا صادق حلوائی کی خدمت میں بھیجا گیا۔ ملّا حلوائی اس عہد اور علاقے کے نامور فاضل اور بہترین شاعر تھے۔ وہ درحقیقت سمرقند کے باشندے تھے۔ حج بیت اللہ کو گئے اور واپس آئے تو اکبر کا چھوٹا بھائی مرزا حکیم جو اس وقت کابل کا حکمران تھا، انھیں کابل لے آیا اور وہاں انھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ خواجہ باقی باللہ بھی کابل آگئے اور ملا حلوائی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد جب وہ کابل کی سکونت ترک کر کے ماوراءالنہر تشریف لے گئے تو خواجہ باقی باللہ بھی ان کے ساتھ تھے۔

خواجہ باقی باللہ نے علوم مروجہ بڑی تیزی سے حاصل کرنا شروع کیے۔ ان کے اعزہ و اقارب حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر متعین تھے، اور چاہتے تھے کہ خواجہ بھی تکمیلِ علم کے بعد کسی اچھے عہدے پر فائز ہو جائیں، لیکن تعلیم ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ان کی طبیعت زہد و عبادت اور طریقت و تصوف کی طرف منعطف ہو گئی۔ چنانچہ افغانستان اور ماوراءالنہر کے بعض صوفیا و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہو کر تزکیۂ نفس میں مشغول ہو گئے۔ بعد ازاں عالمِ جوانی ہی میں برصغیر پاک و ہند کا رخ کیا اور دہلی میں اقامت اختیار کی۔ جلد ہی ان کے تقویٰ و تصوف کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس زمانے میں اس ملک پر جلال الدین اکبر داد حکمرانی دیتا تھا۔ برصغیر کے بہت سے علما و فضلا، متعدد مشائخ و صوفیا اور کچھ امرا و وزرا ان کے حلقہ بیعت و ارشاد میں داخل ہوئے۔ دیارِ ہند کے اس عظیم صوفی اور صاحبِ طریقت بزرگ نے صرف چالیس سال عمر پائی اور ۲۵ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۲ھ کو دہلی میں انتقال کیا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کی دو بیویوں سے دو بیٹے تھے، جو ان کی وفات سے دو

سال پیشتر تقریباً چار مہینوں کے فرق سے پیدا ہوئے۔ بچوں کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد حضرت خواجہ نے اپنے جلیل القدر مرید حضرت مجدّد الف ثانی کی عنان توجہ اس طرف مرتکز کرائی کہ مجھ پر ضعفِ بدن غالب آگیا ہے اور امیدِ حیات کم رہ گئی ہے، آپ ان خرد سال بچوں کا خیال رکھیں۔ ان لڑکوں میں سے ایک کا نام جو بڑے تھے، عبید اللہ تھا، اور دوسرے کا نام عبداللہ!

عبید اللہ، یکم ربیع الاوّل ۱۰۱۰ھ کو پیدا ہوئے، اور ان کا نام سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ خواجہ عبید اللہ احرار کے نام پر رکھا گیا۔ یہ اپنے دوسرے بھائی خواجہ عبداللہ سے کچھ دن عمر میں بڑے تھے اس لیے خواجہ کلاں کے عرف سے معروف ہوئے ان کی ولادت پر خواجہ باقی باللہ نے بے حد خوشی کا اظہار کیا، ان کی ولادت، اذان اور نام کے بارے میں کئی اشعار لکھے، شیخ حسام الدین کی نگرانی میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ان سے اور شیخ اللہ داد دہلوی سے اخذِ علم اور کسب طریقت کیا۔ تکمیلِ علم کے بعد اپنے دَور کے علما و فقہا اور مشائخ میں شمار ہوئے۔ علم تاریخ اور علم انساب میں بھی بہرۂ کامل رکھتے تھے، تصوف و طریقت سے بھی بہت شغف تھا اور علمِ انشا میں بھی قدرت حاصل تھی۔ مطالعۂ کتب اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ ایک کتاب احوال صحابہ و تابعین سے لے کر اپنے دَور کے مشائخ تک کے حالات میں لکھی یہ احوالِ صحابہ و تابعین و تبع تابعین و مشائخ دین تا وقت خود نوشتہ مجدد الف ثانی کے لڑکے شیخ محمد معصوم سرہندی کے نام حقائق و معارف کے سلسلے میں کچھ مکتوب تحریر کیے۔

لیکن ان کی یہ کتابیں اب کہیں نہیں ملتیں۔ شیخ محمد اکرام افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں:

ان کتابوں میں سے ہمیں ایک بھی دست یاب نہیں ہوئی۔ لیکن انڈیا آفس لائبریری (ذخیرۂ دہلی) میں خواجہ کلاں کی ایک اہم تصنیف "مبلغ الرجال" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ چھوٹے سائز کے ۱۱۸ اوراق ہیں۔ اس کا مقصدِ تصنیف اس انتشار کو رفع کرنا تھا جو "آرائے اہلِ فکر و نظر و اقوالِ کشف و شہود" کی وجہ سے "معرفتِ حقیقتِ عالم" کے متعلق پیدا ہو گیا تھا۔ کتابچے کا کافی حصہ

قرامطہ و ملاحدہ کے بیان میں ہے۔ اکبر، ابوالفضل اور شیخ مبارک پر بڑی نکتہ چینی کی ہے۔ بعض صوفیا کی تصانیف اور ان صوفیا کی، جو قلتِ ادراک کی وجہ سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے، شکایت کی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کا ذکر اپنے والد کے "اعظم الخلفا" کے الفاظ سے کیا ہے۔

خواجہ عبید اللہ دہلوی نے تریسٹھ (۶۳) سال عمر پا کر ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۰۷۳ھ کو دہلی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔[۲۶۵]

۶۰۔ علامہ عثمان بوبکانی سندھی

علامہ حکیم عثمان بن عیسیٰ بن ابراہیم صدیقی بوبکانی سندھی، اعمالِ سیوستان کے ایک گاؤں "بوبکان" میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ بعد ازاں حصولِ علم کی غرض سے عازمِ گجرات ہوئے۔ وہاں فقہ، اصولِ فقہ اور علومِ عربیہ کی تحصیل قاضی محمود بوربی اور علامہ وجیہ الدین علوی گجراتی سے کی۔ منطق اور فلسفہ کے لیے شیخ حسین بغدادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ۹۸۳ھ کو برہان پور کا قصد کیا۔ یہ وہ دور تھا، جب کہ علوم مروجہ، یعنی فقہ و اصول، علوم عربیہ، منطق و فلسفہ اور طب وغیرہ میں مہارت پیدا کر چکے تھے۔ برہان پور اور اس نواح کا امیر اس زمانے میں محمد شاہ فاروقی تھا، وہ انتہائی احترام سے پیش آیا۔ ان کی فراوانیٔ علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں تدریس و افتا کی مسند پیش کی، جس پر یہ ستائیس (۲۷) سال متعین رہے۔ اس دوران میں ان سے بہت سے اہلِ علم نے استفادہ کیا، جن میں قاضی نصیر الدین بن سراج محمد برہان پوری (متوفی ۱۰۳۱ھ)، قاضی عبدالسلام سندھی، شیخ صالح سندھی اور شیخ یوسف بنگالی کے داماد شیخ سکھ جی شامل ہیں۔ گلزارِ ابرار کے مصنف محمد غوثی مانڈوی کا شمار بھی ان کے حلقۂ تلمذ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ان سے علمِ ہیئت اور حکمت و فلسفہ کی کچھ کتابیں

---

[۲۶۵] زبدۃ المقامات۔ ص ۶۱ تا ۶۶ —— مآثر الکرام۔ ص ۹۱، ۹۲ —— رودِ کوثر۔ ص ۲۱۳ —— نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۶۹

پڑھیں۔ علامہ حکیم عثمان سندھی جہاں معقولات و منقولات کے بہت بڑے عالم تھے اور علومِ شرعیہ میں کامل دست گاہ رکھتے تھے، وہاں نہایت نیک، متقی اور زاہد و عابد بھی تھے۔ ان کے علم و فضل اور ورع و تقویٰ کی بنا پر لوگوں کے دل میں ان کی بے حد قدر و منزلت تھی۔ ان کے معتقدین کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ مشتبہات سے پرہیز کرتے، اور نماز نہایت اہتمام اور سکون سے پڑھتے۔ مشتبہات سے دامن کشاں رہنے اور احتیاط کا یہ عالم تھا کہ پورے چالیس سال کسی کے گھر سے کھانا نہیں کھایا کہ مبادا کوئی ناجائز چیز حلق سے نیچے اتر جائے۔

قلم و قرطاس سے بھی تعلق تھا۔ صحیح بخاری کی ایک شرح سپردِ قلم کی اور تفسیر بیضاوی کا حاشیہ لکھا۔ برہان پور میں تین فاروقی حکمرانوں کا زمانہ دیکھا۔ ہر بادشاہ نے ان کی قدر و منزلت کی۔ محمد شاہ فاروقی ان کے تقرر سے ایک سال بعد فوت ہوگیا۔ اس کے بعد راجہ علی خاں عادل شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی ان کے منصب و وظیفہ کو اضافے کے ساتھ برقرار رکھا۔ ۱۰۰۵ھ میں بہادر خاں بادشاہ ہوا۔ وہ اگرچہ نہایت سنگین حالات میں حکمران ہوا تھا۔ لیکن ان کے احترام میں کوتاہی نہیں کی۔

۱۰۰۸ھ میں علامہ عثمان سندھی نے برہان پور کی سکونت ترک کرکے، اس نواح کے ایک گاؤں میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ گاؤں انھیں بطور وظیفہ و جاگیر کے عطا ہوا تھا۔ وہاں پہنچے تو مغل حکمران جلال الدین اکبر نے تسخیرِ خاندیس کے عزم سے خود اقدام کیا اور اس کے لشکر کی آمد کی اطلاع ملی۔ اس وقت برہان پور کی طرف واپس جانا خلاف مصلحت گردانا اور چند روز کے لیے وہاں کے جنگل ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ اکبر کے حملے کی وجہ سے ملکی نظام معطل ہوچکا تھا، ایک روز اچانک رہزنوں اور ڈاکوؤں کا ایک گروہ اُدھر آنکلا۔ صبح کا وقت تھا، ڈاکو ننگی تلواریں اور نیزے لہراتے ہوئے آئے۔ علامہ عثمان سندھی کا قافلہ سترہ افراد پر مشتمل تھا، جو سب ان کے اعزہ و اقارب، حسب و نسب میں بلند مرتبہ اور علوم دین سے آراستہ تھے۔ ڈاکوؤں کے اس سرکش گروہ نے علامہ عثمان سمیت سب کو قتل کردیا، اور خون سے بھری ہوئی جانمازیں

ان کے کفن ہوئیں ۔

علامہ حکیم عثمان علم و فضل کی نعمت سے بہرہ ور، تدین و تقویٰ کی صفت سے متصف اور تصنیف و تالیف کی دولت سے مالا مال تھے ۔ شکستہ خاطر، عجز و لینت کے پیکر، اسبابِ دنیوی اور اصحابِ دنیا سے دور، پرہیزگاری کی کامل تصویر اور حلیم الطبع تھے ۔ برِّ صغیر کے اس عظیم المرتبت عالمِ دین نے ماہِ شعبان ۱۰۰۸ھ کو درجۂ شہادت حاصل کیا۔[۲۶۵]

۶۱- قاضی عثمان سندھی

قاضی عثمان سندھی، علاقہ سندھ کے موضع دربیلہ کے رہنے والے تھے ۔ نیکی و عفت سے بہرہ یاب اور فضل و صلاح سے سعادت اندوز تھے ۔ عالم و فقیہ اور شیخ وقت تھے ۔ عمر بھر درس و افادہ میں مصروف رہے اور زاہد و عابد کی حیثیت سے زندگی بسر کی ۔ متداول علوم کی تمام اقسام میں مہارت رکھتے تھے، صفاتِ حمیدہ اور اخلاقِ پسندیدہ سے موصوف تھے، کبر سنی میں بھی تدریس و تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا ۔ بے حد متواضع اور منکسر المزاج تھے ۔ عمدہ اوصاف میں اپنے معاصرین سے فائق تر تھے ۔ دنیوی مفاد سے کوئی علاقہ نہ رکھتے، کسی شخص سے کوئی نذرانہ یا عطیہ قبول نہ کرتے ۔ علما و طلبا کی ایک جماعت ہمیشہ ان کے یہاں رہتی، سب کے قیام و طعام اور سکونت کا خود انتظام کرتے ۔ اپنے قول و فعل اور عمل و حرکت سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچاتے ۔ جو کچھ پاس ہوتا خدمتِ دین میں خرچ کر دیتے، کوئی چیز بچا کر نہ رکھتے ۔ اس عالمِ دین اور فقیہِ سندھ کی وفات ۱۰۰۲ھ کو ہوئی [۲۶۶]

---

۲۶۵ اذکارِ ابرار (ترجمہ گلزار ابرار) ۔ ص ۴۴۵، ۴۴۶ ——— تذکرہ علمائے سندھ ۔ ص ۲۱۶ تا ۲۲۱ ——— تحفۃ الکرام ۔ ص ۱۶۱ ——— نزہۃ الخواطر ۔ ج ۵، ص ۲۷۰، ۲۷۱

۲۶۶ تاریخ معصومی ۔ ص ۲۳۱ ——— نزہۃ الخواطر ۔ ج ۵، ص ۲۷۱

۶۲- شیخ عثمان سارنگ پوری

شیخ عثمان سارنگ پوری، شیخ منجھن بن عبداللہ بن خیر الدین لکھنوتوی مالوی سارنگ پوری کے بیٹے تھے۔ سرزمینِ مالوہ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ منجھن اور دیگر علمائے عصر سے اخذِ علم کیا۔ چوں کہ علم وفضل کی گود میں آنکھیں کھولیں اور ورع وتقویٰ کے ماحول میں پرورش پائی تھی، اس لیے بچپن ہی میں حصولِ علم میں لگ گئے اور فقہ واصول اور علوم عربیہ میں کامل مہارت پیدا کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مسندِ درس وافادہ پر متمکن ہوئے۔ کثیر الدرس، کثیر الافادہ اور صالح عالمِ دین تھے۔[۲۶۰]

۶۳- مولانا عطاء اللہ عثمانی جون پوری

مولانا عطاء اللہ عثمانی اصفہانی جون پوری کے والد کا نام حبیب اللہ تھا۔ ان کے آباد اجداد درحقیقت اصفہان سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں برصغیر میں آکر جون پور کے قریب ایک گاؤں موضع گھوسی میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ اس زمانے میں یہ ایک مرکزی قریہ تھا اور اہلِ علم کی ایک جماعت یہاں آباد تھی۔ جون پور، ہندوستان کے صوبہ یوپی کے علمی مرکز اعظم گڑھ سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ مولانا عطاء اللہ کی ولادت اپنے گاؤں گھوسی میں ہوئی اور وہیں تربیت کی ابتدائی منزلیں طے کیں۔ اس دور میں جون پور کو علم وتحقیق اور علما وفضلا کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی، اور وہاں گیارھویں صدی ہجری کے نامور فاضل علامہ محمود عمری جون پوری (متوفی ۱۰۶۲ھ) کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ مولانا عطاء اللہ اس میں داخل ہوئے اور علامہ ممدوح سے اخذِ علم کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے علاوہ دیگر علما سے بھی استفادہ فرمایا۔ حصولِ علم کے بعد سلوک وطریقت کی راہ پر قدم زن ہوئے اور اس ضمن میں شیخ عبدالقدوس بن عبدالسلام جون پوری سے

---

۲۶۰ اذکار ابرار۔ ص ۳۷۱ ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۷۲

استفاضہ کیا۔

مولانا عطار اللہ عثمانی اپنے زمانے کے فاضلِ کبیر اور شیخ تھے۔ پرہیز گار، متدین اور عبادت گزار تھے۔ فقہ و اصول اور علومِ عربیہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ ۵ ربیع الثانی ۱۰۶۳ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے [۲۶۸]

۶۴۰۔ مولانا عطار اللہ سہسوانی

مولانا عطار اللہ بن محمد ہاشم بن عبدالشکور حسینی مودودی سہسوانی، سہسوان کے علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، دادا، اور چچا سب اصحابِ علم اور اربابِ فضل تھے۔ خاندانی وقار و وجاہت اور علمی شان و شکوہ کی بنا پر یہ گھرانہ خاص عزت و تکریم کا حامل تھا، اور لوگ ان کے سب افراد کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے —— اس خاندان کے ایک بزرگ مولانا عطار اللہ تھے، جو اپنے صاحبِ علم چچا شیخ صدرالدین محمد الحاکم کے شاگردِ رشید اور مریدِ خاص تھے۔ چچا کی وفات کے بعد انہی کی مسندِ خلافت و درس پر فائز ہوئے۔ شیخ صالح اور نامور فقیہ تھے، صوری و معنوی فضائل کے حامل تھے۔ حلقۂ درس وارادت بڑا وسیع تھا، دور دراز علاقوں سے علما و طلبا استفادہ و استفاضہ کے لیے حاضر ہوتے۔ اپنے اوصافِ گوناگوں کی بنا پر مرجعِ خلائق اور مقتدائے عالم تھے۔ غزا و جہاد کے جذبے سے بھی سرشار تھے، چنانچہ کئی مرتبہ طلبا و مریدین کو ساتھ لے کر جہاد فی سبیل اللہ کا شرف حاصل کیا اور میدانِ کارزار میں کفار و مشرکین کو شکست دی۔ اعلائے کلمۃ اللہ اور اشاعتِ اسلام ان کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا۔ اس کے لیے تیغ و سنان سے بھی کام لیا اور وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ کثیر تعداد میں ہندو اور دیگر غیر مسلم ان کے ہاتھ پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور متعدد منکرین

---

[۲۶۸] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۷۴ بحوالہ اصول المقصود

و مشرکین نے ان کی کوشش سے قبولیتِ دینِ حق کی سعادت حاصل کی۔ ایک بزرگ شیخ نور الدین سنبھلی نے اپنی کتاب "اسرار العارفین" میں ان کے حالات و سوانح، کمالات و فضائل اور علمی و عملی کارناموں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

مدت تک یہ کیفیت رہی کہ کبھی جذب و سکر کا غلبہ ہو گیا، اور کبھی سلوک و طریقت نے زور باندھا۔ ان کیفیات کے زمانے میں وہ زیادہ تر آبادی سے دور نکل جاتے اور کسی جنگل میں جا کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جاتے، وہاں یک سوئی سے ریاضت و عبادت میں مشغول ہو جاتے۔

نہایت بارعب اور پرجلال عالم تھے۔ ان کو دیکھ کر لوگوں پر ایک خاص تاثر پیدا ہوتا اور مرعوبیت چھا جاتی۔ برصغیر کے شہر سہسوان کے اس عالمِ دین نے نوّے (۹۰) برس کی عمر پا کر ۱۰۹۴ھ کو جنت کی راہ لی[۲۶۹]۔

۶۵۔ ملا عصمت اللہ سہارن پوری

ملا عصمت اللہ سہارن پوری دیارِ ہند کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ فاضل اور فقیہِ متبحر تھے۔ عمر کے آخری دور میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے لیکن چشمِ بصیرت ہمیشہ روشن رہی۔ پوری زندگی خدمتِ علم اور درس و تدریس میں گزار دی۔ بہترین تصانیف کے مصنف تھے، جن میں شرح خلاصۃ الحساب اور حاشیہ فوائد ضیائیہ (یعنی شرح ملا جامی) شامل ہیں۔ ۱۰۳۹ھ کو فوت ہوئے[۲۷۰]۔

۶۶۔ مولانا علاء الملک حسینی مرعشی

مولانا علاء الملک بن علامہ نور اللہ حسینی مرعشی، گیارھویں صدی ہجری کے شیخ اور

---

۲۶۹ حیوٰۃ العلما۔ ص ۱۷، ۱۸ ــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۷۵

۲۷۰ مآثر الکرام۔ ص ۱۹۴، ۱۹۵ ــــ سبحۃ المرجان۔ ص ۵۲ ــــ ابجد العلوم۔ ص ۹۰۰ ــــ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۴۰ ــــ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب۔ ص ۱۹۷ ــــ حدائق الحنفیہ۔ ص ۴۰۷۔

صاحبِ فضل و کمال تھے۔ اپنے والد علّامہ نور اللہ حسینی مرعشی سے اخذِ علم کیا اور طویل عرصہ ان کی خدمت میں رہے۔ پھر شیراز چلے گئے اور علما کی ایک بڑی جماعت سے مختلف علوم و فنون کی تحصیل کی۔ بعد ازاں واردِ ہند ہوئے اور مغل حکمران شاہ جہان سے تعلق و قرب پیدا ہوا۔ شاہ جہان دین دار، علم دوست اور علما کا قدر دان بادشاہ تھا۔ اس نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے محمد شجاع کا معلم مقرر کر دیا، اور یہ اس کے ساتھ بنگال چلے گئے۔

مولانا علاء الملک حسینی مرعشی، تصنیف و تالیف سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے مختلف عنوانات پر کئی کتابیں تصنیف کیں، جن کے نام یہ ہیں: منطق میں کتاب مہذب، الٰہیات میں انوار الہدیٰ، اثبات واجب تعالیٰ کے موضوع پر الصراط الوسیط۔[۱۷۵]

۶۷۔ شیخ علم اللہ امیٹھوی

شیخ علم اللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ علم اللہ بن عبدالرزاق بن خاصہ بن خضر صالحی امیٹھوی، ۲۷ جمادی الاولیٰ ۹۵۴ھ کو شہر امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والدِ گرامی شیخ عبدالرزاق سے جو عالم و فاضل بزرگ تھے، علم حاصل کیا۔ امیٹھی ہی کے ایک اور عالم شیخ نظام الدین عثمانی امیٹھوی کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ پھر عازمِ حجاز ہوئے اور ارضِ مقدس میں اٹھارہ سال قیام فرما رہے، وہاں کے مشائخ و اساتذہ سے حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی، یہاں تک کہ حدیث، فقہ اور دیگر علومِ مروّجہ میں فائق تر گردانے گئے۔

ہندوستان واپس آئے تو برہان پور پہنچے، وہاں عادل شاہ فاروقی دادِ حکمرانی

---

۱۷۵ صبح صادق — تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۲۷۱ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۷۵، ۲۷۶

دیتا تھا۔ اس نے نہایت عزت واحترام سے خیر مقدم کیا۔ اس کی درخواست پر وہاں طویل عرصے تک مقیم رہے۔ ایک روایت کے مطابق اس اثنا میں جب کبر سنی کو پہنچے تو ۱۰۲۲ھ میں دوبارہ حج کے ارادے سے نکلے، لیکن جا نہ سکے۔

مولانا علم اللہ امیٹھوی کا یہ دلچسپ واقعہ تمام تذکروں میں مرقوم ہے کہ ان کے داماد قاضی نصیر الدین برہان پوری ان سے فقہ کی کچھ کتابوں کا درس لیتے تھے۔ قاضی نصیر الدین عامل بالحدیث تھے۔ وہ حدیث کے مقابلے میں فقہ اور قیاسِ مجتہد کو نہیں مانتے تھے، جب کوئی ایسی صورت پیش آتی اور مقابلہ فقہ اور حدیث کا ہوتا تو وہ حدیث کو ترجیح دیتے اور فقہ وقیاس کو ماننے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیتے، لیکن شیخ علم اللہ امیٹھوی اس کے برعکس امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے احتجاج کرتے اور اس کو حجت گردانتے۔ ایک روز دورانِ درس میں کچھ ایسا ہی معاملہ سامنے آیا تو قاضی نصیر الدین نے امام ابو حنیفہ کے قول کے مقابلے میں حدیث پیش کی اور کہا کہ امام صاحب بھی ایک انسان تھے اور میں بھی ایک انسان ہوں، وہ معصوم تو نہیں تھے، حدیث کے مقابلے میں آخر ان کے قول کو کیوں راجح قرار دیا جائے۔ اس پر شیخ علم اللہ نے طیش میں آکر تلوار نکال لی اور ان کو قتل کرنے پر اُتر آئے، لیکن نصیر الدین جان بچا کر بھاگ اُٹھے، شیخ نے بیجا پور تک ان کا تعاقب کیا۔

عبد الباقی نہاوندی نے بھی مآثر رحیمی میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ علم اللہ امیٹھوی کے داماد قاضی نصیر الدین برہان پوری، قیاس وفقہ اور قولِ امام ابو حنیفہ پر حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ترجیح دیتے تھے، یہ بھی کہتے تھے کہ حدیث، علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل موضوع ہے[۲۷۲]۔ اس پر شیخ علم اللہ نے

۲۷۲؎ اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے علما بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں۔ ملا علی قاری ہروی اس بارے میں لکھتے ہیں: قال الدمیری والعسقلانی لا اصل له وکذا قال الزرکشی۔ وسکت عنہ السیوطی۔ (موضوعات الکبیر ص ۴۸ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۵ھ)

ان کو کافر قرار دیا اور فتویٰ جاری کیا کہ انھیں قتل کر دیا جائے اور آگ میں جلا دیا جائے۔ ساتھ ہی اس فتوے کی توثیق کے لیے علما کا محضر بھی ترتیب دے دیا۔ علمانے شیخ علم اللہ کی تصدیق کی اور محضر پر مہریں ثبت کر دیں۔ ظاہر ہے یہ معاملہ انتہائی سنگین نوعیت کا تھا۔ اس زمانے میں اس علاقے کا امیر عبدالرحیم خانِ خاناں تھا۔ اس نے قاضی نصیر الدین کی مدد کی، اور زیر نزاع مسئلہ مغل حکمران جہاں گیر کے سامنے پیش کیا گیا۔ جہاں گیر نے شیخ علم اللہ امیٹھوی اور قاضی نصیر الدین برہان پوری دونوں کو طلب کیا۔ لیکن قاضی نصیر الدین تو حجاز چلے گئے اور شیخ علم اللہ بیجاپور تشریف لے گئے، بیجاپور میں وہ ابراہیم عادل شاہ سے منسلک ہو گئے۔

بہرحال شیخ علم اللہ امیٹھوی دین دار، پرہیزگار، عابد، زاہد، متورع اور متبحر عالم تھے۔ وہ عمر بھر درس و تدریس میں مصروف رہے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ عبدالرحیم خان خاناں ان کا بے حد اکرام کرتا، اور ان کے ہاں جانے اور استفادہ کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی وقت ان سے مفارقت ہو، ان کی سفارشیں قبول کرتا اور عطیات و صلات سے نوازتا۔

روضۃ الاولیا کی روایت کے مطابق شیخ علم اللہ امیٹھوی نے ۱۱ ذی الحجہ ۱۰۲۰ھ کو وفات پائی، بعض لوگوں نے "استاد اہل حدیث" سے تاریخ نکالی۔ انھیں بیجاپور میں دفن کیا گیا۔[۲۷۳]

۶۹۔ سید علم اللہ شاہ بریلوی

سید علم اللہ شاہ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ، برصغیر کے عظیم القدر خاندان کے فرزند تھے۔ اکتیسویں پشت میں ان کا سلسلۂ نسب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے

---

۲۷۳ اذکار ابرار۔ ص ۵۷۸، ۵۷۹ —— مآثر رحیمی۔ ج ۳ ص ۲۰ تا ۲۲

نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۷۶، ۲۷۷

ذریعے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ چوتھی پشت میں یہ باشندگانِ پاک و ہند کے عظیم محسن اور مجاہد اسلام حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے جدّ امجد ہیں۔ ان کے خاندان کا ہر رکن نیکی و پاکبازی میں منفرد تھا۔ سید علم اللہ شاہ کے حالات بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ ان میں سے بعض بزرگوں کا تعارف کرا دیا جائے۔ تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ سید موصوف کس اونچے خانوادے کے رکنِ رکین تھے۔ نیز یہ پتا چل سکے کہ یہ خاندان کس طرح ہندوستان میں آیا اور ان میں سے کس شخص نے پہلے پہل اس ملک میں سکونت اختیار کی۔

سید رشید الدین

سید علم اللہ کے آبا و اجداد میں پندرھویں پشت میں ایک بزرگ سید رشید الدین تھے۔ غالباً اس خاندان کے یہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے مع اہل و عیال مدینہ منورہ کی سکونت ترک کی اور بغداد کو اپنا مسکن بنایا۔ ترکِ مدینہ اور اقامتِ بغداد کی اصل وجہ کیا تھی؟ اس کا علم نہیں ہوسکا۔ سید رشید الدین نے بغداد ہی میں وفات پائی اور حطیرۂ شیخ عبدالقادر جیلانی میں دفن ہوئے۔

سید قطب الدین محمد

سید رشید الدین کے بیٹے سید قطب الدین محمد تھے۔ والد کی وفات کے بعد وہ بغداد سے اُٹھ کر غزنی پہنچے۔ کچھ عرصہ وہاں ٹھہرے۔ بعد ازاں ۶۰۷ھ کو اقربا و مریدین کی ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان چلے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم ہوچکی تھی اور تختِ دہلی پر سلطان شمس الدین ایلتتمش متمکن تھا۔ سلطان نے سید قطب الدین سے بڑے اعزاز و اکرام کا برتاؤ کیا، لیکن وہ دہلی میں نہیں ٹھہرے، پورب کو روانہ ہوگئے۔ نواحِ کڑا میں ایک وسیع علاقہ فتح کیا اور اس میں اقامت اختیار کرلی۔ اس خاندان کے شجروں میں انھیں "امیر کبیر" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ قیامِ غزنی کے باعث انھیں "الغزنوی" اور سکونتِ کڑا کی بنا پر "الکڑدی" کی نسبت سے پکارا جاتا ہے اور

"امیر سید قطب الدین محمد الغزنوی الکردی" کے الفاظ کے ساتھ ان کا نام لکھا جاتا ہے

صاحبِ نزہۃ الخواطر سید عبدالحی حسنی لکھنوی ان کا ذکر "الامیر الکبیر بدر المنیر شیخ الاسلام قطب الدین محمد بن احمد المدنی الکردی" کے الفاظ سے کرتے ہیں:

اس خاندان کے یہ پہلے بزرگ ہیں جو واردِ ہند ہوئے اور اس ملک میں باقاعدہ توطن اختیار کیا۔ سید قطب الدین محمد نے ۶۲۷ھ کو وفات پائی۔

سید قطب الدین کی اولاد

سید قطب الدین محمد کے تین بیٹے تھے۔ بڑے سید نظام الدین، منجھلے سید قوام الدین، چھوٹے سید تاج الدین۔ سید نظام الدین کے بارے تو کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ سید قوام الدین کے حالات میں مذکور ہے کہ وہ علم و عمل میں امتیازی حیثیت کے حامل تھے اور اپنے عصر میں سرتاجِ سادات کے مرتبے پر فائز تھے۔ ان کے تدین اور علم و عمل سے متاثر ہو کر سلطان قطب الدین ایلتمش نے اپنی ایک بیٹی ان کے عقد میں دے دی تھی۔[۲۴]

تذکرۃ الابرار میں سید تاج الدین کا ذکر بھی بڑے احترام سے لیا گیا ہے اور انھیں "مشہور بہ سراج شہید" لکھا گیا ہے۔

ضیاء الدین برنی نے "تاریخ فیروز شاہی" میں ان حضرات کا تذکرہ بڑی عقیدت سے کیا ہے۔ برنی کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

سید السادات سید تاج الدین، شیخ الاسلام سید قطب الدین کے بیٹے تھے۔ خود سید تاج الدین کے بیٹے کا نام بھی قطب الدین تھا، پوتے سید اعز الدین تھے۔ یہ دونوں بدایوں کے منصبِ قضا پر فائز رہے۔ خود سید تاج الدین کئی برس تک اودھ کے عہدۂ قضا پر متعین رہے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے انھیں اودھ کی قضا سے معزول کر کے بدایوں کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ سید تاج الدین مرحوم و مغفور بڑے بلند مرتبہ سید تھے۔[۲۵]

سید قطب الدین محمد کے بڑے بیٹے سید نظام الدین تھے۔ سید نظام الدین کے

---

[۲۴] تذکرۃ الابرار۔ ص ۱۶۱

[۲۵] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۵۰، ۳۵۱

بیٹے کا نام سید رکن الدین تھا۔ سید رکن الدین کڑا کے قاضی تھے۔ ضیاء الدین برنی نے
ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ برنی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

سید تاج الدین کے بھتیجے سید رکن الدین تھے، جو کڑا کے قاضی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو
جامع فضائل پیدا کیا (باری تعالیٰ سید رکن الدین را جامع فضائل آفریدہ بود)۔ وہ کشف و
کرامت سے بہرہ مند تھے ۔۔۔ ان کی عمر ترک و تجرید اور اعطا و ایثار میں گزری۔ تاریخ
فیروز شاہی کے مؤلف نے سید تاج الدین اور سید رکن الدین رحمہما اللہ دونوں سے ملاقات کی
سعادت حاصل کی، اور ان کی پابوسی کے آداب بجالایا، (و شرائط پابوس ایشاں بجاآوردہ) میں
نے ان جیسے بلند مرتبہ سید بہت کم دیکھے ہیں۔ خدا نے جو عمدہ اور روشن اوصاف انھیں عطا
کیے یا جس حشمت و عزت سے انھیں نوازا، وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی[۲۷۶]

قاضی سید محمود

اس عالی مرتبہ گھرانے کے ایک فرد سید قطب الدین ثانی تھے جو چھٹی پشت میں سید
علم اللہ کے اجداد میں سے تھے۔ یہ کڑا کی سکونت ترک کر کے جائس چلے گئے تھے۔ ان
کی اور ان کی زوجہ محترم کی وفات جائس ہی میں ہوئی۔ انھوں نے جائس میں ایک مسجد
بھی بنوائی تھی۔ ان کے لڑکے سید علاء الدین تھے، علاء الدین بھی جائس میں سکونت پذیر
رہے۔ لیکن پوتے سید محمود کو نصیر آباد میں عہدۂ قضا پر متعین کیا گیا تو وہ جائس سے
نصیر آباد منتقل ہو گئے۔ نصیر آباد کا محلہ قضیانہ انھی کا آباد کردہ ہے۔ شروع شروع
میں اس محلے کو محلہ قاضی محمود کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔

قاضی سید احمد

قاضی سید محمود کی وفات کے بعد نصیر آباد کا منصبِ قضا ان کے بیٹے قاضی سید
احمد کے سپرد ہوا۔ وہ دینی اور شرعی معاملات میں نہایت غیرت مند اور باحمیت تھے
ایک مرتبہ ایک قریبی رشتے دار کا مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ انھوں نے شریعت

---

۲۷۶ تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۴۹

کی روشنی میں اس کا فیصلہ کر دیا۔ یہ فیصلہ رشتے دار کے خلاف تھا۔ وہ فیصلہ سن کر غصے میں آگیا اور ایسے الفاظ زبان سے نکالے جن سے شریعت کی اہانت کا پہلو نکلتا اور حکم شرعی سے اظہار برأت ہوتا تھا۔ قاضی سید احمد نے یہ الفاظ سنے تو منصب قضا سے استعفا دے دیا اور اہل و عیال سمیت نصیر آباد سے نکل کر رائے بریلی چلے گئے۔ پھر زندگی بھر نصیر آباد کا رخ نہیں کیا۔ فرماتے تھے جس آبادی میں حکم شریعت سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہو، وہاں ٹھہرنا کسی ایمان دار کو زیب نہیں دیتا۔

سید فتح عالم

قاضی سید احمد کے استعفا کے بعد نصیر آباد کا عہدۂ قضا سید فتح عالم بن سید محمد بن سید محمود نے سنبھالا۔ مولانا غلام رسول مہر کے بقول "خاندان میں غالباً وہی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے مغل دربار سے علاقہ خاص پیدا کیا۔ ان کے فرزند سید ابو محمد، شہزادہ مراد بخش ابن شاہ جہان کے ہاں دیوانی کی خدمت پر مامور تھے"[۲۷۷]

سید فضیل

قاضی سید احمد نے نصیر آباد سے نقل مکانی کے بعد زندگی کے بقیہ ایام رائے بریلی میں گزارے۔ لیکن ان کے بیٹے سید معظم اپنے خاندان کے لوگوں میں پھر نصیر آباد چلے گئے تھے۔ سید معظم کے دو بیٹے تھے۔ سید فضیل اور سید اسحاق۔ دونوں زہد و عبادت کے پیکر تھے۔ بالخصوص سید فضیل بہت بڑے عالم اور تصوّف و طریقت میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ ان کے شب و روز کا بیشتر حصہ ضرورت مندوں اور کمزور لوگوں کی خدمت میں صرف ہوتا۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ ہر ایک کے دروازے پر جاکر دستک دیتے اور پوچھتے کہ کوئی کام ہو تو بتاؤ میں کر دوں۔ خدمتِ خلق میں وہ اس حد تک آگے بڑھے ہوئے تھے کہ کسی کو ایندھن کی بھی ضرورت ہوتی تو بازار سے خرید کر اپنے سر پر اٹھا کر لاتے۔ یہ خدمات انجام دینے کے بعد طلبا کی تعلیم و تدریس میں

---

۲۷۷ سید احمد شہید۔ ص ۳۳

مشغول ہو جاتے۔ علاوہ ازیں درویشوں اور عقیدت مندوں کے کام میں ان کی مدد کرتے۔

ایک مرتبہ برادری کے افراد بعض خاندانی جھگڑوں کے فیصلے کی غرض سے جمع ہوئے۔ سیّد فضیل بھی اس اجتماع میں شریک تھے۔ مختلف لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مختلف تجویزیں پیش کیں، ان تجویزوں پر بحث ہونے لگی تو سید فضیل نے کہا: "جو فیصلہ بھی کیا جائے، شریعتِ حقہ کے مطابق کیا جائے، اور اللہ کے حکم کو معیارِ فیصلہ قرار دیا جائے۔" بعض افراد نے ان کی اس تجویز کے خلاف بولنا شروع کر دیا۔ اس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو کر سید فضیل اسی وقت مجلس سے اُٹھ کر چلے گئے، گھر پہنچے، سامانِ سفر باندھا اور دن غروب ہونے سے پہلے پہلے نصیر آباد سے نکل گئے۔ فرمایا، جہاں شریعتِ حقہ کا احترام نہ کیا جاتا ہو، وہاں مسلمان کے لیے بود و باش حرام ہے۔ ان کے جدِّ امجد سید احمد نے تو نصیر آباد کو چھوڑ کر دس میل کے فاصلے پر رائے بریلی میں سکونت اختیار کر لی تھی، لیکن سید فضیل نے پورے ملکِ ہند ہی کو خیر باد کہہ کر ارضِ حجاز کا رُخ کر لیا۔ مکہ مکرمہ گئے اور حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں اقامت گزین ہو گئے۔ اواخرِ ذی الحجہ ۱۰۳۲ھ کو اسی خاکِ پاک کی آغوش میں ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ بعض اصحاب نے تاریخِ وفات اللہ کے اس فرمان وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ سے نکالی۔

سیّد فضیل کی شادی قاضی سید فتح عالم کی بیٹی صاحب النسا سے ہوئی تھی۔ سیّد ممدوح کی وفات کے وقت ان کے بڑے بیٹے سید داؤد، بہت کم سن تھے۔ دو یا تین برس کے۔! چھوٹے بیٹے سید علم اللہ، باپ کی وفات سے دو مہینے چودہ دن بعد پیدا ہوئے —— یہی سید علم اللہ ہیں، جو گیارھویں صدی ہجری کے وہ عالی مرتبت ہندی عالم و فاضل تھے، جن کا عہدِ عالم گیری میں، زہد و تقویٰ میں کوئی حریف نہ تھا اور اتباعِ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جن کا کوئی مثل و نظیر نہ تھا —— یہی وہ عظیم شخصیت ہیں، جو چوتھی پشت میں برصغیر پاک و ہند کے مجاہدِ اعظم حضرت سید

احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد تھے ــــ آئندہ سطور میں ہم انہی کے حالات بیان کریں گے ۔

سید علم اللہ کی ولادت اور عہدِ طفولیت

سید علم اللہ، ١٢ ربیع الاول ١٠٣٣ھ کو نصیر آباد کے محلہ قضیانہ میں صبح کے وقت پیدا ہوئے ۔ ان کے والد (سید فضیل) جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ہجرت کرکے حجاز تشریف لے گئے تھے، اور مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کرلی تھی ۔ سید علم اللہ کی والدہ نصیر آباد ہی میں مقیم تھیں، ان کی ولادت باپ کی وفات سے دو مہینے چودہ دن بعد ہوئی ۔ کچھ مدت بعد والدہ بھی انتقال کر گئیں ۔ اب یہ دو کم سن یتیم بھائی تھے ۔ ایک داؤد، دوسرے علم اللہ ۔ ! دونوں کی تربیت کی ذمہ داری دیوان سید ابو محمد نے قبول کی، جو ان کے حقیقی ماموں تھے ۔ سید ابو محمد کو ان سے بے پناہ محبت تھی، اور وہ ان سے بڑی شفقت کرتے تھے ۔ اپنے بچوں پر بھی ان کو ترجیح دیتے تھے ۔ خود شاہ علم اللہ اکثر اس کا ذکر کرتے اور فرمایا کرتے کہ میری اولاد کے لیے ضروری ہے کہ سید ابو محمد کی تعظیم و تکریم اور حسنِ سلوک کو زندگی کا لازمی حصہ بنالیں ۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ بات میرے لیے مسرت کا باعث ہوگی ۔

مولانا غلام رسول مہر نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جو سید علم اللہ کی پیدائش سے قبل ظہور میں آیا ۔ وہ واقعہ ایک خاندانی روایت کے طور پر مشہور ہے، جو یہ ہے کہ سید فضیل نے سید علم اللہ کی پیدائش سے پہلے خواب دیکھا تھا کہ گھر میں مٹی کے ایک طشت کے نیچے آفتاب چھپا ہوا ہے اور اس کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہی ہیں ۔ آخر آفتاب آہستہ آہستہ طشت سے باہر نکل آیا اور بلند ہوا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر کے در و دیوار اور اطراف و جوانب اس کی ضیا گستری سے بقعۂ نور بن گئے [٢٧٨] منقول ہے کہ سید علم اللہ کی ولادت کو اس خواب کی تعبیر قرار دے گیا ۔ ان کے

---

٢٧٨ سید احمد شہید ۔ ص ٥٥

وجود سے سننِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی ترویج و تجدید کے اسباب پیدا ہوئے، احکامِ شریعت کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کے مواقع میسر آئے، اتباعِ سنت کا آفتاب درخشاں ہوا اور اسلام کے احکام و فرائض کی دور دور تک روشنی پھیلی۔ حسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ اس خاندان میں ترویجِ اسلام اور اشاعتِ دین کی جو روایت شروع سے چلی آرہی ہے، وہ اب تک مختلف شکلوں میں قائم ہے۔

سید علم اللہ کے زمانۂ بچپن کا ایک واقعہ جبکہ وہ پانچ برس کے لگ بھگ تھے، اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز وہ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ادھر سے شیخ بندگی نظام الدین کے فرزند، شیخ بندگی جعفر امیٹھوی کا گزر ہوا۔ شیخ کی نظر شاہ علم اللہ پر پڑی تو رک گئے اور دیر تک انھیں دیکھتے رہے۔ ارادت مندوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا، اس بچے کی پیشانی سے تجلیِ اعظم کے نور کی موجیں اٹھ رہی ہیں، امید ہے اس کے فیوض سے ایک جہان منور ہوگا۔

شادی، سلسلۂ ملازمت اور ترکِ دنیا

اب سید علم اللہ کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہوتا ہے۔ عمرِ بلوغ میں قدم رکھا تو شیخ ہاشم جائسی کی بیٹی سے شادی ہوئی۔ اب تک ماموں سید ابو محمد کفیل تھے، جو شاہ جہان کے دربار میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ شادی کے بعد انھوں نے ملازمت کے لیے لاہور بلالیا۔ تذکرۃ الابرار کی روایت کے مطابق سید ابو محمد دو تین مرتبہ انھیں شاہی دربار میں لے کر گئے، لیکن ملازمت کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ بار بار کی یہ آمد و رفت سید علم اللہ کی طبعِ غیور پر گراں گزری، اور ان کا قلبِ صفا دنیا کی اس ظاہری عز و جاہ سے متنفر ہوگیا۔ سوچا کہ دنیا کے سلاطین و ملوک کے دروازوں پر حاجب اور دربان بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے ملاقات کے خاص آداب اور اوقات مقرر ہیں، کبھی شرفِ باریابی حاصل ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا۔ کیوں نہ انسان ان سے کنارہ کشی اختیار کرکے اس مالکِ حقیقی کے بابِ عالی پر مستقل طور سے بیٹھ جائے جو ہر شاہ و گدا اور امیر و غریب کے لیے ہر آن کھلا رہتا ہے۔ نہ وہاں کسی حاجب و دربان

کی ممانعت کا خطرہ اور نہ آنے جانے کے اوقات و آداب مقرر۔! چنانچہ ہر چیز ترک کی، ننگے پاؤں اور ننگے سر باہر نکل آئے اور اعلان کر دیا کہ میرا سامان جو شخص چاہے لے جائے یہ تو تھی "تذکرۃ الابرار" کی روایت ۔ اب "وقائع احمدی" کی روایت سنیے۔

"وقائع احمدی" میں مرقوم ہے کہ سید علم اللہ، سواروں میں ملازم ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ موکبِ شاہی موسمِ سرما میں لاہور پہنچا۔ رات کا وقت تھا اور شدید بارش ہو رہی تھی۔ شاہ جہان بادشاہ نے اپنے ایک معتمد کو بھیجا کہ وہ جا کر دیکھے کہ اس وقت پہرے پر کون کون موجود ہے۔ معتمد نے ہر جگہ گھوم پھر کر دیکھا، صرف ایک مقام پر ایک پہرے دار کھڑا نظر آیا جو موسلا دھار بارش میں گھوڑے پر سوار تھا۔ نیزہ ہاتھ میں تھا اور قرآن پڑھ رہا تھا۔ نام پوچھا تو بتایا ___ علم اللہ ___

دوسرے روز بادشاہ نے سید علم اللہ کو بلایا اور فرض شناسی و مستعدی پر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ جب سید ممدوح کو معلوم ہوا کہ خوشنودی کا یہ اظہار موسلا دھار بارش میں پہرے پر حاضر رہنے کا نتیجہ ہے تو معاً دل میں خیال آیا کہ دنیا کا بادشاہ اگر منصبی خدمت گزاری پر خوش ہو سکتا ہے تو مالکِ حقیقی کی خدمت گزاری کو اگر شیوہ و شعار بنا لیا جائے تو وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہو گا، اور خدمت گزار کو مستحقِ اجر و انعام ٹھہرائے گا۔ چنانچہ اسی وقت ملازمت ترک کر دی، مال و اسباب لوگوں کو دے دیا اور فقر و درویشی کی زندگی اختیار کر لی۔

یہ دو روایتیں ہیں۔ ان میں سے کسی کو صحیح مان لیجیے، نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے، وہ یہ کہ سید علم اللہ شاہ آغازِ شباب ہی میں دنیوی ترقی و ترفع کے بہترین وسائل سے دست کش ہو گئے تھے اور فقر و انزوا کی زندگی اختیار کر لی تھی۔

لیکن دیوان سید ابو محمد کو لائق اور جوان بھانجے کے اس اقدام سے بڑی پریشانی ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بھانجا انھیں بچوں سے زیادہ عزیز تھا اور وہ اسے حالتِ فقیری میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ خود ان کا شمار دربارِ شاہی کے امرا میں ہوتا تھا، اتنے بڑے عزیز کا اس طرح فقر و درویشی اختیار کر لینا،

زمانے کے عام تصور کے مطابق ان کے لیے باعثِ عزت نہ تھا۔ فوراً بھانجے کے پاس پہنچے، بہت سمجھایا، زمانے نشیب و فراز سے آگاہ کیا لیکن وہ نہ مانتے، اپنے دل میں قطعی اور آخری فیصلہ کرکے جو قدم اٹھا چکے تھے، اسے واپس لینے پر تیار نہ ہوئے۔ دوسروں نے بھی سمجھایا، لیکن اپنی بات پر قائم رہے۔

اب سید علم اللہ نے اپنی ذاتی شان و شکوہ ختم کرنے اور انکسار و مسکنت کی راہ پر گامزن ہونے کی مشق شروع کی جو راہِ حق میں وصولِ کمال کی منزلِ اوّلیں ہے۔ انھوں نے یہ معمول بنالیا کہ روزانہ علی الصبح باہر نکل جاتے، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور سر پر اٹھاکر اپنے ماموں ــــ دیوان سید ابو محمد ــــ کے لشکر میں فروخت کرتے۔ جتنے پیسے ملتے، ان میں سے کچھ پیسے اپنے کھانے پر صرف کرتے، باقی محتاجوں میں بانٹ دیتے۔

شیخ آدم بنوری کی بیعت و خلافت

یہ منزل طے کرنے کے بعد پیرِ طریقت کی تلاش شروع ہوئی۔ شیخ آدم بنوری کی خدمت میں پہنچے اور ان کی صحبت میں طریقت و سلوک کی منزلیں طے کیں اور اخذِ علم کیا۔ اب "ولایت خاصہ و اخص وخاص الخاص" کے منصب سے سرفراز تھے۔

شیخ آدم بنوری نے خلعت دے کر وطن جانے کا حکم دیا، اور فرمایا: "اُس جانب ولایت کے چراغوں میں تمھاری حیثیت شمع کی سی ہوگی، بلکہ ستاروں کے درمیان آفتاب کا درجہ پاؤگے۔"

سید علم اللہ اپنے والد گرامی کی طرح حرمین شریفین جانے کا ارادہ رکھتے تھے، بیوی کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ شیخ سے اس کی اجازت چاہی تو دے دی۔ ساتھ ہی فرمایا: "لیکن شرط یہ ہے کہ اہل اللہ میں سے اگر کوئی راستے میں روک لے تو رُک جانا اور وہیں اقامت اختیار کرلینا۔"

رائے بریلی میں قیام

سید علم اللہ، شیخ آدم بنوری سے رخصت لے کر نصیر آباد پہنچے اور بیوی سے کہا میں اپنے لیے فقر و انزوا اور ترک و تجرد کی راہ منتخب کرچکا ہوں، اگر تمھیں میرے

نقطۂ نظر سے اتفاق ہے تو گھر کا تمام مال و اسباب محتاجوں اور ضرورت مندوں کو دے دو۔ نیک بخت بیوی نے بلند مرتبہ شوہر کے عمل و عقیدہ سے پورے اتفاق کا اظہار کیا اور بلا تامل ان کے حکم کی تعمیل کی۔ قریبی رشتے داروں نے اپنے اموال و املاک میں سے ایک ایک حصہ الگ کر کے سید علم اللہ کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے یہ عطیہ بھی مسکینوں کو دے دیا۔ منقول ہے کہ چار مرتبہ یہی صورت پیش آئی۔ بالآخر اعزہ و اقارب اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی چیز انھیں اس خیال سے دینا بے سود ہے کہ یہ خود اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

اب سید موصوف نے حجاز جانے کا ارادہ کیا اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر نصیر آباد سے رخصت ہو گئے۔ پہلی منزل رائے بریلی میں ہوئی۔ وہاں کچھ دن اپنے خالہ زاد بھائی کے ہاں ٹھہرے۔ سید علم اللہ کا معمول تھا کہ رات کے آخری حصے میں بیدار ہو کر سئی ندی پر تشریف لے جاتے، وہیں عالمِ تنہائی اور لوگوں سے علیحدگی میں نمازِ تہجد ادا کرتے۔ رائے بریلی ہی میں ایک مجذوب اہل اللہ شیخ عبدالشکور جائسی سے ملاقات ہوئی۔ انھیں جب پتا چلا کہ سید علم اللہ ہجرتِ حجاز کے ارادے سے جا رہے ہیں تو سخت اصرار کر کے روک لیا۔ اس وقت سید ممدوح کو اپنے شیخ طریقت آدم بنوری کا یہ فرمان بھی یاد آ گیا کہ اللہ کا کوئی نیک بندہ راستے میں روکے تو رک جانا۔ چنانچہ رائے بریلی میں قیام پر رضامند ہو گئے۔ یہ مقام ان کے لیے نیا اور غیر مانوس نہ تھا۔ ان کے جدِ امجد نے بھی یہاں عمر گزاری تھی اور کچھ عزیز بھی رہ رہے تھے۔ ایک مقامی زمیندار کو ان کے ارادۂ قیام کا علم ہوا تو آبادی سے باہر سئی ندی کے کنارے دس بیگھے زمین ہبہ کر دی۔ یہی جگہ آگے چل کر دائرۂ علم اللہ یا تکیہ علم اللہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سید احمد شہید پیدا ہوئے اور اسی جگہ انھوں نے زندگی کے ابتدائی چالیس برس گزارے۔

معلوم ہوتا ہے، شیخ عبدالشکور جائسی اور سید علم اللہ کے درمیان گہرے مخلصانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے، شیخ جائسی، سید موصوف سے بہت متاثر تھے اور وہ ان کا

بڑا احترام کرتے تھے۔ سید ممدوح بھی ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے مشوروں پر عمل کرتے تھے

شیخ عبدالشکور ہی نے تکیہ کی جگہ تجویز کی، سید علم اللہ کے مکان اور مسجد کے مقامات بھی انہی نے متعین کیے۔ رائے بریلی کے ایک محلے کا نام لوہانی پور ہے، یہیں کے ایک زمیندار دولت خاں نے دس بیگھے زمین دی تھی۔ سید علم اللہ نے اسی زمین میں چھپر ڈال کر سکونت کا انتظام کیا اور کچی مسجد تعمیر کی۔

سفرِ حج

اقامتِ رائے بریلی سے کئی سال بعد سید علم اللہ حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ سفرِ حج میں ان کے تیسرے بیٹے ابو حنیفہ بھی ساتھ تھے جو ان دنوں بارہ برس کے تھے۔ تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق یہ بائیس آدمیوں کا قافلہ تھا جو سعادتِ حج کی غرض سے رائے بریلی سے روانہ ہوا۔ بندرگاہ تک ان لوگوں نے تمام سفر پیدل اور ننگے پاؤں طے کیا۔ عقیدت مندوں نے سواریوں کی پیش کش کی، لیکن سید صاحب نے کوئی سواری قبول نہ کی۔ اپنا ضروری سامان، جو قرآنِ مجید، جائے نماز، وضو کا لوٹا اور بستر وغیرہ پر مشتمل تھا، سید ممدوح خود اٹھاتے تھے، تمام سفر میں کسی کو کسی قسم کی تکلیف دینا گوارا نہ کی —— مردانِ حق کا یہ قافلہ بندرگاہ پر پہنچا تو ان کے تدین و للہیت، اسلام سے بے پناہ محبت و شیفتگی اور کمال اتباعِ سنت کو دیکھ کر جہاز کے مالکوں کے تاثر و گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ ان سب لوگوں کو مفت لے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا اور بائیس روپے فی کس کے حساب سے پورے قافلے کا کرایہ ادا کیا۔ مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ گئے۔

دیارِ رسول سے ان کی بے انتہا محبت کا اندازہ لگائیے کہ ہندوستان کے سفر میں اس لیے جوتا نہ پہنا کہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے جا رہے ہیں، تا حدِ امکان عجز و ادب کے ظاہری تقاضوں کو بھی پورا کرنا چاہیے۔ حجاز کی ارضِ مقدس میں پہنچے تو اس بنا پر جوتا پہننا مناسب نہ جانا کہ اس پاک سرزمین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خرام گاہ

ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس پر ننگے پاؤں ہی چلنا چاہیے۔

قیام مدینہ منورہ کے ایام میں سید علم اللہ نماز کے بعد جنگل میں چلے جاتے اور لکڑیاں کاٹ کر لاتے، انھیں فروخت کر کے جتنے پیسے ملتے، ان میں اپنے اخراجات پورے کرتے۔ ان کی ترکِ دنیا اور عجز و سادگی کی وجہ سے مشائخ حرمین، انھیں ”مثیل ابی ذر“ کے لقب سے پکارتے تھے۔ یہ حج انھوں نے غالباً ۱۰۶۸ھ یا ۱۰۶۹ھ میں کیا۔

دوسری مرتبہ ۱۰۸۰ھ میں عازمِ حج ہوئے۔ اس مرتبہ حرم شریف کا نقشہ طول و عرض کے تعین کے ساتھ کاغذ پر کھینچ کر ساتھ لائے اور اسی نقشے کے مطابق رائے بریلی کے دائرے میں مسجد تعمیر کرائی۔ البتہ حرم کے احترام کے خیال سے مسجد کے طول و عرض میں چند انگشت کی کمی کر دی۔ مسجد کی بنیاد میں تبرک و تیمن کی غرض سے آبِ زمزم ڈالا۔ مسجد کی تعمیر ۱۰۸۳ھ کو مکمل ہوئی۔ تاریخ تکمیل ”قبلۂ ثانی“ سے نکلتی ہے۔

اتباعِ سنت اور عمل و ایثار کا بے پناہ جذبہ

سید علم اللہ شاہ اتباعِ سنت کا نہایت شدید جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے، احکامِ شریعت کے سختی سے پابند تھے، اس میں ان کی استقامت کا یہ حال تھا کہ کسی چھوٹے بڑے کی کوئی پروا نہ کرتے۔ قرآن و حدیث کے ہر حکم سے محبت اور ہر برائی سے نفرت تھی۔ ہر معاملے یعنی کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، جاگنے سونے، بات چیت، لوگوں سے میل جول اور رسم و راہ قائم رکھنے میں ہمیشہ اتباعِ سنت اور پیرویٔ شریعت پیشِ نگاہ رہتی۔ ان کی طبیعت بن گئی تھی کہ عزیمت کی باتوں پر عمل کرتے اور رخصت و جواز سے فائدہ نہ اٹھاتے۔ اعزہ و اقارب اور معتقدین و مریدین کو بھی اسی کی تاکید کرتے، تواضع اور سادگی کا بہترین نمونہ تھے، ہر چھوٹے بڑے کو سلام کرنے میں سبقت لے جانے کے لیے کوشاں ہوتے۔ اس باب میں جو مسنون طریقہ ہے، اسی کی پابندی فرماتے، ہاتھ اٹھا کر یا گردن جھکا کر سلام کو مکروہ اور خلافِ شریعت گردانتے۔ لباس میں انتہائی محتاط اور پابندِ سنت تھے۔ روئی والا جبہ کبھی نہیں پہنا، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں پہنا تھا۔ کسی سے مخاطب ہوتے تو بڑے احترام

سے نام لیتے، ان کے سامنے اصل معیارِ تعلق اور پیمانۂ محبت صرف اطاعتِ رسول اور اتباعِ سنت تھا۔ کسی سے محبت کرتے تو اللہ کی رضا جوئی کے لیے اور بغض رکھتے تو اللہ کی خوشنودی کی غرض سے۔ الحب للہ والبغض للہ پر عامل تھے۔ کوئی شخص کسی خلافِ سنت فعل کا مرتکب ہو جاتا تو جب تک اس سے توبہ و رجوع نہ کر لیتا اور اللہ سے معافی نہ مانگ لیتا، اس سے ملنا ترک کر دیتے، خواہ وہ کتنا ہی قریبی عزیز اور رشتے دار ہوتا۔

بدعات و محدثات کے سخت مخالف تھے۔ اہلِ بدعت کے سلام کا بالکل جواب نہ دیتے، نہ ان سے ملتے، نہ ان کے ہدایا و تحائف قبول کرتے۔ ان کو شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور لوگوں کو تلقین فرماتے کہ ان سے تعلقات قائم نہ کریں۔ ان کی اتباعِ سنت اور تنفرِ بدعت کی عام شہرت تھی۔ لاہور کے شیخ میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید شیخ عبدالحمید ابدال تھے، جن کا حلقۂ ارادت بڑا وسیع تھا۔ ابدال صاحب کے ایک مرید نے سید علم اللہ کے بارے میں پوچھا تو ابدال صاحب نے فرمایا:

اے عزیز! حضرت سید [علم اللہ] اتباعِ سنت اور پیروئ رسالت میں اس عہد کے یگانہ فرد ہیں۔ اسلاف میں بھی ان جیسے بہت کم لوگ گزرے ہیں۔ سید ہونے کی وجہ سے ان کو فرزندی کا رتبہ حاصل تھا۔ پھر محبوبیت کا منصب ملا۔ یہ بلند درجے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئے۔

گھر کے کام خود انجام دینے کی کوشش کرتے یا کم از کم ان میں شریک ہوتے، مثلاً جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے، پانی لاتے، کھانا پکانے میں گھر والوں کی مدد کرتے یہاں تک کہ جھاڑو دیتے اور گھر کی صفائی کرتے۔

کسی کام کے لیے کسی کو حکم نہ دیتے، خود کرنا شروع کر دیتے، دوسرے دیکھ کر خود ہی اس میں شریک ہو جاتے۔ شریکِ کار ہونے والے کو منع بھی نہ کرتے۔ اس سلسلے میں بہت سی باتیں تذکروں میں مذکور ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ چھپر بنانا چاہتے تھے، خود ہی بنانا شروع کر دیا، مسجد کے لیے چونے کی ضرورت تھی، خود ہی زمین کھود کر روڑی نکالنے لگے۔ بازار سے ضروری استعمال کی چیزیں خریدنے جاتے تو سب چیزیں اپنے سر پر اٹھا کر

لاتے۔ دوسرے کو بالکل تکلیف نہ دیتے۔

تقسیم اشیا میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے، پورا خیال رکھتے کہ نہ کوئی چیز کسی کو زیادہ ملے، نہ کم۔ سب کا حصہ برابر اور مساوی ہو، اسی لیے کھانا اکٹھا تیار کراتے، پھر سب گھر والوں، عزیزوں اور عقیدت مندوں کو برابر تقسیم کر دیتے۔ یہ بظاہر چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت بڑی اہم اور بنیادی بات ہے۔ اس سے کئی قسم کے شکوک و شبہات کے دروازے کھل جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سید علم اللہ اس میں انتہائی احتیاط فرماتے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ کسی نے چار یا چھ سنگترے پیش کیے، ان کو تقسیم کرنے سے بات نہیں بنتی تھی۔ سیّد موصوف نے ان کا عرق نکلوا کر کھانے میں ڈال دیا، تاکہ کوئی اس سے محروم نہ رہے اور تقسیم میں برابری کا اصول مجروح نہ ہو۔

شیر خوار بچوں کی ماؤں کا بھی پورا خیال رکھتے، ان کو خشک چیزیں دے دیتے تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق پکا کر کھالیں۔ ہدایا قبول کرنے میں بھی بڑے محتاط تھے۔ غریبوں اور مقروضوں سے کبھی تحفہ اور ہدیہ نہیں لیا، جن ارباب دولت اور اصحاب ثروت کے اقربا و اعزہ غریب ہوتے، ان سے بھی کوئی چیز نہ لیتے، فرماتے، قرض کی ادائیگی اور ذوی الارحام کی امداد تم پر فرض ہے، پہلے فرض پر عمل کرو، پھر دوسروں کو دو۔ دوسروں کو دینا زیادہ سے زیادہ نفل کی حیثیت رکھتا ہے، فرائض کو ترک کرنے والوں کی نفلی عبادت کیوں کر درجۂ مقبولیت کو پہنچ سکتی ہے؟

ایک مرتبہ سئی ندی میں طغیانی آئی اور سید صاحب کا مکان پانی میں ڈوب کر منہدم ہو گیا۔ ایک مرید نے مکان کی تعمیر کے لیے پانچ سو روپے کی رقم بطور ہدیہ پیش کی۔ سید ممدوح نے تمام رفقا کو جمع کیا اور کہا کہ اگر اپنے ہاتھ سے مکان بنانے کے لیے تیار ہو جاؤ تو یہ رقم تمھاری عام ضرورتوں پر خرچ ہو گی اور نہ مزدوروں اور اجیروں کو دے دی جائے گی۔ رفقا نے بہ طیب خاطر سب کام خود کرنے کا فیصلہ کیا۔ سید صاحب بھی برابر کام میں مصروف رہے، مٹی کھودتے، گارا تیار کرتے اور سب کے ساتھ برابر ٹوکریاں اٹھاتے۔

علم و فضل

علم و فضل کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ علومِ شرعیہ اور معارفِ الٰہیہ سے پوری طرح باخبر تھے۔ عارف باللہ اور عالم ربانی تھے۔ تمام انواع خبر اور اقسامِ علوم سے بہرہ ور تھے۔ قرآن، حدیث، فقہ اور باقی علومِ متداولہ و مروجہ پر عبور رکھتے تھے۔ قانع و عفیف، عابد و زاہد اور مرقع صلاح و تقویٰ تھے۔ سفر و حضر میں کثرت سے صدقات و خیرات اور ایثار کا مظاہرہ کرتے۔ باوجود اس کے کہ خود تنگ دست ہوتے اور فقر و غربت کی زندگی بسر کرتے لیکن اصحابِ حوائج کی نہایت صدق و اخلاص سے مدد کرتے۔

اللہ نے انھیں خوب صورتی سے بھی نوازا تھا۔ بہت ہی وجیہ اور حسین تھے، قد و قامت کی نعمت بھی حاصل تھی۔ نورِ ایمان کی باطنی تزیین کے ساتھ ساتھ ظاہری اعتبار سے بھی حسن و زیبائی سے مزین تھے۔ جب دن کو باہر نکلتے لوگوں کا ہجوم جمع ہو جاتا اور حصولِ برکت کی غرض سے وہ ہاتھوں کو چومنے کی کوشش کرتے، مگر سید صاحب اس حرکت کو گوارا نہ کرتے اور سختی سے روک دیتے۔ جب کوئی ان کی تعریف کرتا تو اظہارِ خفگی فرماتے اور جب نصیحت کی جاتی تو خوش ہوتے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مصروف رہتے اور خلافِ شرع امور کی نہایت سختی سے نکیر کرتے۔ شیخ جلیل، عالمِ کبیر اور زبردست مبلغِ دین تھے۔

اسلامیت کی تصویرِ کامل

اپنے اعمال و افعال اور اخلاق و کردار میں اسلامیت کی کامل تصویر تھے۔ انھی امور پر عمل کرتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ اپنے بیٹوں کا نکاح کیا تو اسی مقدار میں مہر مقرر کیا جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت ملتا ہے۔ اور وہی شیوہ اختیار کیا جو احادیث میں مذکور ہے۔ بیٹیوں کے نکاح میں بھی یہی معیار سامنے رکھا۔ پھر نکاح کے بعد انھیں پیدل رخصت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اسی طرح رخصت فرمایا تھا۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس ضمن میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، جو یہ ہے کہ ایک بیٹی کی نسبت اپنے چچازاد بھائی

سید ہدایت اللہ کے بیٹے سید عبدالرحیم سے ہوئی تھی۔ وہ نصیر آباد میں رہتے تھے۔ سید علم اللہ شاہ نے بیٹی کے نکاح اور رخصتی کا فیصلہ کیا تو خود نصیر آباد گئے۔ رشتے داروں سے ملے۔ پھر سید عبدالرحیم سے کہا۔ میاں وضو کر کے آیئے تاکہ نکاح کر دیا جائے۔ رشتے داروں نے اس طریق نکاح سے اختلاف کیا اور کہا کہ نکاح کے لیے باقاعدہ تاریخ مقرر کر کے برادری کو جمع کرنا چاہیے، اور جوڑے جامے تیار ہونے چاہئیں، لیکن سید صاحب موصوف نے چپ چاپ نکاح پڑھوایا اور بیٹی کو رخصت کر دیا۔[۲۷۹]

سماع و مزامیر اور بدعات کی مخالفت

سماع و مزامیر، قوالی اور بدعات کے سخت مخالف تھے۔ اس سلسلے کے چند واقعات لائق تذکرہ ہیں۔

ایک مرتبہ مشہور عالم و شیخ پیر محمد سلونی رائے بریلی تشریف لائے۔ ان کی مجلس میں عام طور پر سماع کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ انھوں نے سید علم اللہ سے ملاقات کا وقت مانگا، سید موصوف نے جواب دیا کہ آپ باہر سے آئے ہیں، ملاقات کے لیے مجھے حاضر ہونا چاہیے تھا، لیکن چوں کہ آپ کے ہاں سماع و مزامیر اور قوالی کا سلسلہ جاری ہے، لہذا معذرت خواہ ہوں۔ نہیں آسکتا۔

ایک دفعہ مشہور عالم و فاضل اور بہت سی علمی و فنی کتابوں کے مصنف ملا جیون امیٹھوی نے سماع کے موضوع پر مناظرہ شروع کر دیا۔ سید علم اللہ نے اعتراضات کیے تو ملا موصوف باایں علم و فضل جواب نہ دے سکے۔

پہلے یا دوسرے سفر حج میں ایک مقام پر قیام پذیر ہوئے اور نماز جمعہ کے لیے مسجد میں گئے۔ وہاں ایک پیر چلہ کشی میں مشغول تھا اور گرد و نواح کے لوگوں میں اس کی نیکی اور خدارسیدگی کی بڑی شہرت تھی۔ سید علم اللہ بھی اس سے ملنے کے آرزومند تھے اور خیال تھا کہ نماز کے بعد مسجد میں ضرور ملاقات ہوگی۔ لیکن پیر صاحب نماز جمعہ میں شامل نہ ہوئے۔

۲۷۹ے سید احمد شہید۔ ص ۴۲

سید علم اللہ نماز کے بعد اپنی قیام گاہ پر چلے آئے اور اس پیر کے مریدوں سے کہا۔ جو شخص نماز کے لیے باہر نہ نکلا اور اس نے کسی شرعی عذر کے بغیر قطعی فرض ترک کر دیا، اس کا منہ دیکھنا ہرگز روا نہیں اور اس کے ساتھ ملاقات سراسر خطا ہے[۲۸۰]

غرض خود سید صاحب بدعات کی سخت تردید کرتے اور غیر شرعی امور کے مرتکب سے کوئی علاقہ نہ رکھتے۔ اگرچہ دنیوی اعتبار سے وہ کتنا بھی بڑا آدمی ہوتا۔

کمال احتیاط

کسی کا ہدیہ لینے اور نذر قبول کرنے سے سید علم اللہ کمال احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جب تک یقین نہ ہو جاتا کہ جو مال دیا جا رہا ہے، وہ شک و شبہ سے خالی ہے اور چیز دینے والا پابندِ شرع ہے، کوئی چیز قبول نہ فرماتے۔ اس ضمن کا ایک واقعہ یہ ہے کہ رائے بریلی کے محلہ لوہانی پور کے ایک زمیندار کا نام پیر خاں تھا۔ یہ شخص سید علم اللہ سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے سید صاحب کی خدمت میں آم پیش کیے۔ فرمایا یہ آپ کا اور آپ کے بھائیوں کا مشترکہ مال ہے، اگر آپ اپنا حصہ تقسیم کرا کے لاتے تو میں ضرور لے لیتا، اب نہیں لے سکتا۔ پیر خاں نے عرض کیا، بھائیوں کے حصے کا میں ذمہ دار ہوں۔ وہ آم دے کر تھوڑی دور گیا ہو گا کہ سید صاحب نے آدمی بھیج کر اُسے واپس بلایا اور کہا:

میں نے جب سے راہِ فقر پر قدم زن ہوا ہوں، بارگاہِ باری تعالیٰ میں ہمیشہ دعا مانگتا رہا ہوں کہ مجھے حرام اور مشتبہ مال سے محفوظ رکھا جائے۔ آپ کا ہدیہ مالِ مشتبہ ہے، میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔

نتائج الحرمین کی روایت ہے کہ شیخ آدم بنوری سے جن حضرات نے کسبِ فیض کیا، ان میں سید علم اللہ کا اسمِ گرامی تو شامل ہے ہی، ان کے علاوہ شیخ محمد سلطان بلیادی اور شیخ عثمان شاہ جہان پوری بھی اسی خوش بخت جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ عثمان

---

[۲۸۰] سید احمد شہید۔ ص ۴۲

کو سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے ہاں خاص عزت و احترام کے مستحق سمجھا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ شیخ عثمان نے شیخ محمد سلطان اور سید علم اللہ کی تنگ دستی کے بارے میں سلطان اورنگ زیب عالم گیر کو خط لکھا اور امداد کی سفارش کی۔ عالم گیر نے خط دیکھتے ہی شیخ سلطان کی خانقاہ کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ سید علم اللہ وظیفہ قبول نہیں کریں گے، اس لیے حکم دیا کہ جس مال سے خود ہمارے لیے کھانے کا انتظام ہوتا ہے، اس میں سے دو سو روپے بہ طورِ ہدیہ سید علم اللہ کو بھیج دیے جائیں۔ سید صاحب کو بے شک معلوم تھا کہ یہ ہدیہ رزقِ حلال سے آیا ہے، اور بھیجنے والا وہ بادشاہ ہے، جس سے بڑھ کر صاحبِ تقویٰ بادشاہ کم از کم ہندوستان کے تختِ حکومت پر کوئی نہیں بیٹھا۔ لیکن اس کے باوجود ہدیۂ واپس کر دیا۔ یہ ان کی شانِ استغنا اور احتیاط کی انتہا تھی۔!

فقر و تنگ دستی کی دعا

لوگ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے فارغ البالی اور وسعتِ مال و دولت کی دعا مانگتے ہیں، لیکن سید علم اللہ کا طرزِ عمل اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اکثر اپنی اولاد کے لیے اللہ سے فقر و تنگ دستی کی دعا مانگتے تاکہ وہ لوگ اس جہانِ فانی کے عارضی آرام و آسائش اور دنیوی نعم و زخارف کی محبت میں الجھ کر دین و شریعت اور صلاح و تقویٰ کی راہ ترک نہ کر دیں۔ چنانچہ اس خاندان میں اگر کسی کے گھر ضرورت کی عام چیزیں نہ ہوتیں اور فقر و احتیاج کی نوبت آجاتی تو تنگی کی اس حالت کو اس طرح تعبیر کیا جانے لگا تھا کہ "فلاں گھر میں شاہ علم اللہ تشریف فرما ہیں"[۲۸۱]۔

یعنی ان کی اصطلاح میں تنگ دستی اور شاہ علم اللہ لازم و ملزوم ہیں اور ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

صبر و تحمل کی انتہا

سید علم اللہ بدرجہ غایت صابر و شاکر اور انتہا درجے راضی بہ قضا رہنے والے

۲۸۱؎ مخزن احمدی، ص ۴۲

تھے۔ ان کے بیٹوں میں سے ایک بیٹے سید ابو حنیفہ تھے۔ بڑے نیک، پابند شرع اور پاک باز تھے۔ ان اوصاف کی وجہ سے بلند مرتبہ باپ کو بڑے محبوب تھے۔ عین عالم جوانی میں بتیس ۳۲ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ رات کا وقت تھا۔ سید صاحب نے گھر کے تمام افراد کو قضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کی تلقین فرمائی۔ نہ کوئی رویا، نہ کوئی حرفِ شکایت کسی کی زبان پر آیا۔ رات بالکل خاموشی میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو سید صاحب نے اطمینان کے ساتھ فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا فرمائی۔ نماز کے بعد ایک شخص سے کہا کہ رات میاں ابو حنیفہ فوت ہو گئے، ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا چاہیے۔

جوان اور سعادت مند بیٹے کو دفن کر چکے تو فرمایا، الحمد للہ، میاں ابو حنیفہ اس دنیا سے دولتِ ایمان کے ساتھ رخصت ہوئے ہیں۔ گھر میں ایک بوڑھی عورت روزانہ چرخا چلایا کرتی تھی۔ سوت کاتنے کے سوا اس کا کوئی کام نہ تھا۔ سید ابو حنیفہ کی وفات کے دن اس نے افسوس میں اپنا کام بند رکھا۔ سید علم اللہ گھر گئے تو چرخا بند تھا، فرمایا، یہ کام کیوں بند کیا ہے؟ بڑھیا نے کہا، ایسا نیک اور جوان بیٹا دنیا سے اٹھ گیا ہے، چرخے کا ہوش کیسے رہ سکتا ہے۔؟ فرمایا، یہ سب قضا و قدر کے معاملے ہیں، اللہ کے حکم میں کون دم مار سکتا ہے۔ سب کی زندگی چند روزہ ہے۔ ہمیں خدا کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔ اپنا کام بند نہ کرو۔

ایک عجیب و غریب واقعہ

مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیا میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے حوالے سے سید علم اللہ کے بارے میں ایک عجیب و غریب واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ علامہ سیالکوٹی فرمایا کرتے تھے کہ سید علم اللہ نے مجھے (عبدالحکیم کو) ایک مرتبہ ایک روپیہ عطا کیا، میں نے وہ روپیہ تبرک کے طور پر ایک تھیلی میں رکھ لیا، کئی سال وہ روپیہ میرے پاس رہا۔ جب تک وہ روپیہ موجود رہا، تھیلی میں سے روپے ختم نہیں ہوئے۔

وفات

عمر کے آخری حصے میں غذا بہت کم کر دی تھی، چنے کی دال کا تھوڑا سا پانی اور چند دانے چاول کے کھاتے۔ حبِّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبے میں یہ دعا کرتے کہ اتنی ہی عمر ہو، جتنی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی گئی تھی۔ ۸۔ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ کو دوشنبہ کے روز رائے بریلی میں فوت ہوئے۔ باسٹھ برس، آٹھ مہینے اور چھبیس دن کی عمر پائی۔ تاریخ وفات "دوست بفردوس رسید" نکلی۔

سلطان اورنگ زیب عالم گیر کو سیّد علم اللہ سے بڑی عقیدت تھی۔ انہی دنوں اس نے خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی، اور فرشتے آپ کے جنازۂ مبارک کو آسمان پر لے گئے۔ اس خواب سے عالم گیر سخت پریشان ہوا۔ ملاّجیون سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا، غالباً سیّد علم اللہ فوت ہو گئے۔ چنانچہ خواب کی تاریخ لکھی گئی۔ پھر وقائع نویس کی اطلاع سے تصدیق ہو گئی کہ واقعی سید علم اللہ نے اسی روز انتقال کیا۔ بادشاہ نے ملاجیون سے پوچھا کہ آپ نے یہ تعبیر کس دلیل کی بنا پر کی تھی؟ کہا، صرف اس بنا پر کہ سیّد علم اللہ اتباعِ سنت کا اس قدر کامل ترین نمونہ تھے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی وفات کا مطلب یہ تھا کہ سنت کا ایک نہایت پاکیزہ اور عمدہ ترین نمونہ دنیا سے اُٹھ گیا۔

اولاد

سیّد علم اللہ کی شادی سید ہاشم جائسی کی صاحب زادی بی بی صالحہ سے ہوئی تھی۔ اس سیّدہ سے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹیوں میں سے ایک کا نام سیدہ حنیفہ تھا، ان کی شادی سیّد عبدالرحیم بن سید ہدایت اللہ ابن سیّد اسحاق برادرِ سیّد فضل سے ہوئی۔ دوسری حلیمہ تھیں، جو سیّد محمد جعفر بن سیّد قطب عالم سے بیاہی گئیں۔

چار بیٹوں کے نام یہ تھے۔ سب سے بڑے سیّد آیت اللہ، دوسرے سیّد محمد ہدیٰ، تیسرے سیّد ابو حنیفہ اور چوتھے سیّد محمد۔ ! سیّد ابو حنیفہ، بتیس ۳۲ سال کی عمر پاکر سیّد علم اللہ کی زندگی ہی میں ۱۰۸۰ھ میں وفات پا گئے تھے۔ سیّد آیت اللہ نے ۱۲ رجب ۱۱۱۶ھ

کو انتقال کیا۔

سید محمد ہدیٰ نے ربیع الاول ۱۱۲۰ھ کو رحلت فرمائی۔

سید محمد، دائرۂ علم اللہ کی سکونت ترک کر کے شہر رائے بریلی کے اس حصے میں جا آباد ہوئے جو قلعے کے نام سے موسوم تھا۔ والدہ کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ وہیں ایک دائرہ بنا لیا تھا، ایک مسجد بھی تعمیر کر لی تھی۔ ان کی والدہ سیدہ بی بی صالحہ، اپنے جلیل القدر شوہر (سید علم اللہ) کے بارہ برس بعد ۱۱۔ صفر ۱۱۰۸ھ کو عازمِ فردوس ہوئیں۔ خود سید محمد نے ۲۴۔ ربیع الثانی ۱۱۵۵ کو جنت کی راہ لی۔

ان سب کے حالات ان شاء اللہ اپنے اپنے مقام پر بیان ہوں گے۔ یہ نہایت پاک باز اور بلند مرتبت حضرات تھے۔

سید علم اللہ نے وصیت کی تھی کہ میرے بعد کسی بیٹے کی دستار بندی نہ کی جائے۔ یعنی کسی کو خلیفہ یا جانشین نہ بنایا جائے۔ سجادہ آرائی کا جو سلسلہ عام طور پر رائج تھا، اس سے سخت متنفر تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے خاندان میں یہ سلسلہ جاری نہ ہو۔ چنانچہ اسی پر عمل ہوا۔ اس گھرانے کے بہت سے افراد نے اپنے حلقے سے باہر جا کر بھی کسبِ فیض کیا اگر کسی شخص نے خود ان میں سے کسی سے مستفیض و مستفید ہونے کی خواہش ظاہر کی تو اس کی تمنا بھی پوری کر دی۔ لیکن باقاعدہ گدی بنا کر یا سجادہ نشین ہو کر کسی نے افادہ و اضافہ کا سلسلہ شروع نہیں کیا۔ اسی طرح دنیوی مال و دولت اور عز و جاہ کی طلب کو بھی کسی نے شیوہ نہ بنایا اور نہ اس کے لیے کوئی سرگرداں ہوا۔ اگر دولت ملی تو اسے غریبوں اور محتاجوں میں بانٹ دیا۔[۲۸۴]

---

۲۸۴ سید علم اللہ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: تذکرۃ الابرار، مخزن احمدی، وقائع احمدی، نتائج الحرمین، بحر ذخار، مہر جہاں تاب، خزینۃ الاصفیا، سیرت السادات، اعلام الہدیٰ، سیرت عطیہ، سید احمد شہید، سیرت سید احمد شہید۔

۶۹۔ قاضی علی بیجاپوری

قاضی علی بن اسد اللہ بن عبد اللہ بن وجیہ الدین علوی گجراتی بیجاپوری۔ عالمِ کبیر، شیخ عصر اور علامۂ وقت تھے۔ حسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ ان کے والد اسد اللہ بھی عالم و فاضل تھے، دادا عبد اللہ بھی یگانۂ روزگار اور صاحب علم تھے اور پردادا وجیہ الدین بھی دیارِ ہند کے منفرد عالم، ممتاز محقق اور بلند مرتبہ مصنف تھے۔ یعنی کئی پشتوں سے یہ خاندان علم و تحقیق اور زہد و اتقا کا مرکز چلا آرہا تھا اور بے شمار علما و فضلا ان سے کسبِ فیض اور اخذِ علم کر چکے تھے۔ تدین و تقویٰ میں بھی ان کا درجہ بہت اونچا تھا۔ عباد و صلحا کی بہت بڑی جماعت ان سے شرفِ فیض حاصل کر چکی تھی۔

قاضی علی گجرات میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اسی شہر کے فحول علما اور نامور فضلا سے تحصیل کی۔ یہاں تک کہ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں اونچے درجے کو پہنچے اور اقران و معاصرین میں بڑی شہرت پائی۔ اصلاً گجرات کے رہنے والے تھے، لیکن سلطان ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں اپنے برادرِ کبیر میران بن اسد اللہ کے ساتھ بیجاپور منتقل ہو گئے تھے، اس لیے بیجاپوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ والیِ بیجاپور سلطان ابراہیم عادل شاہ نے ان کی بڑی تکریم کی اور منصبِ قضا پر متعین کیا۔ بیجاپور میں ایک عظیم الشان مدرسہ قائم فرمایا جس سے علما و طلبا کی کثیر تعداد مستفید ہوئی۔ ان کے مشہور تلامذہ میں شیخ ابوتراب بیجاپوری (متوفی ۱۰۸۶ھ)، سید محمد، قاضی برہان الدین، قاضی ابراہیم زبیری، ابراہیم بن عبد المجید بیجاپوری وغیرہ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ چوں کہ ان سے اس عہد کے کثیر اصحابِ علم اور نامور حضرات نے علم حاصل کیا تھا، لہٰذا "استاذ الاولیا" کے لقب سے ملقب ہوئے۔

اس جلیل القدر ہندی عالم و فقیہ نے ۵ ذی القعدہ ۱۰۷۰ھ کو بیجاپور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔[۲۸۳]

---

[۲۸۳] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۶ ـــــ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۸۰، ۲۸۱

۷۰۔ قاضی علی اکبر الہ آبادی

قاضی علی اکبر الہ آبادی گیارھویں صدی ہجری کے نامور ہندوستانی شیخ اور معروف عالم و فقیہ تھے۔ فقہ اور اصولِ فقہ کے ماہر علما میں سے تھے، مروّجہ علومِ عربیہ کے رموز و نکات سے کامل آگاہی رکھتے تھے۔ شاہ جہان کے وزیر اور معتمدِ خاص علامی سعد اللہ خاں کے ندیم و جلیس تھے۔ سعد اللہ خاں ان کی جامعیتِ علم و ادراک سے بہت متاثر تھا۔ اس کا فرزندِ اکبر لطف اللہ خاں طویل عرصے تک ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل رہا۔ باپ کی طرح فضل و کمال اور شجاعت و بسالت کا مرقع تھا۔ علوم و معارف کے مختلف گوشوں میں عبور رکھتا تھا۔ علامی سعد اللہ خاں کے بعد اسے شاہ جہان نے اپنی تربیت میں لے لیا تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر نے زمامِ سلطنت ہاتھ میں لی تو درجہ بدرجہ اس کو بہت ترقی دی۔ عالم گیر کا یہ معتمد علیہ امیر تھا۔ ۱۱۱۴ھ کو فوت ہوا۔ لطف اللہ خاں نے قاضی علی اکبر الہ آبادی سے بڑا فیض حاصل کیا اور ان کے حسنِ تربیت سے اکثر علوم میں مہارت پیدا کی۔

علامی سعد اللہ خاں سے تعلق کی بنا پر قاضی علی اکبر الہ آبادی کو سعد اللہ خانی کہا جاتا تھا، اور وہ "سید قاضی علی اکبر الہ آبادی سعد اللہ خانی" کے نام سے موسوم تھے۔

قاضی علی اکبر کی وسعتِ معلومات کی شہرت سلطان اورنگ زیب عالم گیر تک پہنچی تو اس نے ان کو اپنے بیٹے محمد اعظم کا اتالیق مقرر کر دیا۔ پھر جب اس پر ان کی قابلیت کے مزید جوہر کھلے اور ان کی دقّتِ نظر، استحضارِ علوم اور ورع و اتقا کا علم ہوا تو لاہور کے محکمۂ قضا پر مامور فرمایا۔ وہ پوری زندگی اسی عہدۂ رفیعہ پر فائز رہے۔ قضا کے منصبِ جلیلہ میں بڑے اونچے کردار کے حامل تھے۔ اس عظیم ذمہ داری کو نبھانے میں ہمیشہ عظمت کا ثبوت دیا۔ ان کی نگاہِ احتساب بڑی تیز تھی، لوگوں پر کڑی نگرانی رکھتے، حدود و تعزیرات کے اجرا میں صاحبِ عزیمت اور مستقل مزاج تھے۔

اس باب میں ان کے عزم و استقلال کی بنا پر بعض امرائے سلطنت ان سے

ناراض رہتے لیکن بادشاہ عالم گیر کی ہیبت اور دبدبے کی وجہ سے کسی کو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور ہاتھ بڑھانے کی جرات نہ تھی۔ اسی اثنا میں امیر قوام الدین اصفہانی کو لاہور کا والی مقرر کیا گیا۔ نظام الدین اس شہر کا کوتوال تھا۔ قوام الدین اصفہانی نے کوتوالِ شہر نظام الدین کو اشارہ کیا کہ قاضی علی اکبر پر قابو پایا جائے۔ چنانچہ کوتوال نے اپنے خاص آدمیوں کی طاقت سے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا اور قاضی علی اکبر اور ان کے بھانجے سید فاضل کو قتل کر دیا۔ جب ان کے قتل کے حادثۂ محزنہ کی اطلاع بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کو ہوئی تو اس نے قوام الدین اور نظام الدین کوتوال کو ان کے مناصب سے الگ کر دیا۔ بعد ازاں کوتوال کو قاضی علی اکبر کے ورثا کے حوالے کر دیا گیا، انھوں نے اسے قصاص کے طور پر قتل کر دیا۔ پھر بادشاہ نے قاضی شیخ الاسلام فتنی کو حکم دیا کہ امیر قوام الدین کے مقدمے کا شریعت کے مطابق فیصلہ کیا جائے، لیکن قاضی علی اکبر کے ورثا نے ان کو معاف کر دیا۔

ماثرِ عالم گیری میں بھی اس حادثے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

"دار السلطنت لاہور کے واقعہ نگار نے اطلاع دی کہ قاضی شہر سید علی اکبر، اپنی دیانت اور طبیعت کی سختی کی وجہ سے کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا تھا۔ قاضی مذکور کے بھانجے سید فاضل کا طرزِ عمل اس کے بر عکس تھا، وہ اپنی کم عقلی کی وجہ سے دست دراز اور بد زبان تھا۔ لاہور کے حکام یعنی ناظم اور کوتوالِ شہر اس کے ہاتھ اور زبان سے تنگ آ گئے تھے، انھوں نے مجبور ہو کر اس کی جان لینے کی ٹھانی۔ قاضی علی اکبر نے بھی اس فتنہ و آشوب میں امیر قوام الدین ناظم لاہور کے ہاتھوں بے حد ذلت اور رسوائی کے ساتھ جان دی۔

"ناظمِ لاہور قوام الدین اور کوتوال نظام الدین دونوں شاہی خدمت و خطاب سے برطرف کیے گئے۔ نظام الدین کوتوال تو لاہور ہی میں ختم ہوا، اور قوام الدین کو حضور شاہی میں طلب کیا گیا۔ قوام الدین کے بجائے شہزادہ محمد اعظم پنجاب کے ناظم مقرر ہوئے اور طرۂ مرصع کے عطیے سے سرفراز فرمائے گئے۔ لطف اللہ خاں کو

صوبے کی نیابت عطا ہوئی اور اس امیر کے تغیر سے ابو نصر خاں کو خدمت عرضِ مکرر پر متعین فرمایا گیا۔

"قوام الدین اجمیر میں آستانۂ والا پر حاضر ہوا، محکمۂ شرعیہ میں اس کے خلاف مقدمہ دائر ہوا، اور روزانہ عدالت میں ذلیل و خوار ہونے لگا۔ بالآخر سید علی اکبر مرحوم کے بیٹے نے، اعزۂ دربار کی سفارش سے مطالبۂ قصاص کا دعویٰ واپس لے لیا۔ قوام الدین کو خود ہی اپنی حالت پر رحم آیا اور اس نے جلد ہی دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔"

قاضی علی اکبر مصنف بھی تھے، مختلف علوم و فنون پر ان کی گہری نظر تھی۔ فارسی زبان کی مشہور درسی کتاب "فصولِ اکبری" اور عربی زبان میں "اصول اکبری" اور اس کی شرح، ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں علمِ صرف کی ہیں۔

قاضی سید علی اکبر کو اس عہد کے علمائے ہند کی اس بلند مرتبت جماعت میں شمولیت کا فخر حاصل تھا، جن کو عالم گیر نے فتاویٰ ہندیہ (فتاویٰ عالم گیری) کی تدوین و ترتیب پر متعین کیا تھا۔

برصغیر کے یہ عالم و فقیہ ۱۰۹۰ھ میں قتل کیے گئے[۲۸۱]

۱۷- شیخ علی پانی پتی

شیخ علی بن محمود بن عبدالصمد انصاری پانی پتی، عبدالقادر کے عرف سے معروف تھے۔ عالم و فقیہ اور زاہد و متقی تھے۔ فضل و صلاح کے اوصاف سے متصف تھے۔ اپنے چچازاد بھائی شیخ عبدالملک بن عبدالغفور پانی پتی اور شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی

---

[۲۸۱] مآثر الامرا۔ ج ۳، ص ۹۹ تا ۱۰۱ — مآثر عالم گیری، ص ۱۷۱، ۱۷۲ — مفتاح التواریخ، ص ۲۸۱ — فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۱۲۸، ۱۲۹ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۸۱، ۲۸۲ — بزمِ تیموریہ، ص ۲۵۰ — "معارف" اعظم گڑھ (بابت ماہ جنوری ۱۹۴۷ء)، ص ۵۴، ۵۵ — تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۷۱ — برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ، ص ۳۰۰ تا ۳۰۲ — تذکرہ مصنفین درسِ نظامی، ص ۱۵۵

سے اخذِ علم کیا۔ پھر کسبِ فیض کے لیے مختلف بلاد و امصار کے سفر پر روانہ ہوئے۔ للّٰہیّت و تدیّن اندازہ کیجیے کہ تین مرتبہ ارضِ حجاز اور بیت المقدس کا عزم فرمایا۔ برِصغیر کے شہرہ آفاق عالم و فقیہ شیخ علی بن حسام الدین متقی سے بھی فیض حاصل کیا۔ مختلف مقامات میں گھومے پھرے اور بہت سی عبادت گاہوں کی سیر کی، لیکن کسی کو تکلیف نہیں دی، نہ کسی سے روپیہ پیسہ لیا، نہ کپڑے کا سوال کیا، نہ کھانا کھایا اور نہ قیام و سکونت کی درخواست کی۔ مدت تک شہر اجین میں مقیم رہے۔ اجین سے سارنگ پور کا قصد فرمایا، وہاں ان کے عمِ محترم قاضی کے عہدے پر مامور تھے، ان کی وفات کے بعد یہ منصبِ بلند ان کے سپرد ہو گیا تھا لیکن طبیعت کسی جگہ جم کر بیٹھنے پر آمادہ نہ ہوتی تھی، چلنے پھرنے اور آزادی سے رہنے کی عادت پڑ گئی تھی، لہٰذا یہ منصب ان کی طبعِ خاطر کے مطابق نہ تھا، کئی مرتبہ اس سے دست کش ہوئے، اور جب جی چاہتا ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہو جاتے، اور ایک شہر سے دوسرے شہر کو مسکن ٹھہرا لیتے۔ جہاں جاتے لوگ عقیدت سے پیش آتے اور وہاں سے جانے نہ دیتے۔

بہترین واعظ اور مذکِّر تھے، آواز میں بے پناہ اثر تھا۔ فصاحت و بلاغت کے اونچے درجے پر فائز تھے۔ جو بات زبان سے نکلتی لوگوں کے دلوں میں اترتی چلی جاتی اور وہ بے حد متاثر ہوتے، اللہ کے سوا کسی سے سوال نہ کرتے، عربی اور فارسی کے اس انداز سے اشعار پڑھتے اور ان کی توضیح کرتے کہ لوگ وجد میں آ جاتے۔

قرآنِ مجید کے بہت بڑے مفسر تھے۔ اس کے مشکل مقامات اور ناسخ و منسوخ وغیرہ کی نہایت عمدگی سے وضاحت فرماتے۔ پھر شانِ نزول، قرآن کی عبارات و استعارات، اعجاز و ایجاز، تخصیصِ اعراب، مجملات، مقاماتِ تذکیر و موعظت، واقعات و قصص، فضائل، اس کے اجمال و تفصیل، متشابہات و محکمات، حروفِ مقطعات اور وحی وغیرہ، اہم مسائل پر اس اسلوب سے گفتگو فرماتے کہ سامعین عش عش کر اٹھتے۔ اندازِ بیان درد میں ڈوبا ہوا، جو بات زبان سے ادا ہوتی

وہ دل کی گہرائی سے نکلتی، اس سے اثر کا دائرہ اور بھی بڑھ جاتا۔

ہفت روزہ سلسلہ موعظت و تذکیر جاری تھا، جو جمعہ کے روز سارنگ پور کی جامع مسجد میں منعقد ہوتا — پورا وعظ خاص ترتیب کے ساتھ قرآن مجید سے کہتے۔ وفات کے دن سورۂ مزمل کی تفسیر بیان کی۔ بدن میں لرزا پیدا ہوا، کچھ وصیت فرمائی اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ یہ حادثہ ۱۰۱۱ھ کو پیش آیا[۲۸۵]

۷۲۔ خواجہ علی ہنو کشمیری

خواجہ علی کشمیری، کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ جلیل القدر کشمیری عالم شیخ یعقوب صرفی اور شیخ شمس الدین کشمیری کے شاگرد تھے۔ شیخ حمزہ کی صحبت میں بھی رہے اور ان سے استفاضہ کیا۔ ان بزرگوں سے کسبِ فیض اور اخذِ علم کے بعد حرمین شریفین گئے، حج و زیارت کا شرف حاصل کیا اور شیخ شہاب الدین احمد ابن حجر ہیثمی مکی سے علمِ حدیث کی تحصیل کی۔ پھر کشمیر واپس آکر درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا۔ خلقِ کثیر ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوئی۔

خواجہ زین الدین علی کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے اہلِ علم اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے ارضِ کشمیر کے نامور فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا — عہدِ جہاں گیری کے عالم تھے — اپنے مسکن کے متصل محلہ رانیواری میں دفن ہوئے[۲۸۶]

۷۳۔ سید عمر حضرمی

سید عمر کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عمر بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عمر بن محمد بن احمد

---

[۲۸۵] اذکارِ ابرار (ترجمہ گلزارِ ابرار)، ص ۲۶۲، ۴۶۲ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۸۴

[۲۸۶] حدائق الحنفیہ۔ ص ۴۲۶ — تاریخ کشمیر اعظمی۔ ص ۱۳۴، ۱۳۵ — تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۷۲ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۸۷

بن ابو بکر باشیبان حضرمی، شافعی المسلک فقیہ اور استاذ تھے۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اسی ملک کے علما و فضلا سے تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد تریم گئے، وہاں جید علمائے کرام کی مسند آراستہ تھی اور تشنگانِ علوم کی ایک جماعت حصولِ علم میں مشغول تھی، سید عمر حضرمی بھی اس میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ شیخ عبداللہ بن شیخ اور ان کے فرزند شیخ زین العابدین سے اخذِ علم کیا، قاضی عبدالرحمٰن بن شہاب الدین سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، شیخ ابو بکر بن شہاب الدین اور ان کے دونوں اصحابِ علم بھائیوں (شیخ احمد بن شہاب الدین اور شیخ محمد ہادی) کے دروازے پر دیگر علومِ دینیہ کے لیے دستک دی۔ پھر بھی تشنگیٔ علوم و معارف پوری نہ ہوئی تو حجازِ مقدس کا رخ کیا۔ عرصہ تک مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اقامت گزین رہے، اور اس اثنا میں ان دیارِ پاک کے علمائے عظام کی ایک جماعت سے فیض یاب ہوئے، جن میں سید عمر بن عبدالرحیم بصری، شیخ احمد بن ابراہیم علان، شیخ عبدالرحمٰن خطیب اور دیگر فضلائے کرام کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اکثر مشائخ کی طرف سے خرقۂ خلافت بھی عطا ہوا، اور بیشتر نے بیعت و تصوف کی اجازت مرحمت فرمائی۔

حجازِ مقدس سے پھر عازمِ تریم ہوئے، شادی کی اور سلسلۂ تدریس کا آغاز فرمایا۔ تریم میں کچھ عرصہ قیام اور درس و افادہ کے بعد دیارِ ہند کی راہ لی۔ اس زمانے میں سورت کی بندرگاہ بڑی مشہور تھی، وہاں مقیم ہوئے اور سید محمد بن عبداللہ العیدروس کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو بایں علم و فضل وہیں جا کر استفادہ کیا اور عام طریقۂ تعلیم کے مطابق باقاعدہ ان کے حلقۂ تلامذہ میں شمولیت کی، بہت سے علوم میں استفادہ کیا۔ ملک عنبر نے بھی جو ایک حبشی نژاد امیر اور وزیر تھا، حاضرِ خدمت ہو کر ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعد ازاں ملک عنبر برسرِ اقتدار آیا تو سید عمر حضرمی ان کے پاس آ گئے اور اس کی وفات تک مصروفِ درس و افادہ رہے۔

ملک عنبر کی وفات کے بعد سلطان عادل شاہ کے ہاں بیجاپور چلے گئے، عادل شاہ نے ان کی بڑی تکریم کی اور اعزاز و انعام سے سرفراز کیا۔ کئی سال بیجاپور میں مقیم رہے۔

پھر بلکام شہر میں توطن اختیار کر لیا اور لوگوں کی علمی نفع رسانی میں مصروف ہو گئے۔ طلبا کی بڑی جماعت نے استفادہ کیا۔ طلبا کی خود کفالت کرتے، انھیں کتابیں مہیا کرتے، کھلے دل کے ساتھ مال و زر عطا کرتے، قیام و طعام کا انتظام فرماتے، پہننے کے لیے کپڑے عنایت کرتے، غرض ان کے تمام مصارف کے خود ذمہ دار تھے۔

سید عمر حضرمی کا چشمۂ فیض طویل عرصے تک جاری رہا، جس سے علما و طلبا کے جم غفیر نے فیض حاصل کیا۔ بڑے اونچے شخص تھے، حسنِ اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے، رعب اور شہامت و جلال کے مالک تھے۔ بیجاپور کی سکونت ترک کرنے کے بعد تا دمِ زندگی بلکام شہر میں اقامت اختیار کیے رکھی۔ ۱۰۶۶ھ میں وفات پائی[۲۸۷]۔

۷۴۔ قاضی عمر اکبر آبادی

قاضی عمر بن حامد اکبر آبادی، شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ قاضی ناصر الدین عمر کے نام معروف تھے۔ مولانا ابو حامد ہارونی اور مفتی ابو الفتح تھانیسری وغیرہ اساتذہ سے تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا۔ فقہ و اصول کے متبحر علما میں سے تھے۔ ابتدا میں سماعِ غنا کے مخالف تھے اور اس سے منع کرتے تھے، لیکن بعد میں سماع کے قائل ہو گئے تھے اور خود سماع کرنے لگے تھے۔۔۔ ۱۰۰۲ھ کو فوت ہوئے[۲۸۸]۔

۷۵۔ قاضی عنایت اللہ بلگرامی

قاضی عنایت اللہ صدیقی بلگرامی، بلگرام کے مشہور اور نامور عالم قاضی اللہ داد صدیقی کے فرزند تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ گھر میں علم کی نہر جاری تھی اور بہت بڑے عالم باپ کے بیٹے تھے۔ ابتدا سے انتہا تک تمام کتبِ درسیہ

۲۸۷؎ خلاصۃ الاثر۔ ج ۲، ص ۲۱۴، ۲۱۵۔

۲۸۸؎ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۸۹، ۲۹۰ بحوالہ اخبار الاصفیا

والد ماجد سے پڑھیں۔ فضیلتِ علمی سے بہرہ ور ہوئے اور تحقیق و کاوش کے اعلیٰ مرتبے کو پہنچے۔ یہاں تک کہ بلدۂ بلگرام کی مسندِ افتا کو زینت بخشی اور اس منصبِ علیا کے تمام لوازم بہ وجہِ احسن انجام دیے۔ سید طیّب بن عبدالواحد بلگرامی سے صدق دلانہ مودت رکھتے تھے، سید طیب دہلی گئے تو قاضی عنایت اللہ کی درخواست کے موجب شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملے اور قاضی ممدوح کے لیے شیخ محدث سے شرفِ اجازہ اور سلسلے کے بزرگانِ کرام کا شجرہ حاصل کیا۔[۲۸۹]

قاضی عنایت اللہ بلگرامی گیارھویں صدی ہجری کے عالم د فقیہ تھے، لیکن ان کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۷۶۔ مولانا عوض وجیہ سمرقندی

مولانا عوض وجیہ حنفی سمرقندی، مضافاتِ سمرقند کے ایک قریہ میں پیدا ہوئے، جس کا نام ''اخسیکت'' ہے۔ اسی مقام پر نشو ونما پائی۔ میر عوض تاشقندی سے علم حاصل کیا اور فقہ کی تعلیم سے بہرہ مند ہوئے۔ خاصہ عرصہ ان کی صحبت و ملازمت اختیار کیے رکھی۔ اپنے دَور کے شیخ، عالم کبیر اور فقیہ نام دار تھے۔ صاف ذہن، بلند فطرت، فہیم و فطین، روشن ضمیر، قوی الحفظ، عالی فکر اور اونچے دل و دماغ کے عالم دین تھے۔ معقول و منقول میں اپنے تمام اقران و معاصرین سے فائق تر تھے۔ طویل مدت تک بلخ میں درس و افادہ کی مسند پر فائز رہے اور بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔ شاہ جہان بادشاہ نے اپنے بیسویں سالِ جلوس (۱۰۵۶ھ) کے اواخر میں بلخ فتح کیا تو مولانا عوض وجیہ سے ملاقات ہوئی۔ اس بادشاہِ دین پناہ کے نیک افکار و خیالات اور جذبہ دین داری سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ بادشاہ پر بھی ان کی ذکاوت و فطانت اور دقتِ نظر کا بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ وہ ہندوستان تشریف لے آئے، بادشاہ نیک اطوار نے ان کو مفتی لشکر

۲۸۹؎ مآثر الکرام۔ ص ۲۱۹ —— نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۹۰

کے منصبِ اعلیٰ پر مامور کیا۔

شاہ جہان کی معزولی کے بعد اس کا بیٹا اورنگ زیب عالم گیر سریر آرائے سلطنتِ ہند ہوا تو اس نے بھی ان کی نہایت تکریم کی، ان کے مرتبۂ علم و فضل کا عملاً اعتراف کیا اور ۱۰۶۹ھ میں محتسب کا عہدہ پیش کیا۔ دولتِ تیموری میں مولانا عوض وجیہ پہلے آدمی تھے، جنھیں احتساب کا محکمہ سپرد کیا گیا۔ ان کا کام اس بات کی نگرانی کرنا تھا کہ کوئی فواحش کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہے؟ کسی نے حدودِ شریعت سے قدم باہر تو نہیں نکال لیے ہیں اور منہیات کی وادی میں داخل نہیں ہو گیا ہے؟ حلال اور حرام امور میں امتیاز کی شرعی پابندیوں کو نظر انداز تو نہیں کر دیا گیا ہے؟ کہیں مسکرات کا استعمال تو نہیں ہو رہا ہے؟ ان امور پر وہ کڑی نگاہ رکھتے تھے اور جو لوگ حدودِ شرعی سے تجاوز کرتے، انھیں باقاعدہ سزا دی جاتی تھی۔

مولانا عوض وجیہ کی شخصیت اور خدمت کی بنا پر انھیں خلعتِ خاص عطا کیا جاتا اور پندرہ ہزار روپے سالانہ دیے جاتے۔ بعد ازاں اس کے عوض میں یکہزاری منصب اور یک صد گھڑ سوار کا منصب عطا ہوا۔

مولانا ممدوح جلیل القدر عالم اور بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے نزدیک بڑے معتمد علیہ تھے۔ ۱۰۷۵ھ تک اس منصب پر فائز رہے۔ اس اثنا میں ان سے کسی ایسی خطا کا ارتکاب ہو گیا کہ بادشاہ نے انھیں معزول کر دیا، ان کی جگہ خواجہ قادر کو یہ منصب تفویض ہوا۔ منصبِ احتساب سے معزولی کے بعد وہ اپنے گھر میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گئے اور درس و افادہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ۱۰۷۶ھ میں بادشاہ ان سے پھر خوش ہو گیا اور لغزش معاف کر دی۔ پہلا منصب بھی بحال کر دیا اور اپنے بیٹے محمد اعظم کا اتالیق بھی مقرر کیا۔ پھر زندگی بھر اس سے لوگ نفع اندوز ہوتے رہے۔

بلاشبہ مولانا عوض وجیہ متقی اور پرہیز گار تھے، احکامِ شرع کے پابند تھے، عوام کو اتباعِ سنت کی راہِ مستقیم پر چلانے اور قائم رکھنے اور بدعات کا خاتمہ کرنے میں ہر آن ساعی رہتے۔ اس میں قطعی مبالغہ نہیں کہ مولانا موصوف جیسا متبع سنت

محتسب کوئی دوسرا نہیں ہوا۔ ان کے فضل و کمال کا اس دور کے تمام تذکرہ نگار واضح الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں۔

دورِ مغلیہ کے اس عالم و فقیہ نے ۱۰۸۷ھ میں وفات پائی۔[۲۹۰]

۷۷۔ شیخ عیسیٰ سندھی

شیخ عیسیٰ سندھی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عیسیٰ بن قاسم بن یوسف بن رکن الدین بن معروف بن شہاب الدین المعروف الشہابی الجندی السندی الہندی البراری العشقی الشطاری القادری۔ لقب عین العرفا اور کنیت ابوالبرکات تھی۔ شیخ عیسیٰ کو مسیح الاولیا کے لقب سے بھی ملقب کیا جاتا ہے اور شیخ عیسیٰ جند اللہ بھی کہا جاتا ہے۔

شیخ عیسیٰ کے آبا و اجداد اصلاً علاقہ سندھ کے قصبہ پاتری کے رہنے والے تھے۔ یہ قصبہ خود انہی کے بزرگوں نے آباد کیا تھا۔ اس خاندان کے بزرگ اپنے علاقے میں عزت و تکریم کے حامل تھے اور ان کا شمار اس عہد کے متبحر علمائے دین، یگانۂ روزگار مفسرین، نامور محدثین اور مشہور اولیائے کرام میں ہوتا تھا۔ مغل حکمران نصیر الدین ہمایوں کی لشکر کشی سے جب ملکِ سندھ میں افراتفری پھیلی اور شورش و بدامنی کا دور دورا ہوا تو شیخ عیسیٰ کے والد شیخ قاسم اور ان کے چچا شیخ طاہر محدث اپنے متعلقین و مریدین اور اعزہ و اقربا کے ساتھ ۹۵۰ھ کو وطنِ مالوف (پاتری سندھ) سے ہجرت کر گئے۔ یہ لوگ پہلے احمد آباد (گجرات) گئے، پھر وہاں سے ایلچ پور (برار) پہنچے۔ اس سفر میں ان کو سخت تکلیف دِہ حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ شیخ عیسیٰ کے چچا شیخ طاہر اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور محدث تھے۔ زہد و تقویٰ کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ ان کے علم و فضل اور

---

[۲۹۰] عملِ صالح (الموسوم بہ شاہ جہان نامہ) ج ۳، ص ۳۰۱ ــــ عالم گیر نامہ، ص ۳۹۲ــــ مآثرِ عالم گیری، ص ۷۳، ۱۷۴۔

تدین و اتقا کی شہرت تغال خاں تک پہنچی جو ان دنوں ملکِ برار کے نظم و نسق کا مالک تھا۔ اس نے بے حد اصرار اور نیازمندی سے شیخ طاہر محدث سے برار تشریف لانے کی استدعا کی۔ جب یہ خاندان تغال خاں کی التجا پر ایلچ پور پہنچا تو اس علم دوست حاکم نے ان کی شان کے شایان ان کا خیر مقدم کیا اور نہایت عزت و توقیر سے پیش آیا۔ اس نے شیخ طاہر کو وہاں کے دارالعلوم کی مسند پیش کی، نقد روپے کے علاوہ زرخیز اراضی کا ایک گاؤں بھی بطور جاگیر نذر کیا۔ شیخ طاہر نے گاؤں اور گھریلو معاملات کی ذمہ داری اپنے چھوٹے بھائی شیخ قاسم (شیخ عیسیٰ کے والد) کے سپرد کی اور خود درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔

کچھ عرصہ بعد ۵ ذی الحجہ ۹۶۲ھ شب یک شنبہ کو شیخ قاسم کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ اس روز شیخ قاسم گھر پر موجود نہ تھے، سفر پر تھے، ان کے چھوٹے بھائی شیخ طاہر محدث نے نومولود کا نام عیسیٰ رکھا۔ عیسیٰ نام رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ شیخ طاہر کے چچا کا نام عیسیٰ تھا، جو اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور نامور بزرگ تھے۔ اس نام کی معنوی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس نومولود عیسیٰ کو بھی علم و فضل اور ورع و تقویٰ کی دولت سے نوازا۔

شیخ قاسم سفر سے واپس آئے تو انھیں بیٹے کی ولادت کی خوش خبری سنائی گئی اور بتایا گیا کہ نومولود کا نام عیسیٰ رکھا ہے۔ شیخ قاسم بیٹے کا نام سلیمان رکھنا چاہتے تھے اس لیے کہ جب ان کی بیوی حاملہ تھیں تو بعض پرہیزگار اور نیک لوگوں نے یہ خواب دیکھا تھا کہ شیخ قاسم کے گھر حضرت سلیمان علیہ السلام تشریف لائے ہیں، لیکن انھوں نے بڑے بھائی (شیخ طاہر) کے احترام میں بیٹے کا نام نہیں بدلا۔

شیخ عیسیٰ سندھی نے مذہبی ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور علم و فضل کی گود میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ نو سال کی عمر میں قرآنِ مجید حفظ کر لیا اور علوم متداولہ کے حصول کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی۔ گھر میں علم کی نہر جاری تھی اور ان کے عمِ محترم شیخ طاہر کی مسندِ درس آراستہ تھی۔ شیخ عیسیٰ نے ملا اسماعیل سے قرآنِ مجید پڑھا جن کا اس دور میں تعلیمِ قرآن میں کوئی ثانی نہ تھا۔ شیخ طاہر محدث سے حدیث و فقہ کی تکمیل کی، شیخ

مبارک سندھی سے اصولِ فقہ اور علمِ کلام کی تحصیل فرمائی۔ شیخ عثمان بوبکانی سے علومِ عقلی و نقلی حاصل کیے، شیخ فتح اللہ شیرازی سے علوم ریاضی اور عروض سیکھے، شیخ ابراہیم قاری سے جو مرغِ لاہوتی کے لقب سے ملقب تھے، تجوید و قرأت میں جبرائیلی لہجے کی تعلیم حاصل کی۔ غرض اس عہد کے اجلّا و فضلا اور مشہور اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے تمام علوم مروّجہ اخذ کیے اور درجۂ کمال کو پہنچے۔ تصوّف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا، اس سلسلے میں شیخ لشکر محمد عارف کی خدمت میں پہنچے، ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور طریقت کے غوامض و نکات کی عقدہ کشائی کی۔ عمر بھر ریاضت و مجاہدہ، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعے لوگوں کو فیض پہنچاتے رہے۔

شیخ عیسٰی سندھی متوکل علی اللہ عالم تھے اور دنیوی آسائش و نعمت پر فقر و فاقہ کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ اس ضمن کے بہت سے واقعات میں سے دو واقعے قابلِ ذکر ہیں، جو ذیل میں درج کیے ہیں :

۱۔ عنفوانِ شباب میں جب شیخ عیسٰی مرشدِ طریقت کی تلاش میں اکبر آباد (آگرہ) تشریف لے جا رہے تھے تو اثنائے سفر میں اجین (مالوہ) میں قیام پذیر ہوئے اور شیخ عبدالکریم بن شیخ عیسٰی کی خانقاہ میں بطور مہمان ٹھہرے۔ اتفاق سے ان دنوں حاکم مالوہ مع امرا و وزرا کے وہاں فروکش تھا۔ اجین کے مشائخ نے اس خیال سے شیخ عیسٰی کی ملاقات حاکمِ مالوہ سے کرانا چاہی کہ انھیں کچھ مالی فوائد حاصل ہو جائیں، لیکن شیخ نے یہ گوارا نہ کیا کہ علم و تقوٰی کی نعمتِ بے بہا کو ایک دنیا دار فرماں روا کے حضور پیش کریں اور اس سے مادی منفعت کے طالب ہوں۔ وہ دوسرے ہی دن اجین سے رخصت ہو گئے۔

۲۔ عبدالرحیم خان خاناں جو عالم و فاضل حاکم تھا اور علما کی انتہائی قدر کرتا تھا، ایک مرتبہ رات کو شیخ کی خانقاہ میں آیا۔ اس وقت خانقاہ میں علما و مشائخ کی مجلس گرم تھی، خانِ خاناں بھی اس میں شریک ہوا۔ یہ دلچسپ مجلس نصف رات تک جاری رہی۔ رخصت ہوتے وقت خان خاناں نے تین یا چار سو روپے شیخ کی نذر کیے۔ شیخ کی عادت تھی کہ روپیہ پیسہ کبھی اپنے پاس نہ رکھتے۔ نذرانے اور فتوحات وغیرہ کی رقم ایک معتمد خلیفہ شیخ محمد سندھی

کی تحویل میں رہتی تھی، وہ خانقاہ کے مستحق افراد کو مناسب حصے سے رقم تقسیم کرنے پر مامور تھے۔ یہ رقم جب شیخ کو ملی تو شیخ محمد سندھی وہاں موجود نہ تھے، دریافت کرنے پر پتا چلا کہ وہ گھر جاکر سو گئے ہیں۔ شیخ نے اسی وقت انھیں بلانے کا حکم دیا۔ وہ آئے تو پہلے اس بے وقت طلبی پر ان سے معذرت خواہ ہوئے۔ پھر رقم ان کے حوالے کی، تب اطمینان کا سانس لیا اور نیند آئی۔

شیخ علیسی سندھی انیس (۱۹) برس کے تھے کہ والد محترم (شیخ قاسم سندھی) نے ۵ محرم ۹۸۱ھ کو ایلچ پور میں وفات پائی۔ انھیں وہیں سپردِ خاک کیا گیا۔ اسی اثنا میں اس خاندان کے محسن اور برار کے حاکم تغال خاں کا انتقال ہوا۔ تغال خاں کے انتقال کے بعد علاقہ برار کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کا نظم و نسق ختم ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب کہ اس علاقے میں اس خاندان کو علم و فضل اور زہد و عرفان کے اعتبار سے بڑی شہرت حاصل تھی۔ اس کی فیض رسانیوں کا دائرہ دور تک پھیل چکا تھا اور علما و فضلا اور خواص و عوام میں یہ خانوادہ بحر العلوم کی حیثیت سے متعارف تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان کی ایک اور علاقائی سلطنت خاندیس تھی، جس کا دارالحکومت برہان پور تھا۔ اس سلطنت کے حکمران خدمتِ علم اور علما دوستی میں بہت مشہور تھے۔ جس زمانے کے حالات ہم پڑھ رہے ہیں، اس زمانے میں خاندیس کی زمامِ حکومت عادل شاہی خاندان کے ہاتھ میں تھی، جو نسلاً فاروقی خاندان تھا۔ عادل شاہی حکمران عرصے سے شیخ علیسی کو برہان پور تشریف لانے کی دعوت دے رہا تھا، سقوطِ برار کے بعد شیخ طاہر محدث اور شیخ علیسی اپنے سندھی اعزہ و متعلقین کے ساتھ برہان پور چلے گئے۔ بادشاہ نے ان کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور عزت و احترام سے ٹھہرایا۔ سندھ کے جو لوگ اس نواح میں آباد تھے، وہ بھی مختلف علاقوں اور قصبوں میں اُٹھ کر برہان پور منتقل ہو گئے اور ایک وسیع محلہ سندھی باشندوں سے آباد ہو گیا جو اُن کی وطنی نسبت کی بنا پر سندھی پورہ کہلایا۔

برہان پور کو اس عہد میں علم و علما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ مشہور عالم شیخ یوسف بنگالی کا سلسلۂ درس وہاں جاری تھا۔ شیخ طاہر محدث بھی علومِ دینیہ کی تدریس

میں مصروف ہوگئے۔ شیخ عیسیٰ سندھی جو کتبِ درسیہ سے فارغ ہو چکے تھے، بایں علم و فضل شیخ یوسف بنگالی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور جلد ہی فراغت حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ شیخ طاہر کے مشورے سے ۹۸۲ھ کو آگرہ روانہ ہوئے اور وہاں سے گوالیار کا قصد کیا۔ وہ ان دیار کے علماء و فضلا اور اصحابِ تصوف و طریقت سے بھی مستفیض ہوئے۔

غرض شیخ عیسیٰ سندھی نے اپنے عصر کے مختلف اربابِ علم و فن سے استفادے کے بعد برہان پور میں خود مسندِ تدریس بچھائی اور بے شمار تشنگانِ علوم نے ان کے چشمۂ فیض سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ ان کے تلامذہ اور فیض یافتہ حضرات کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ ان کے بیٹوں نے بھی ان سے کسبِ علم کیا۔

شیخ عیسیٰ سندھی بیک وقت مفسر بھی تھے اور محدث بھی، فقیہ بھی تھے اور اصولی بھی، مصنف بھی تھے اور صوفی بھی، صاحبِ طریقت بھی تھے اور بہت بڑے عالمِ دین بھی، کامیاب مدرس بھی تھے اور بہترین مفتی بھی۔ ان کی تگ و تازِ علمی کا سلسلہ ہمہ گیر تھا اور ان سب اصنافِ علم میں ان کو کامل درک حاصل تھا جو ان دنوں مروّج تھے۔

وہ بہت بڑے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں: روضۃ الحسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ، شرح اسماء اللہ الحسنیٰ میں ایک اور رسالہ عین المعانی کے نام سے لکھا۔ رسالہ حواسِ خمسہ، شیخ عبدالکریم الجیلی کی الانسان الکامل پر حاشیہ، قصیدۂ بردہ کی شرح فارسی زبان میں، تصوف کے انداز میں ایک کتاب قبلۃ المذاہب الاربعہ، عبدالرحمن جامی کی فوائد ضیائیہ یعنی علمِ نحو کی شہرۂ آفاق کتاب شرح جامی پر حاشیہ۔ ایک کتاب اپنے بیٹے عبدالستار کے لیے لکھی جس کو فتح محمدی کے نام سے موسوم کیا۔ ایک کتاب تفسیرِ قرآن کے بارے میں فتح محمد کے لیے لکھی۔ علمِ نحو کی مشہور کتاب مائۃ عامل کی شرح تحریر کی، جسے تمیم کے نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب انھوں نے ایک اہلِ علم سیا علی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ ایک رسالہ عقد الانامل کے بارے میں تالیف کیا۔ علاوہ ازیں شرح رباعتین اور ترجمہ اسرار الوحی تصنیف کیں۔ ایک اور کتاب انوار الاسرار فی حقائق القرآن و معارفہا

لکھی۔ یہ قرآنِ مجید کی تفسیر ہے جو ایک ضخیم اور مبسوط کتاب ہے۔ اس کا اسلوب زیادہ تر متصوفانہ ہے اور سلوک و معرفت کے طریق پر لکھی ہے۔ اس کے بعض مقامات کی وضاحت اسلاف کرام کی عام روش سے ہٹ کر کی گئی ہے مثلاً: اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم کی تفسیر بیان کرتے ہوئے، شیطان کو "اس بُعد" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ "جو بندے اور اللہ کے درمیان کسی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔" اس تفسیر میں اس قسم کی متعدد باتیں بیان کی گئی ہیں جو اسلاف کے نقطۂ نظر سے صحیح نہیں، اور کتاب و سنت سے جن کی تائید نہیں ہوتی۔

شیخ عیسیٰ سندھی نے ۱۴ شوال ۱۰۳۱ھ کو برہان پور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔[۲۹۱]

۷۸۔ مفتی عیسیٰ گوپاموی

مفتی عیسیٰ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عیسیٰ بن آدم بن محمد بن خواجہ بن شیخ بن محمد بن احمد صدیقی شہابی گوپاموی، شیخ نظام الدین اللہ دیا خیر آبادی کی نسل سے تھے۔ ۹۶۰ھ کو گوپامئو میں پیدا ہوئے اور اپنے والدِ مکرم شیخ آدم اور شیخ نظام الدین عثمانی امیٹھوی سے تحصیل کی، اور علما و فقہا میں گردانے گئے۔ ان کے والد (شیخ آدم) گوپامئو کی مسندِ افتا پر فائز تھے، والد کی وفات کے بعد یہ مسند ان کے بیٹے (مفتی عیسیٰ) کے حصے میں آئی۔ مفتی عیسیٰ کی شادی شیخ جعفر بن شیخ نظام الدین عثمانی امیٹھوی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی، جن کے بطن سے تین بیٹے متولد ہوتے۔ ان بیٹوں میں ایک مفتی وجیہ الدین تھے اور یہی سب سے عالم تھے۔ مفتی عیسیٰ گوپاموی نے ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۲۲ھ کو وفات پائی۔[۲۹۲]

۲۹۱ھ تفصیل کے لیے دیکھیے: اذکارِ ابرار۔ ص ۵۰۸ تا ۵۳۶ — برہان پور کے سندھی علما المعروف بہ تذکرہ اولیائے سندھ۔ ص ۱۰۱ تا ۱۰۳ — تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۵۳ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۹۵ تا ۲۹۹ — تاریخ برہان پور۔ ص ۱۳۶، ۱۳۷ — تذکرہ صوفیائے سندھ۔ ص ۱۵۶ تا ۱۶۴

۲۹۲ھ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۹۹

۷۹۔ قاضی عیسیٰ اکبرآبادی

قاضی عیسیٰ بن ابوالفتح بن عبدالغفور بن شرف الدین عمری تھانیسری اکبرآبادی، اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے والد مفتی ابوالفتح تھانیسری (متوفی ۸ جمادی الاولی ۹۷۶ھ) سے علم فقہ کی تحصیل کی اور اپنے عصر کے نامور علما و فقہا اور اصولیین میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ۱۰۱۸ھ کو جہاں گیر کے عہد میں منصبِ قضا پر متمکن ہوئے[۲۹۳]

---

[۲۹۳] نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۰۰ بحوالہ اخبار الاصفیا

غ

۸۰۔ سیّد غضنفر گجراتی

گیارھویں صدی ہجری کا ہندوستان علم و تحقیق کے لحاظ سے بڑا پُر ثروت تھا۔ اس صدی میں برّ صغیر کے مختلف علاقوں میں بے شمار علما و فقہا اور مفسرین و محدثین پیدا ہوئے، جنھوں نے بھرپور علمی خدمات انجام دیں۔ ان میں سرزمینِ گجرات کے ایک عالم سید غضنفر بن سید جعفر حسینی نہروالی گجراتی بھی تھے انھوں نے اپنے عہد کے عظیم المرتبت اساتذہ اور جلیل القدر علما سے اخذِ علم کیا تھا، جن میں شیخ عبدالرحمٰن جامی کے بھانجے شیخ محمد امین، شیخ محمد سعید بن مولانا خواجہ کوہی خراسانی اور شیخ تاج الدین عبدالرحمٰن بن مسعود بن شمس الدین گازرونی کے اسمائے گرامی لائق تذکرہ ہیں۔

سید غضنفر حسینی گجراتی، شیخ و علامہ، محدث اور جیّد عالم تھے۔ ان کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے مشہور علمائے حدیث و فقہ اور ماہرین علوم عربیہ ہوتا تھا۔

سیّد غضنفر حسینی نے حصولِ علم کے بعد خود مسندِ تدریس آراستہ کی اور ان سے بہت سے علما و طلبا نے استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ ابو المواہب احمد بن علی عباسی شناوی، مفتی حرم مکہ مکرمہ شیخ عبدالرحمٰن بن عیسیٰ عمری مرشدی اور شیخ امام عبدالقادر بن محمد بن یحییٰ حسینی طبری مکّی قابلِ ذکر ہیں۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔[۱]

۱؎ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۲۷۲ — نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۳۰۱

ف

۸۱- شیخ فاضل سنبھلی

شیخ فاضل بن امجد نقشبندی سنبھلی، عالم و فقیہ تھے اور فقہ و اصول کے ماہر علما میں سے تھے۔ طریقت و سلوک سے بھی تعلق رکھتے تھے، اس سلسلے میں شیخ تاج الدین عثمانی سنبھلی سے فیض یافتہ تھے۔ ایک مدت تک ان سے وابستہ رہے، یہاں تک کہ علم و معرفت میں ماہر کامل ہو گئے۔ حصولِ علم و طریقت کے بعد اپنے آپ کو درس و تدریس کے لیے وقف کر دیا تھا۔ علومِ دینیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کا اندازِ تدریس یہ تھا کہ علومِ ظاہری کے ساتھ ساتھ تلامذہ کو طریقت و صلاح سے بھی مستفید فرماتے تھے۔

اس صاحبِ تصوف عالم و فقیہ نے ۱۰۳۰ھ کے بعد سنبھل میں وفات پائی۔ [۱]

۸۲- شیخ فتح محمد برہان پوری

شیخ فتح محمد برہان پوری اپنے عصر کے محدث اور عالم و فقیہ تھے اور شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی کے لائق بیٹے تھے۔ کنیت ابو المجد تھی اور لقب عبد الرحمٰن تھا۔ عارف باللہ اور علومِ عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ مشائخ صوفیا اور علمائے مشہورین میں سے تھے۔ اس متبحر صوفی عالم نے اپنے والد سے اخذِ علم کیا اور انہی سے طریقت سیکھی۔ حصولِ علم اور اخذِ طریقت کے بعد درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ طویل عرصہ تک برہان پور میں ہنگامۂ درس برپا کیے رکھا۔ پھر سرزمینِ حجاز کا رُخ کیا اور سعادتِ حج سے بہرہ یاب ہوئے۔ بعد ازاں وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

متعدد کتب و رسائل کے مصنف تھے، جن میں ایک رسالہ مراتب العوالم الخمسہ

---

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۰۲، ۳۰۳ بحوالہ اسراریہ

کے بارے میں لکھا، ایک رسالہ وحدت الوجود سے متعلق تحریر کیا، شیخ علی بن شہاب الدین حسینی ہمدانی کے لیے ستر احادیث کی تخریج کی۔ ۱۰۶۰ھ میں مفتاح فتوح العقائد تصنیف کی۔ ۱۰۵۷ھ میں فتوح الاوراد لکھی، ایک کتاب عربی زبان میں فقہ کے متعلق تصنیف کی، جس کا نام فتح المذاہب الاربعہ رکھا۔ سلوک میں فتح الطریقہ معرضِ تصنیف لائے، ایک رسالہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی تحقیقِ نسب کے سلسلے میں تصنیف کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی رسائل تصنیف کیے۔

شیخ فتح محمد برہان پوری نے مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، فوت بھی اسی مقدس سرزمین میں ہوئے[۵۲]

۸۳- شیخ فرخ نارنولی

شیخ فرخ نارنولی، شیخ نظام الدین چشتی نارنولی کے پوتے تھے۔ نارنول میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے والد اور دادا سے اخذِ علم کیا، یہاں تک کہ ان کا شمار علما و فقہا کی جماعت میں ہونے لگا۔ والد اور دادا کے بعد مسندِ مشیخت پر متمکن ہوئے۔ نہایت بارعب اور بلند مرتبہ شیخ تھے۔ معارفِ الٰہیہ میں یگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ کثیر الوجد اور سماع تھے۔ ۱۰۳۶ھ کو نارنول میں فوت ہوئے[۵۳]

۸۴- میر سید فیروز بلگرامی

میر سید فیروز بن عبدالواحد بن ابراہیم بن قطب الدین حسینی واسطی بلگرامی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سید عبدالواحد بلگرامی سے علم حاصل کیا۔ سید عبدالواحد بھی اگرچہ صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے لیکن مہارتِ فنون اور کمالِ علم

---

۵۲ تاریخ برہان پور- ص ۱۳۷، ۱۳۸ ــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۶۰ ــــ نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۳۰۴

۵۳ نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۳۰۵ بحوالہ اسراریہ

میں سید فیروز، باپ سے بہت آگے تھے۔ فقہ اور دیگر علومِ مروّجہ میں جو درک بیٹے کو حاصل تھا، باپ کو حاصل نہ تھا۔ سید فیروز کے بڑے بھائی سیّد طیّب (متوفی ۵ ربیع الاول ۱۰۶۶ھ) تھے، والد کی وفات کے بعد مسندِ مشیخت سیّد طیّب نے سنبھالی اور سیّد فیروز درس وافادہ، خدمتِ خلق، فقرا و مساکین کی مدد اور بیواؤں کی اعانت میں مشغول ہو گئے۔ نہایت سخی تھے اور بذل و اعطا ان کا معمول تھا۔ جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ ایسی چار سو جوان لڑکیوں کی شادی کی اور اپنی گرہ سے مناسب جہیز عطا کیا جن کے والدین غربت کی وجہ سے اس کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ تقریباً سو برس کی عمر پائی اور ہمیشہ لوگوں کی خدمت کو اپنا معمول بنائے رکھا۔ ۵ محرم ۱۰۶۶ھ کو بلگرام میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔

لائق اور فاضل بھائی کی وفات سے میر سیّد طیّب نہایت مغموم ہوئے، لیکن ان کی تدفین کے بعد چہرے پر انتہائی خوشی اور شگفتگی کے آثار اُبھر آئے۔ لوگوں نے متعجب ہو کر اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

برادرِ من با من وعدہ کرد کہ غم مخور بعد از شصت روز بہ من ملحق می شوی۔

میرے بھائی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ غم نہ کرو، چھ دن کے بعد مجھ سے آملو گے۔

چنانچہ ٹھیک چھ دن بعد میر سیّد طیّب بھی اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو تشریف لے گئے[1]۔

---

[1] مآثر الکرام دفتر اول ص ۴۳، ۴۴ ــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۰۹۔

ق

۸۵- مولانا قاسم حسینی بیانوی

مولانا قاسم بن ابو القاسم حسینی بیانوی، شیخ، فاضل اور محدث تھے۔ حدیث، فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر کامل تھے۔ شیخ ابراہیم بن داؤد مانک پوری اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔ تمام عمر اپنے استاذِ مکرم (شیخ ابراہیم) سے وابستہ رہے۔ شیخ ابراہیم کی وفات کے بعد ان کی جگہ درس و افادہ کی مسند پر متمکن ہوئے[1]

۸۶- شیخ قطب الدین دہلوی

شیخ قطب الدین بن عبد العزیز بن حسن بن طاہر جون پوری دہلوی، قطب العلم کے لقب سے مشہور تھے۔ جائے ولادت دہلی ہے۔ تربیت کی منزلیں بھی وہیں طے کیں۔ اخذِ طریقت شیخ جاٹین سہنوی سے کیا، جو ان کے والد شیخ عبد العزیز کے شاگردوں میں سے تھے۔ بعد ازاں عازمِ مالوہ ہوئے اور شیخ منور بن عبد المجید لاہوری سے علم حاصل کیا۔ تکمیلِ علم کے بعد دہلی کو مراجعت کی اور طویل عرصے تک درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا، بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

شیخ قطب الدین دہلوی فاضلِ کبیر تھے، فقہ، اصول اور علومِ عربیہ کے ماہر تھے۔ مدتِ مدید تک تشنگانِ علوم کی علمی تشنگی بجھانے میں مصروف رہے — ۱۰۲۳ھ کو فوت ہوئے[2]

۸۷- مرزا قلیچ محمد اندجانی

مرزا قلیچ خاں، اصلاً اندجان کے باشندے تھے اور عہدِ اکبری کے ایک سربرآوردہ

---

[1] نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۳۱۰۔ بحوالہ اخبار الاصفیا

[2] ایضاً، ص ۳۱۱ بحوالہ اسراریہ

سردار تھے۔ اکبر کے بیٹے شہزادہ دانیال کی شادی مرزا قلیچ خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ قلیچ خاں امیر کبیر اور فاضل و علامہ تھے۔ خیر و صلاح کے اوصاف سے متصف اور فضل و کمال کی نعمت سے بہرہ ور تھے۔ شہنشاہِ ہند جلال الدین اکبر اس امیر کی خوبیوں سے واقف ہوا تو اس نے ان کو ۹۸۰ھ میں قلعہ سورت کا محافظ مقرر کر دیا۔ ۹۸۵ھ میں گجرات کے عہدۂ امارت پر مامور کیا۔ ۹۸۷ھ میں وزارت کا منصبِ جلیلہ عطا کیا۔ ۹۹۰ھ میں علاقہ مالوہ کی امارت سے سرفراز کیا۔ ۹۹۷ھ میں سنبھل کے نواح میں جاگیر عنایت کی اور لاہور میں اقامت گزیں ہونے کا حکم دیا اور فرمان جاری کیا کہ راجہ ٹوڈرمل وزیرِ خراج اور راجہ بھگونت داس کے ساتھ مل کر اس نواح کے اہم امور انجام دیے جائیں۔ پھر راجہ ٹوڈر کی وفات کے بعد مرزا قلیچ محمد کو وزارتِ خراج پر مامور کیا اور ۱۰۰۲ھ میں کابل کا والی مقرر کیا۔ لیکن تھوڑی مدت بعد اس عہدے سے معزول کر دیا۔ ۱۰۰۵ھ میں اکبر نے انھیں اپنے بیٹے دانیال کا اتالیق بنا دیا۔ مگر دانیال چوں کہ ان کا داماد تھا، اس لیے اس منصب سے جلد ہی الگ ہو گئے اور بادشاہ کی خدمت میں آ گئے۔ ۱۰۰۷ھ میں بادشاہ نے ان کو اکبر آباد (آگرہ) کا منصبِ حفاظت عطا کیا۔ ۱۰۰۹ھ کو پنجاب کی ولایت کے عہدے پر مامور کیا، اس کے ساتھ ہی کابل کی ولایت بھی عطا کی۔

اکبر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جہاں گیر سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے مرزا قلیچ خاں کو گجرات کے منصبِ تولیت سے نوازا، پھر ۱۰۱۶ھ کو پنجاب کا والی مقرر کیا اور ۱۰۱۸ھ میں کابل کی ولایت عطا کی۔ غرض قلیچ خاں تک کے مختلف علاقوں کی صوبے داری پر متعین رہے اور اکبر کے آخری ایام میں کئی سال تک پنجاب کے عہدۂ گورنری پر فائز رہے۔ بڑے بہادر، جرأت مند، متدین اور عالم دین امیر مملکت تھے۔ لاہور کی گورنری کے زمانے میں روزانہ مدرسے جاتے اور کئی گھنٹے طلبا کو تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دیتے۔ علومِ شرعی کی نشر و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ان سے متاثر ہو کر لاہور کے بہت سے لوگوں نے حصولِ

علم کو اپنا مقصد ٹھہرالیا تھا اور وہ اپنے مقاصد کے حل کے لیے علوم میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے۔ قلیچ خاں کے تدین اور علومِ شرعیہ میں انہماک کے بارے میں ماثرالامرا کے درج ذیل الفاظ لائق مطالعہ ہیں:

قلیچ خاں صلاح و تقویٰ بسیار داشت و در تسنن متعصب بود، و ہمیشہ بدرسِ علوم و افادہ طلب اشتغال می نمود۔ گویند در صوبہ داری لاہور یک پاس بدرسِ فقہ و تفسیر و حدیث در مدرسہ قیام می ورزید و باقصیٰ غایت در ترویج علومِ شرعیہ می کوشید۔ مردم آں جا بہ امید روشناسی و انجاح مطالب غلوے تمام بہ تحصیل علوم کردند۔[۴۳]

قلیچ خاں انتہائی صلاح و تقویٰ کے حامل اور اتباعِ سنت میں نہایت سخت تھے۔ ہمیشہ درسِ علوم اور افادۂ طلبا میں مشغول رہتے۔ کہتے ہیں، لاہور کی گورنری کے زمانے میں تفسیر، حدیث اور فقہ کے درس میں خاصہ وقت صرف کرتے اور مدرسے جاکر اشاعتِ علومِ شرعیہ کے لیے انتہائی کوشش اور سرگرمی کا اظہار فرماتے۔ لاہور کے لوگ بھی ان سے متاثر ہوکر اپنے حصولِ مقاصد کی غرض سے تحصیلِ علوم میں سرگرم ہوئے۔

پرتگیز مشنری بھی اپنے انداز خاص میں قلیچ خاں کے اسلام کی زوردار الفاظ میں شہادت دیتے ہیں۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

پرتگیز مشنری بھی لکھتے ہیں کہ وہ بڑا پکا مسلمان تھا۔ پرتگیز مشنری اس کے ڈر سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ اس نے لاہور کے ہندوؤں کی شکایت پر جس گھر میں عیسائی پادری رہتے تھے، وہ ان سے خالی کرالیا اور مشنریوں سے وہ تمام مراعات چھین لیں، جن کی اکبر نے سیاسی مصلحتوں یا مذہبی رواداری سے اجازت دے رکھی تھی۔[۴۴]

حضرت مجدد الف ثانی بھی اس امیر کی پابندئ شرع کی بہت تعریف کرتے ہیں اور لاہور میں قلیچ خاں نے ترویجِ دین اور اشاعتِ علوم کی جو کوششیں شروع کر رکھی تھیں،

۴۳۔ ماثرالامرا ۴۴۔ رودِ کوثر، ص ۲۰۵

ان کا شاندار الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔ حضرت مجدد کا قلیج خان سے اگرچہ بالمشافہ تعارف نہیں تھا، لیکن وہ ان کی علمی و دینی سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

ثانیاً اظہارِ محبت گزاری ایشاں می نماید کہ در بلدۂ معظمہ لاہور بہ وجود ایشاں بسیارے از احکامِ شرعیہ دریں طورِ زمانہ رواجے پیدا کردہ است، و تقویتِ دین و ترویج ملت دراں بقعہ حاصل گشتہ است۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان سے اس بنا پر اظہارِ محبت کرنا چاہیے کہ لاہور کے عظیم شہر میں ان کے وجود سے احکامِ شرعیہ کی بہت ہی ترویج ہوئی ہے اور اس خطے میں تقویتِ دین اور نشر و اشاعتِ اسلام کے مواقع پیدا ہوئے ہیں۔

غرض قلیج خاں دورِ اکبری کے نیک، صاحبِ تقویٰ اور عالم و فاضل امیر تھے۔ معقولات و منقولات میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کے ماہر تھے اور ان مضامین پر مشتمل کتابوں کا باقاعدہ مدرسے جا کر طلبا کو درس دیتے تھے۔ کتبِ درسیہ کئی مرتبہ باقاعدہ پڑھا چکے تھے اور علما و فضلا کی ایک بڑی جماعت ان سے مستفید ہو چکی تھی۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔

امیر قلیج خاں شاعر بھی تھے۔ ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں :

عاشق ہوسِ وصال در سر دارد صوفی روقی و خرقہ در بر دارد
من بندۂ آں کسم کہ فارغ زہمہ دائم دلِ گرم و دیدۂ تر دارد

امیر قلیج خاں نے اسّی سال سے زائد عمر پا کر ۱۰۲۳ھ کو عہدِ جہاں گیر میں انتقال کیا۔[۵۵]

۸۸۔ مولانا قیام الدین لاہوری

خطۂ لاہور علم و فضل کے اعتبار سے ہمیشہ زرخیز رہا ہے۔ گیارھویں صدی

---

۵۵ تفصیل کے لیے دیکھیے : مآثر الامرا — بادشاہ نامہ — عملِ صالح (شاہ جہان نامہ) — اذکارِ ابرار — نزہۃ الخواطر، ج ۵ وغیرہ — منتخب اللباب۔ رودِ کوثر۔

ہجری میں بھی اس میں بڑے بڑے علما و فضلا موجود تھے، جن میں مولانا قیام الدین بن نظام الدین لاہوری کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ ممدوح جلیل القدر عالم، فاضلِ وقت اور شیخ تھے۔ فقہ، اصولِ فقہ اور علومِ عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ طبقۂ علما میں بے حد قدر و منزلت کے حامل تھے۔ قوتِ حفظ اس درجہ تیز تھی کہ جو بات ایک مرتبہ پردۂ سماع سے ٹکرا جاتی، وہ کبھی ذہن سے نہ نکلتی۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں علومِ مروجہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تھے۔ ان کا مولد و مدفن لاہور ہے۔ ۱۰۱۳ھ میں فوت ہوئے [۶]

---

[۶] نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۳۱۴

ک

۸۹- شیخ کمال الدین بیجاپوری

شیخ کمال الدین بن فخر الدین بیجاپوری فاضلِ کبیر تھے اور اصول و کلام کے جید علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے شیخ ابنِ حجر مکی کی "الصواعق المحرقہ" کا "البراھین القاطعہ" کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ انھوں نے دلاور خاں وزیر کے حکم سے ۹۹۴ھ میں کیا تھا۔ دلاور خاں، والی بیجاپور سلطان ابراہیم عادل شاہ کا وزیر تھا[1]۔

۹۰- قاضی کمال الدین کشمیری

قاضی کمال الدین بن موسیٰ کشمیری مولانا جمال الدین کشمیری کے بھائی اور برصغیر پاک و ہند کے فحول علما میں سے تھے۔ اپنے دور کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ ۹۷۱ھ میں کشمیر سے سیالکوٹ منتقل ہو گئے تھے۔ وہاں تمام عمر درس و افادہ کو اپنا مشغلہ بنائے رکھا، یہاں تک کہ فقہ، اصولِ فقہ، منطق و حکمت، علمِ کلام اور دیگر علوم و فنون میں ان کی مہارت کا شہرہ دُور دُور تک پہنچ گیا۔ نہایت ذکی اور سریع الحفظ تھے، بہترین مدرس تھے، طلبائے علم ان کے اندازِ تدریس سے بہت متاثر تھے۔ ہر وقت مطالعہ کتب میں مستغرق رہتے تھے اور بڑی محنت و کاوش سے طلبا کو پڑھاتے۔ ان کے شاگرد ان کے اسلوبِ درس سے بہت مطمئن تھے۔ جن حضرات نے ان سے اخذِ علم کیا۔ ان میں برصغیر پاک و ہند کے مشاہیر علما و فضلا شامل ہیں۔ مثلاً مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علما نے ان سے استفادہ کیا۔

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۱۶ بحوالہ محبوب الالباب

قاضی کمال الدین کشمیری نے ۱۰۱۷ھ کو لاہور میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے[۲]

۹۱۔ مفتی کمال محمد عباسی گجراتی

مفتی کمال محمد عباسی گجراتی کی ولادت، ہندوستان کے صوبہ گجرات کے شہر احمد آباد میں ہوئی اور وہیں تربیت پائی۔ اس زمانے میں احمد آباد میں علامہ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ) کا سلسلۂ درس زوروں پر تھا اور نہ صرف علاقہ گجرات میں بلکہ پورے برصغیر میں ان کے علم و فضل کی شہرت تھی۔ کمال محمد عباسی نے ہوش سنبھالا تو ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور طویل مدت تک ان سے وابستہ رہے۔ تا آنکہ علوم و فنون کی تمام مروجہ اصناف میں اپنے اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے اور فقہ، اصول اور علومِ عربیہ کے جید علما میں گردانے گئے۔ اپنے دور کے شیخ اور عالمِ کبیر ہوئے۔ علومِ ظاہری سے فراغت کے بعد طریقت کی طرف متوجہ ہوئے۔ حدیث کی سند اس عہد کے مشہور عالم شیخ عبدالملک بناتی احمد آبادی (متوفی ۹۷۰ھ) سے حاصل کی۔ ۹۸۲ھ میں احمد آباد سے نکلے اور ارضِ مالوہ کے شہر اجین چلے گئے۔ وہیں سکونت اختیار کر لی، کالپی کے شیخ اولیا بن سراج الدین کی صاحب زادی سے نکاح کیا اور اجین کی مسندِ افتا پر فائز ہوئے۔ ساتھ ہی سلسلۂ تدریس بھی شروع کر دیا۔ پورے تیس سال وہاں افتا و تدریس کی مسند پر فائز رہے۔

مفتی کمال محمد عباسی کا معمول تھا کہ جب رات کا تیسرا حصہ باقی رہ جاتا تو بیدار ہو جاتے۔ غسل کرتے، نماز تہجد پڑھتے اور قرآنِ مجید کے خاصے حصے کی تلاوت کرتے۔ پھر ماثورہ اوراد و وظائف میں مصروف ہو جاتے اور بہ آوازِ بلند اللہ کا ذکر کرتے۔

---

[۲] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۱۹ ــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۳ ــــ حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۱ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۱۶

نمازِ فجر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ نمازِ فجر کے بعد تلاوتِ قرآن شروع ہو جاتی جو نمازِ اشراق تک جاری رہتی۔ نمازِ اشراق کے بعد مسندِ درس پر بیٹھ جاتے۔ زوالِ آفتاب تک طلبا کو درس دیتے۔ پھر دوپہر کا کھانا کھاتے، کھانے میں طلبا کی جماعت بھی شریک ہوتی۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرتے۔ پھر ظہر کی نماز کے بعد مسندِ افتا آراستہ کرتے اور عصر تک فتاویٰ نویسی کا کام جاری رہتا۔ عصر کے بعد بھی فتووں کا سلسلہ چلتا۔ مغرب کی نماز کے بعد اپنے تلامذہ کی طرف متوجہ ہو جاتے اور عشا تک ان سے علمی گفتگو فرماتے۔ عشا کے بعد اپنے حجرے میں چلے جاتے اور ان کتابوں کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے جو دوسرے دن طلبا کو پڑھانا ہوتیں۔ یہ کام رات کے ثلثِ اول تک جاری رہتا۔ پھر گھر تشریف لے جاتے۔ یہ ان کی شب و روز کی تقسیم اوقات تھی۔ یہ طریق عمل پندرہ سال کی عمر سے شروع ہوا اور چوہتّر سال کی عمر تک جاری رہا۔

اس نامور عالم و فقیہ نے دوشنبہ کے روز ۱۰ شعبان ۱۰۱۳ھ کو رات کے وقت وفات پائی[۵۳]

۵۳ اذکارِ ابرار، ص ۴۶۴، ۴۶۵ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۱۶، ۳۱۷

ل

۹۴۔ علامہ لطف اللہ کوروی

علامہ لطف اللہ کوروی اپنے علاقے اور دور کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ حنفی المسلک تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے فحول ہندی علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تمام مروّجہ علوم و فنون میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ بالخصوص فقہ و اصول اور علومِ عربیہ میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ شیخ جمال اولیا چشتی کوروی کے شاگرد تھے۔ خود ان کا اپنا حلقۂ تلامذہ بھی بڑا وسیع تھا۔ ان سے جن حضرات نے کسبِ علم کیا، ان میں شیخ احمد بن ابو سعید امیٹھوی (یعنی مشہور عالم و مفسر ملا جیون) قاضی علیم اللہ لکھنوی، اور شیخ علی اصغر قنوجی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ کی علمی، تدریسی اور تصنیفی سرگرمیوں سے اس برصغیر میں علم و فضل کو بڑی ترقی ہوئی اور مختلف اصنافِ علم کی نشر و اشاعت کے وسیع ذرائع معرضِ عمل میں آئے۔[1]

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۱۹

۹۳- مفتی مبارک جون پوری

مفتی مبارک بن ابو البقا بن محمد درویشی حسینی جون پوری کی جائے ولادت جون پور ہے۔ تربیت بھی جون پور میں پائی۔ شیخ ابو البقا کے یہ سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ اپنے والد شیخ ابو البقا جون پوری کے تلمیذ شیخ علی محمد سے حصولِ علم کا آغاز کیا اور ان سے علومِ عربیہ کی تحصیل کی۔ پھر عازمِ الٰہ آباد ہوئے اور وہاں کے علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دہلی گئے اور ملوک و امرا سے تقرب پیدا کیا۔ اپنے شہر کی منصبِ افتا پر متمکن ہوئے۔ اس عہد کے شیخ و عالم اور فقیہ تھے۔ جون پور میں درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا اور عمر بھر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کے چشمۂ فیض سے بہت سے علما نے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ اس عالمِ دین نے ۲ رمضان ۱۰۹۸ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا[1]۔

۹۴- شیخ مبارک ناگوری

شیخ مبارک بن خضر ناگوری، ارضِ ہند کے جید عالم اور مشہور فاضل تھے۔ ان کے اجداد میں سے پانچویں پشت میں ایک بزرگ شیخ موسیٰ تھے جو دیارِ یمن سے نکلے اور دنیا کے مختلف مقامات کی سیر و سیاحت پر روانہ ہوئے۔ اثنائے سیاحت میں بڑے بڑے عجائب کا مشاہدہ کیا اور اسی عالمِ غربت میں نویں صدی ہجری میں اعمال سیوستان کے ایک قصبے "ریل" میں آئے، وہاں توطن اختیار کیا اور متاہل زندگی اختیار کرنے لگے۔ شیخ مبارک کے والد شیخ خضر نے دسویں صدی ہجری کے آغاز میں سیاحتِ ہند شروع کی اور شہر ناگور کو جو ہندوستان

---

[1] تاریخ شیرازِ ہند، جون پور، ص ۲۸،۲۹،۲۷۔۔۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۱۹، ۳۲۰

کے مشہور شہر اجمیر کے شمال مغرب میں واقع ہے، اپنا مسکن ٹھہرایا۔

شیخ مبارک کی ولادت ۹۱۱ھ کو ناگور میں ہوئی۔ فکر و شعور کی منزل میں داخل ہوئے تو گجرات کے شہر احمد آباد کا قصد کیا۔ احمد آباد اس عہد میں علم و فضل کا مرکز تھا اور متعدد علمائے مشاہیر کی تدریسی سرگرمیاں وہاں جاری تھیں، جن میں خطیب ابو الفضل گازرونی اور مولانا عماد الدین محمد طارمی لائق تذکرہ ہیں، ان سے تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے اور بحث و اشتغالِ علمی میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ علوم و فنون کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوئے اور فتویٰ و تدریس کی صلاحیت سے بہرۂ وافر پایا۔

شیخ مبارک ناگوری نہایت ذکی اور ذہین تھے۔ صغر سنی ہی میں علمی مجلسوں اور تحقیقی محفلوں میں شریک ہونے لگے تھے۔ مباحثہ و مجادلہ میں تیز اور مناظرے میں حاضر جواب تھے۔ ان کے اسلوبِ بحث اور اندازِ گفتگو سے کبار علما اور اعیانِ ملک حیران ہو ہو جاتے۔ ۹۵۰ھ کو اکبر آباد (آگرہ) گئے اور درس و افادہ کی مسند پر فائز ہوئے۔ کم و بیش پچاس سال تک سرگرمِ تدریس رہے۔ علم و عمل، تحقیق و کاوش، زہد و ورع، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ ان کی مجلسِ موعظت و تذکیر اور حلقۂ تدریس و تعلیم کے وقار کا یہ عالم تھا اور وہ اس درجہ رعب و دبدبہ کے مالک تھے کہ امرائے مملکت میں سے کسی کو اس میں سرخ یا ریشمی لباس پہن کر آنے کی جرأت نہ ہوتی۔ نہ کوئی ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہن کر ان کے سامنے آسکتا، نہ کسی کو ان کی موجودگی میں تہہ بند ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کی ہمت تھی اور نہ کسی قسم کی غیر شرعی حرکت کا مرتکب ہو سکتا تھا۔ اس زمانے میں وہ سماع کے بھی شدید مخالف تھے۔ اگر راہ چلتے بھی غنا کی آواز کانوں میں پڑ جاتی تو راستہ بدل لیتے اور ہر طریقے سے اس خلافِ شرع حرکت سے دامن بچانے کی کوشش کرتے۔ مگر آخر میں غنا و سماع کی طرف راغب ہو گئے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ غنا و مزامیر کے سوا چین نہ آتا تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ کے مختلف مقامات پر ان کی بہت سی قلبی اور عملی کیفیات کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان پر کئی قسم کے دور آئے اور وہ متعدد حالتوں سے دوچار ہوئے۔ وہ ایک زمانے میں مہدویت سے بھی متاثر ہوئے اور مدتِ مدید تک شیخ علائی سے وابستہ رہے۔ مغل حکمران جلال الدین اکبر کے عہدِ حکومت کے ابتدائی دور میں طریقہ نقشبندیہ پھیلا تو اس سے ہم آہنگ ہو گئے اور مشائخ ہمدان کی طرف انتساب شروع کر لیا، اور جب دیکھا کہ امورِ مملکت میں ایرانیوں کا اثر و رسوخ بڑھ گیا ہے اور حکومت کے اہم اور کلیدی محکمے ان کے قبضے میں آگئے ہیں تو ان کی طرف ملتفت ہو گئے۔ غرض بعد میں ان کے رجحانات میں بڑی تبدیلی آگئی تھی اور ان کے قلب و ذہن کی حالت میں عظیم تغیر رونما ہو گیا تھا، جو قطعی ناپسندیدہ اور غیر شرعی تھا۔

شیخ مبارک ناگوری کی زندگی کا ابتدائی دور بحیثیت ایک مبلغ شریعت، ناہی عن المنکر و آمر بالمعروف کا دور تھا، لیکن بعد میں ان کی زندگی کے لیل و نہار بالکل بدل گئے تھے۔ جلال الدین اکبر کو الحاد کی راہوں پر لگانے اور علمائے دربار کی مخالفت پر آمادہ کرنے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اکبر نے مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی اور اس کی ابتدائی زندگی ایک اچھے مسلمان کی زندگی تھی، لیکن بعد میں جو حالات پیدا ہوئے اور بادشاہ نے جو غلط اور سراسر غیر اسلامی اقدامات کیے، ان کے جواز کے لیے شیخ مبارک اور ان کے بیٹوں ابوالفضل اور فیضی نے راہ ہموار کرنے میں زبردست کردار ادا کیا۔ ان واقعات و حوادث کے چشم دید گواہ ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کی تمام تفصیلات بیان کر دی ہیں اور اس عہد کے علما و مشائخ کی زندگیوں کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

منتخب التواریخ ایک ایسا مرقع ہے، جس میں اس عہد کے تمام ارباب عمائم و اصحاب خرقہ و سجادہ کی تصویریں اپنے اصلی بھیس میں نظر آجاتی ہیں، اور دیکھ کر عبرت ہوتی ہے کہ بڑے بڑے مدعیانِ علم و زہد کو بھی دنیا پرستی نے چین سے بیٹھنے نہ دیا اور راہِ حق پرستی

میں استقامت نصیب نہ ہوئی ہے[۲]

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی صدر الصدور بھی اگرچہ مبرا عن الخطا نہ تھے، لیکن ان کے خلاف اکبر کو برانگیختہ کرنے کی ذمہ داری سے ملا مبارک اور ان کے بیٹے بری نہیں ہو سکتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جو مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی پر شدید تنقید کرتے ہیں، رقم طراز ہیں:

ایک عرصے کے بعد جب حالات بدلے اور ملا مبارک کے خاندان کو عروج ہوا تو انھوں نے ان لوگوں کے زور کو توڑنا چاہا اور اس کی تدبیر یہ نظر آئی کہ مذہبی تعصب کی شدت کو کسی طرح کم کیا جائے۔ چنانچہ حکمت و تحقیقِ جدید کے نام سے آزاد خیالی و مطلق العنانی کی ہوائیں چلنے لگیں[۳]

بادشاہ کو "خلیفۃ الزمان" قرار دینے کا محضر بھی ملا مبارک اور ان کے بیٹوں نے تیار کیا۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

خاندانِ ملا مبارک (یعنی ابوالفضل و فیضی) نے مولویوں کا زور توڑنے کے لیے ایک تدبیر یہ کی کہ ۹۸۷ھ میں اپنے والد ملا مبارک سے ایک محضر تیار کرایا۔ مضمون یہ تھا کہ بادشاہ خلیفۃ الزمان اور امام عہد واجب الاطاعت ہے، اور اس کو حق پہنچتا ہے کہ مسائل مختلف فیہا میں حسبِ ضرورتِ وقت اجتہاد کرے، اور اس کا اجتہاد واجب العمل ہے[۴]

اس محضر پر علمائے دربار میں سے کسی نے طوعاً اور کسی نے کرہاً اپنی اپنی مہریں ثبت کر دیں۔ عبدالقادر بدایونی علما کی اس جماعت میں شیخ مبارک کو بہت بڑا عالم قرار دیتے ہیں اور ۹۸۷ھ کے وقائع میں لکھتے ہیں۔ "شیخ مبارک کہ اعلم علماء

۲؎ تذکرہ، ص ۴۰
۳؎ ایضاً، ص ۴۴
۴؎ ایضاً

زمان بود[۵]

محضر تیار کرنے کا پس منظر یہ ہے کہ جن دنوں صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی نے متھرا کے ایک برہمن کو مسجد کے بجائے شوالہ تعمیر کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب وشتم کرنے کے جرم میں قتل کیا تھا، انھی دنوں شیخ مبارک کسی وجہ سے بادشاہ کی خدمت میں آئے۔ بادشاہ نے ان سے بعض ان مسائل کے بارے میں گفتگو کی جو اکثر پیش آتے رہتے تھے اور علما کا ذکر بھی کیا۔ شیخ مبارک کے، جو پہلے سے صدر الصدور شیخ عبدالنبی سے کدورت رکھتے تھے اور ذہنی طور پر ان سے بہت دور تھے، موقع ہاتھ آگیا۔ انھوں نے علما کی مخالفت کی اور کہا کہ بادشاہِ عادل خود مجتہد ہے۔ اختلافی مسئلے میں حالات کے مطابق حضور جو مناسب سمجھیں اور قرینِ مصلحت جانیں، حکم جاری فرما سکتے ہیں۔ علمائے دین کا رویہ صحیح نہیں ہے، کسی مسئلے میں ان سے رائے لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بادشاہ نے اتنے بڑے عالم کے منہ سے یہ بات سنی تو بہت خوش ہوا، اور کہا:

ہرگاہ شما استادِ ما باشید، و سبق پیشِ شما خوانده باشیم۔ چرا مارا از منتِ ایں ملّایاں خاص نمی سازید۔

یعنی آپ ہمارے استاد بن جایے، ہم آپ سے سبق پڑھیں گے۔ کسی طرح ہمیں ان ملانوں سے نجات دلایے۔

دیر تک اکبر اور شیخ مبارک کے درمیان اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر یہ تجویز ٹھہری کہ آیات و احادیث کی روشنی میں ایک تحریر لکھی جائے، جس کا مفاد یہ ہو کہ امام عادل اختلافی مسئلے میں اپنی رائے سے، مصلحتِ وقت اور تقاضائے حالات کے مطابق جو چاہے کر سکتا ہے۔ علماء مجتہدین کی رائے پر اس کی رائے

---

[۵] منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۲۷۰۔

کہ بہر حال ترجیح حاصل ہو گی۔ چنانچہ اس کا مسودہ خود شیخ مبارک نے تیار کیا۔ مسودہ تیار ہو چکا تو دربار کے تمام علما، اصحابِ فتویٰ اور قضاۃ کو بلایا گیا اور انھیں یہ مسودہ پڑھ کر سنایا گیا، کوئی اس کا مخالف تھا اور کوئی موافق، لیکن طوعاً و کرہاً سب نے اس پر مہریں ثبت کر دیں۔ صدر الصدور شیخ عبد النبی اور مخدوم الملک عبد اللہ سلطان پوری، اس کے مخالف تھے، مجبوراً انھیں بھی اس کی تصویب کرنا پڑی۔ اس صورتِ حال سے شیخ مبارک بے حد خوش تھے اور وہی صدرِ محفل تھے، ان کے حریف علما بے بس تھے اور عوام الناس کی صف میں ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اس محضر کی عبارت بعینہٖ یہ ہے:

مقصود از تشبید این مبانی و تمہید این معانی آں کہ چوں ہندوستان صنت عن الحدثان، بمیامنِ معدلتِ سلطانی و تربیتِ جہاں بانی، مرکزِ امن و امان و دائرۂ عدل و احسان شدہ، طوائف انام از خواص و عوام خصوصاً علمائے عرفان شعار و فضلائے دقائق آثار کہ ہادیانِ بادیہ نجات و سالکانِ مسالک اوتوا العلم درجات اند، از عرب و عجم رو بدیں دیار نہادہ توطن اختیار نمودند۔ جمہور علمائے فحول کہ جامع فروع و اصول و حاوی معقول و منقول اند، و بہ دین و دیانت و صیانت اتصاف دارند، بعد از تدبیر وافی و تامل کافی در غوامضِ معانی آیۂ کریمہ اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم و احادیثِ صحیح، ان احب الناس الی اللّٰہ یوم القیامۃ امام عادل۔ من یطع الامیر فقد اطاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی، و غیر ذلک من الشواہد العقلیۃ و دلائل النقلیۃ، قرار دادہ حکم نمودند کہ مرتبۂ سلطانِ عادل عند اللّٰہ زیادہ از مرتبۂ مجتہد است، و حضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المومنین ظل اللّٰہ علی العالمین ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی خلد اللّٰہ ملکہ ابداً، اعدل و اعلم و اعقل باللّٰہ اند۔ بنا بریں اگر در مسائلِ دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است بذہنِ صائب و فکرِ ثاقب خود یک جانب را از اختلافات، بجہتِ تسہیل

معیشت بنی آدم و مصلحتِ انتظامِ عالم اختیار نمودہ بہ آں جانب حکم فرمایند، متفق علیہ می شود، و اتباعِ آں بر عموم برایا و کافہ رعایا لازم و متحتم است۔ و ایضاً اگر بہ موجبِ رائے صواب نمائے خود حکمے را از احکام قرار دہند کہ مخالف نصے نباشد وسبب ترفیہ عالمیاں بودہ باشد، عمل برآں نمودن بر ہمہ کس لازم و متحتم است ومخالفتِ آں موجب سخطِ اُخروی و خسرانِ دینی و دنیوی است۔ و ایں مسطور صدقِ و فور حسبتہً للہ و اظہاراً لاجرائے حقوق الاسلام بہ محضر علمائے دین و فقہائے مہدیین تحریر یافت۔ وکان ذالک فی شہر رجب ۹۸۷ھ سبع و ثمانین و تسع مائۃ۔

"یعنی اس تمہید و تشریح کا خلاصہ یہ ہے کہ ملک ہندوستان آفات سے محفوظ رہے، سلطان جہاں پناہ کے عدل و انصاف اور تدبر و انتظام سے دارالامن بن چکا ہے، اور ہر جگہ خواص و عوام بالخصوص عرب و عجم کے علماء و فضلا یہاں آکر مقیم ہو چکے ہیں۔ بنابریں تمام علمانے بڑے غور و فکر کے بعد اس آیۂ کریمہ: اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں کہ ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل ــــ من یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعصی الامیر فقد عصانی وغیرہ عقلی و نقلی دلائل و شواہد کی بنا پر یہ حکم لگایا ہے کہ سلطانِ عادل کا مرتبہ اللہ کے نزدیک مجتہد کے مرتبے سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا حضرت سلطان الاسلام امیرالمومنین ظل اللہ ابوالفتح جلال الدین اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ، عوام کی سہولت اور مملکت کے انتظامی مصالح کی خاطر، اگر دین کے ان مسائل میں جو مجتہدین کے نزدیک اختلافی ہوں، کسی بھی ایک صورت کو تجویز کر کے اس کے مطابق احکام جاری فرمائیں تو ان کی تجویز و حکم کو متفق علیہ تصور کیا جائے گا اور اس کی اطاعت و پیروی تمام رعایا پر لازمی اور قطعی ہوگی ــــ نیز سلطان عالم پناہ کوئی بھی ایسا قانون اور حکم نافذ فرمائیں جو عوام کے لیے باعثِ سہولت ہو اور نصِ شرع کے مغائر نہ ہو، اس پر عمل درآمد ہر شخص پر ضروری اور قطعی ہوگا، اور اس کی مخالفت عذابِ اُخروی اور خسرانِ دینی و دنیوی کا باعث ہوگی ــــ یہ سطور

حقوقِ اسلام کے اجرا کی غرض سے حسبتہً للّٰہ علمائے دین اور فقہائے مہدیین کے محضر سے ماہِ رجب ۹۸۷ھ کو ضبطِ تحریر میں لائی گئیں۔"

شیخ مبارک ناگوری نے بلاشبہ اکبر کو خلافِ شرع راستے پر لگایا اور غلط امور میں اس کی رہنمائی کی۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے دور کے بہت بڑے عالم تھے، فقہ و اصول میں مہارت رکھتے تھے، علومِ عربیہ کے دقائق و غوامض کی گرہ کشائی میں انھیں عبور حاصل تھا، تصوف کے رموز سے آگاہ تھے، فنِ شعری میں یکتا تھے، قرآنِ مجید کی دس قرأتوں کے عالم تھے اور شاطبی کا درس دیتے تھے۔ کثیر المطالعہ تھے اور ہر آن درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے۔ حافظہ نہایت تیز تھا اور قوتِ ادراک میں لاثانی تھے۔ جو چیز ایک مرتبہ حافظے کی گرفت میں آجاتی وہ نکلنے نہ پاتی۔ آخر عمر میں جب بصارت ضائع ہوگئی اور مطالعۂ کتب سے معذور ہوگئے تو تفسیرِ قرآن لکھنا شروع کی، جو چار ضخیم مجلدات میں ختم ہوئی۔ اس کا نام "منبع نفائس العیون"[۶۶] رکھا۔ زندگی کے آخری ایام میں ابن الفارض کا تائیہ، بصیری کا قصیدہ بردہ، قصیدہ کعب بن زہیر اور دیگر قصائد پڑھتے رہتے تھے، جو انھیں زبانی یاد تھے۔

شیخ مبارک ناگوری نے ۱۷ ذی القعدہ ۱۰۰۱ھ کو وفات پائی[۶۷]۔

۹۵- مولانا محب علی سندھی برہان پوری

مولانا محب علی بن صدر الدین محمد بن علی بیگ ٹھٹھوی سندھی، ایک فقیہ اور

[۶۶] مآثر الکرام میں میر سید غلام علی آزاد نے اس تفسیر کا نام "منبع عیون المعانی" لکھا ہے لیکن اس تفسیر کا پورا نام "منبع العیون المعانی و مطلع شموس الثانی" ہے۔

[۶۷] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اکبر نامہ ــــ منتخب التواریخ کے مختلف مقامات ــــ مآثر الکرام ج ۱، ص ۱۸۳، ۱۸۴ ــــ بوستان اخبار، ص ۱۴۷ تا ۱۵۳ ــــ دربارِ اکبری، ص ۳۲۸ تا ۳۵۸ ــــ حدائق الحنفیہ ص ۱۹۴ ــــ بزمِ تیموریہ، ص ۸۰ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۲۰، ۳۲۱ ــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۴

شاعر بزرگ تھے۔ اصلاً کوہستانِ برکہ کے ایک قبیلے کے فرد تھے جو چغتائی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کے جدّ امجد علی بیگ بابر کے ساتھ واردِ ہند ہوئے اور مرتبۂ شہادت پایا۔ ان کے والد صدرالدین محمد مغل حکمران ہمایوں کے ساتھ بلادِ سندھ میں گئے اور ٹھٹھہ میں فروکش ہوئے۔ وہیں محب علی کی ولادت ہوئی۔ ابھی کم عمر ہی تھے کہ والد وفات پا گئے اور محب علی نے حصولِ علم کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔ اس سلسلے میں نہایت محنت اور کوشش کا ثبوت بہم پہنچایا اور اکثر علوم متداولہ اور فنونِ مروّجہ میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ جب عبدالرحیم خان خاناں نے سندھ فتح کیا اور اس کی ملاقات اس عالمِ دین سے ہوئی تو وہ ان کے علم و فضل اور فکر و تدبر سے بہت متاثر ہوا، اور اپنے ساتھ دارالخلافہ آگرہ لے گیا۔ عرصہ تک اس عالم اور علم دوست امیر کی مصاحبت و ملازمت میں رہے۔ پھر برہان پور کی راہ لی۔ اس وقت ان کی عمر تیس سال کی تھی۔ مدت تک برہان پور میں اقامت اختیار کیے رکھی۔ برہان پور سے حج بیت اللہ کے ارادے سے روانہ ہوئے لیکن سورت پہنچے تو وہاں شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری (متوفّٰی ۲ رمضان المبارک ۱۰۲۹ھ) سے ملاقات ہوئی۔ وہیں ٹھہر گئے اور ان سے اخذِ طریقت کیا۔ بعد ازاں حرمین شریفین کا عزم فرمایا اور سعادتِ حج و زیارت سے بہرہ ور ہوئے۔ وہاں سے واپس مراجعت کی تو برہان پور کو مسکن ٹھہرایا۔

مغل بادشاہ شاہ جہان اس عالم و فقیہ کو اپنے ساتھ دارالحکومت آگرہ لے گیا تھا۔ تمام عمر اس کے پاس رہے۔ شیخ و فقیہ، عالمِ دین اور بہترین شاعر تھے۔ ۱۰۴۰ھ کے قریب فوت ہوئے[۵۵]

---

۵۵ عمل صالح، ج ۳، ص ۳۸۱، ۳۸۴ — بادشاہ نامہ، ج ۳، ص ۳۳۵، ۳۳۶ — ماثر رحیمی، ج ۳، حصہ اول، ص ۴۸۹ تا ۵۱۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۲۲ — تحفۃ الکرام ص ۵۹۵ — برہان پور کے سندھی اولیا، ص ۲۲۸ تا ۲۵۹

۹۶- علامہ حکیم محمد مصری برہان پوری

علامہ محمد مصری برہان پوری، شیخ وقت، عالم کبیر اور حکیم تھے۔ متعدد فنون کے ماہر تھے۔ بالخصوص فنِ طب کی علمی اور عملی جزئیات میں عبور رکھتے تھے۔ فقہ اور اصولِ فقہ سے باخبر تھے۔ بہترین اوصاف کے مالک، عذوبتِ لسان کی صفت سے متصف، حاضر جواب، ظریف الطبع اور نرم گفتار تھے۔ فارسی کے عمدہ مزاحیہ شاعر اور نامور طبیب تھے۔ بعض امراض کا اس انداز سے علاج کرتے کہ عقل حیران رہ جاتی۔

محمد بن عمر آصفی کا کہنا ہے کہ ان کا نام حکیم بیبرس مصری تھا۔ غالباً بلادِ مصر سے ہندوستان آئے اور احمد نگر میں داخل ہوئے اور فنِ طب کے ماہر کی حیثیت سے ملوک و سلاطین کا تقرب حاصل کیا۔ عرصے تک مرتضیٰ نظام شاہ کے شاہی طبیب کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ ۹۸۰ھ میں چنگیز خاں وزیر کو زہر کھلا کر مار دیا گیا تو مرتضیٰ نظام شاہ نے ان کو اپنا وزیر بنا لیا، لیکن یہ منصب بہت کم مدت کے لیے ان کے پاس رہا۔ کچھ دنوں بعد وزارت سے معزول کر دیے گئے۔ پھر ۹۹۷ھ میں جب مرتضیٰ نظام شاہ قتل ہو گیا تو احمد نگر سے احمد آباد چلے گئے۔ احمد آباد میں خانِ اعظم عزیز کوکہ نے ان کو خوش آمدید کہا اور بڑے احترام سے پیش آیا۔ اس نے ان کو جلال الدین اکبر کے دربار میں اکبر آباد (آگرہ) بھیج دیا۔

شیخ فیضی کا علاج انہی نے کیا تھا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ خود کہا کرتے کہ موت کے سامنے سب عاجز و بے بس ہیں۔ اگر طب سے عمر میں اضافہ ہو سکتا تو کوئی طبیب اس دنیا سے رخصت نہ ہوتا۔ کہتے ہیں ۱۰۰۸ھ کو برہان پور میں انھیں زہر کھلا کر مار دیا گیا تھا۔[۹]

---

[۹] منتخب التواریخ، ص ۱۶۵ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۲۹، ۳۳۰

۹۷- شیخ محمد بیجاپوری

شیخ محمد بن ابو المعالی بن علم اللہ صالحی امیٹھوی، قاضی اعز الدین بیجاپوری کے نام سے معروف تھے۔ شیخ اور عالم و فقیہ تھے اور نامور فقہا و اصولیین میں سے گردانے جاتے تھے۔ سلطان محمد عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور کے منصب قضا پر متعین ہوئے اور تمام عمر اس منصب پر فائز رہے [۱۱۰]

۹۸- سید محمد عاملی

سید محمد بن احمد بن محمد عاملی، مسلکاً شیعہ تھے، نہایت فاضل، عالم، فقیہ اور صالح بزرگ تھے۔ شیخ بہاء الدین عاملی کے جلیل القدر معاصرین میں سے تھے۔ کشمیر چلے گئے تھے اور وہیں توطن اختیار کر لیا تھا۔ کشمیر ہی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے [۱۱۱]

۹۹- شیخ محمد غوثی مانڈوی

شیخ محمد بن حسن بن موسیٰ غوثی گجراتی مانڈوی کی تاریخ ولادت ۱۱ رجب ۹۶۲ھ ہے۔ جائے ولادت مانڈو ہے۔ قرآن مجید شیخ کمال الدین قرشی سے پڑھا۔ پھر فارسی کے کچھ رسائل و کتب کی تعلیم حاصل کی۔ گیارہ سال کے تھے کہ والد وفات پا گئے۔ سترہ سال کو پہنچے تو والدہ نے شادی کر دی، لیکن حصولِ علم کا شغل جاری رکھا اور شادی اس راہِ صواب میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ علمِ نحو اور علومِ عربیہ کی تحصیل شیخ برہان الدین کالپوی سے کی۔ بعد ازاں کشف، المنار اور اصولِ

---

[۱۱۰] نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۳۳۰۔ بحوالہ روضۃ الاولیا

[۱۱۱] نجوم السما، ص ۴۰ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۳۱

فقہ کی مشہور کتاب تلویح کا درس سید شاہ محمد سے لیا۔ پھر عازم آگرہ ہوئے، اور پانچ سال وہاں مقیم رہے۔ ۹۹۰ھ میں سفر گجرات پر روانہ ہوئے۔ وہاں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کا غلغلۂ درس بلند تھا، اس میں داخل ہو گئے اور اکثر کتب درسیہ کی تکمیل فرمائی۔ برہان پور میں حکیم عثمان بن عیسیٰ سندھی سے فنونِ ریاضی پڑھے۔ ۹۹۴ھ میں مانڈو واپس آگئے۔

شیخ محمد غوثی گیارھویں ہجری کے عالمِ دین اور مستقیم الحال صوفی تھے، سلسلۂ شطاریہ میں شیخ صدر الدین محمد رودوی سے مستفیض تھے اور ان کے خلیفہ شیخ محمود بن جلال گجراتی سے منسلک۔ تذکرۂ رجال کی مشہور کتاب "گلزارِ ابرار" کے مصنف تھے۔ یہ کتاب ۶۱۲ علما و مشائخ کا مستند تذکرہ ہے۔ جن حضرات کے اس میں حالات درج ہیں، ان میں کے کچھ بزرگوں سے شیخ محمد غوثی خود ملے ہیں۔ یہ تذکرہ جہاں گیر بادشاہ کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اس کا نقشِ اول ۹۹۸ھ میں تیار ہوا۔ پھر ۱۰۱۰ھ تک اس میں اصلاح و اضافہ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کا زیادہ تر حصہ ۱۰۲۰ھ اور ۱۰۲۲ھ کے درمیان معرضِ کتابت میں لایا گیا۔ یعنی ۹۹۸ھ سے ۱۰۲۰ھ تک مصنف اس کی تکمیل و تصحیح اور اضافہ و اصلاح میں مصروف رہے۔

گلزارِ ابرار، فارسی زبان میں ہے، یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے لینڈ سینا، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن اور برٹش میوزم میں موجود ہیں۔ اجین (ہندوستان) کے ایک صاحبِ علم منشی اللہ یار خاں کے پاس بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ کراچی کے سید سخاوت علی خسرو کا ذاتی کتب خانہ بھی اس کے ایک قلمی نسخے سے مزین ہے۔

۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں ایک ہندی عالم جناب فضل احمد نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا، جو اسی سال مطبع مفید عام آگرہ میں چھپا تھا۔ اصل فارسی کتاب چونکہ دست یاب نہیں ہے، لہٰذا جو لوگ برصغیر کے فقہا و علما اور مشائخ و اولیا کے

حالات کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں، ان میں زیادہ تر یہ ترجمہ ہی متداول ہے اور وہ اپنی تصنیفات میں اسی کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہ ترجمہ "اذکارِ ابرار" (۱۳۲۶ھ) کے تاریخی نام سے موسوم ہے۔ یہی ترجمہ ۱۳۹۵ھ میں اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

شیخ محمد بن حسن غوثی ماندوی نے چھ سو سے زائد علما و مشائخ کے حالات تحریر کیے لیکن افسوس ہے، خود ان کی زندگی کے کوائف بہت ہی کم میسر ہیں۔[۱۲]

۱۰۰۔ قاضی محمد نصیر آبادی

قاضی محمد بن عبدالعزیز بن فتح بن محمد بن محمود حسنی نصیر آبادی، نصیر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوو نما پائی۔ قاضی پیر علی کے نام سے معروف تھے۔ شیخ، فقیہ اور عالم تھے۔ اپنے دور کے کبار فقہا میں سے تھے۔ اپنے والد قاضی عبدالعزیز سے، جو بہت بڑے عالم اور نصیر آباد کے منصب قضا پر متعین تھے، علم فقہ حاصل کیا —— پھر مزید حصولِ علم کی غرض سے مختلف بلاد و امصار میں گئے اور علمائے اعلام کی ایک بڑی جماعت سے مستفید ہوئے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد اپنے والد مرحوم کی جگہ نصیر آباد کی مسندِ قضا سنبھالی اور تمام عمر اس پر متمکن رہے۔[۱۳]

۱۰۱۔ شیخ محمد سندھی

شیخ محمد بن عبداللہ سندھی، تاج العاشقین کے لقب سے مشہور تھے۔

---

[۱۲] ان کے مختصر حالات کے لیے دیکھیے: اذکارِ ابرار (ترجمہ گلزارِ ابرار)، ص ۶۱۱ تا ۶۲۴۔ مقدمہ "اذکارِ ابرار" مطبوعہ اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور —— نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۳۹

[۱۳] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۴۱

ان کا مولد برہان پور ہے، پرورش بھی وہیں ہوئی۔ منطق و حکمت کی کتابیں حکیم عثمان بوبکانی سے پڑھیں، فقہ و اصول کا علم شیخ طاہر بن یوسف سندھی (متوفی ۱۰۰۴ھ) سے حاصل کیا۔ نقد النصوص، شرح منازل السائرین اور شرح گلشن راز کی تحصیل شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی سے کی۔ شرح المواقف کا کچھ حصہ بھی انہی سے پڑھا۔ اخذِ طریقت شیخ لشکر محمد عارف سے کیا۔ یہاں تک کہ علم و معرفت، تدین و صالحیت، فقہ و اصول اور علومِ مروّجہ میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ طویل مدت تک برہان پور میں مقیم رہے اور وہاں درس و افادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔

جلال الدین اکبر بادشاہ نے ناراض ہو کر ایک مرتبہ ان کو جیل میں بھی ڈال دیا تھا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب اکبر نے علاقہ خاندیس پر فوج کشی کی تو وہاں کا فاروقی بادشاہ اپنے امرائے سلطنت اور عمائدِ مملکت کے ساتھ برہان پور کے قلعہ اسیر میں جا بیٹھا۔ بادشاہ اور ارکانِ حکومت کا خیال تھا کہ اکبر اس قلعے کو مسخر نہیں کر سکتا، لیکن اکبر بھی ارادے کا مضبوط تھا، اس نے بہت بڑی فوج جمع کر دی اور نواحِ خاندیس میں پھیلا دی۔ گیارہ مہینے اکبر اپنی کثیر فوج کے ساتھ وہاں خیمہ زن رہا اور باوجود انتہائی کوشش کے قلعے پر قبضہ نہ کر سکا۔ اکبر کے دل میں یہ بات جم گئی کہ برہان پور کے صوفیا اور مشائخ اپنے بادشاہ کی ردِّ بلا کے لیے وظیفے پڑھتے اور دعائیں مانگتے ہیں، اسی لیے برہان پور کی چھوٹی سی حکومت کو اس کی اتنی بڑی فوج شکست نہیں دے سکی اور سب لوگ اطمینان کے ساتھ اپنے شہر میں بیٹھے ہیں۔ چنانچہ اس نے وہاں کے بزرگوں کو نشانہ بنایا اور اکثر کو گرفتار کر کے قید و بند میں ڈال دیا۔ جو بزرگانِ دین زیادہ اثر و رسوخ کے مالک تھے اور ان کو گرفتار کرنے میں بغاوت پھوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا، انھیں کسی اور طریقے سے مبتلائے اذیت کیا۔ یہ ایک عظیم آزمائش اور فتنے کا دَور تھا۔ شیخ عثمان بوبکانی پہلے ہی ابتلا کے ڈر سے برہان پور چھوڑ

چکے تھے، بعض دیگر مشائخ بھی احمد آباد اور سورت چلے گئے تھے، لیکن شیخ محمد سندھی وہاں موجود تھے۔ اکبر انھیں گرفتار کر کے اپنے ساتھ آگرہ لے گیا اور شاہِ برہان پور کی ہوا خواہی کا الزام عائد کر کے حوالۂ زنداں کر دیا۔ عرصہ تک وہ جیل میں رہے۔ پھر بعض لوگوں کی سفارش سے انھیں رہا تو کر دیا گیا مگر برہان پور جانے کی اجازت نہ دی اور اپنے ایک امیر قلیچ خاں کے حوالے کر دیا۔ قلیچ خاں بڑا عالم و فقیہ اور نیک امیر تھا۔ علما کا بڑا ہی قدر دان تھا۔ وہ شیخ محمد سندھی کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے بہت متاثر ہوا، ہر وقت انھیں اپنے ساتھ رکھتا۔ اس اثنا میں وہ لاہور کی مہم پر روانہ ہوا تو شیخ کو بھی ساتھ لے گیا۔ کئی سال اسی طرح کے حالات رہے۔ شیخ محمد سندھی قلیچ خاں کی کمان میں کفار سے جنگ کر رہے تھے کہ غرہ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۳ھ کو راجپوتوں کی لڑائی میں شہید ہو گئے[۱۴]۔

۱۰۲۔ سیّد محمد جالندھری کالپوی

سیّد محمد جالندھری کالپوی کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ محمد بن ابو سعید بن بہاء الدین بن عماد الدین بن اللہ بخش بن سیف الدین بن مجد الدین بن شمس الدین بن شہاب الدین بن عمر بن حامد بن احمد زاہد حسینی سدانوی کالپوی، عالم کبیر تھے، ان کا شمار علمائے ربانیین میں ہوتا تھا۔ اصلاً ترمذ کے صحیح النسب سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اجدادِ کرام میں سے کوئی بزرگ پنجاب کے شہر جالندھر میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ بعد ازاں سید محمد کے والد سید ابو سعید روزگار کے سلسلے میں جالندھر کی سکونت ترک کر کے کالپی چلے گئے تھے۔

سید محمد ۱۰۰۶ھ کو شہر کالپی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ابو سعید، بیٹے کی

---

[۱۴] اذکار ابرار، ص ۴۶۵ — برہان پور کے سندھی علما، ص ۳۳۴ تا ۳۳۹ — نزہتہ الخواطر، ج ۵، ص ۳۴۱

ولادت سے قبل ہی بلادِ دکن میں چلے گئے تھے اور کچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔ محمد نے والد کی غیر موجودگی میں اپنی نیک بخت ماں کی گود میں پرورش پائی۔ سات برس کے تھے کہ ایک عالمِ حدیث شیخ محمد یونس شہر کڑھ سے کالپی آکر فروکش ہوئے۔ محمد بن ابو سعید نے ان سے حصولِ علم کا آغاز کیا اور علم بیان و معانی کی مشہور کتاب مطول تک ان سے درسی کتابیں پڑھیں۔ انہی سے سندِ حدیث حاصل کی۔ پھر عازمِ جاجمو ہوئے، وہاں مولانا جاجموی سے بعض کتابوں کا درس لیا۔ بعد ازاں کور گئے۔ وہاں شیخ جمال بن مخدوم کوروی کی مسندِ درس آراستہ تھی، ان سے باقی کتبِ درسیہ پڑھیں۔ پھر انہی سے اخذِ طریقت کیا۔ اخذِ علم اور کسبِ طریقت کے بعد اپنے شہر کالپی کا قصد کیا اور درس و افادہ کی طرح ڈالی۔ عرصہ تک خدمتِ تدریس انجام دیتے رہے۔ پھر اپنے اعزہ و اقارب میں شادی کی غرض سے واردِ جالندھر ہوئے۔ جالندھر سے آگرہ گئے، وہاں امیر ابو العلا حسینی اکبر آبادی سے ملے۔ ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر طریقۂ احراریہ کے مطابق اخذِ فیض کیا۔ اس کے بعد دس سال تک درس و افادہ میں مشغول رہے۔ پھر ایک وقت آیا کہ لوگوں سے بالکل منقطع ہو گئے اور علیحدگی و انزوا کی زندگی اختیار کر لی، تعلیم و تدریس اور بحث و اشتغال کی دلچسپیاں ختم کر دیں۔ اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں محصور کر لیا اور لوگوں سے میل جول کا سلسلہ قطعی ختم کر دیا۔ اب انھیں یا تو گھر میں دیکھا جاتا تھا یا مسجد میں، اور کہیں نہ جاتے۔

آخر عمر میں ہمیشہ روزے سے رہنے لگے تھے۔ صرف انہی دنوں میں افطار کرتے جن دنوں میں اللہ نے روزے رکھنے کو حرام قرار دیا ہے۔ چھ سال یہ کیفیت رہی، اس کے بعد وفات پا گئے۔ شیخ محمد بن ابو سعید کالپوی جالندھری، صاحبِ تصنیف بھی تھے، اور مختلف عنوانات کے تحت بہت سی کتابیں ضبطِ تحریر میں لائے، جن میں ایک سورۂ یوسف کی تفسیر ہے، ایک عربی زبان میں کتاب الروائح ہے، ایک رسالہ تحقیقِ روح سے متعلق ہے، ایک رسالہ عربی میں وحدت الوجود

کے بارے میں ہے، ایک کتاب فارسی زبان میں سلوک کے موضوع پر ارشاد السالکین ہے، ایک اور رسالہ فارسی میں مبحثِ فنا کے سلسلے میں ہے، ایک رسالہ عقائدِ صوفیا کے متعلق ہے، ایک رسالہ واردات کے متعلق ہے اور عربی میں ہے۔ سلوک کے باب میں ایک اور عمدہ رسالہ ہے، ایک رسالہ مراتبِ فنا اور وصول الی اللہ کے بارے میں فارسی زبان میں ہے۔

شیخ محمد بن ابو سعید اپنے دور کے عالم و فاضل، فقیہ اور صوفی بزرگ تھے۔ ۲۶ر شعبان ۱۰۷۱ھ کو پینسٹھ سال کی عمر پا کر فوت ہوئے اور کالپی میں دفن کیے گئے۔[۱۵]

۱۰۳۔ سیّد محمد حضرمی

سید محمد بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ عیدروس حضرمی ثم ہندی سورتی، مشاہیر علمائے کاملین میں سے تھے۔ علم و عمل کے اعتبار سے اپنے وقت کے امام تھے۔ کردار و گفتار، زہد و تقویٰ اور تحقیق و کاوش میں یگانۂ روزگار تھے۔

۹۷۰ھ کو تریم میں پیدا ہوئے، قرآنِ مجید پڑھا اور حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ اپنے والد کی گود میں تربیت پائی اور ان سے متعدد علوم کی تحصیل کی۔ سید محمد بن حسن، محمد بن اسماعیل فقیہ اور سید عبدالرحمٰن بن شہاب سے علمِ فقہ حاصل کیا۔ پھر حدیث کی سماعت کے لیے علما کی ایک جماعت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علمِ تصوف کے حصول کے لیے بھی بہت سے علما سے منسلک رہے۔ ان کے تمام مشائخ ان کی تعریف کرتے اور ان کے فضل و کمال کی شہادت دیتے ہیں۔ اپنے عمِ محترم شیخ عبدالقادر سے بھی انھوں نے کسبِ فیض کیا اور انھوں نے ان کے والد شیخ عبداللہ کو مبارک باد کا خط لکھا اور ان کے اس بیٹے (سید محمد) کے

۱۵ؔ مآثر الکرام، ص ۱۷۶تا ۱۷۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۲۷، ۳۲۸۔ بحوالہ ضیائے محمدی

علم و فضل کی ہمہ گیری اور زہد و ورع میں انفرادیت کو ان کے لیے قابلِ فخر قرار دیا۔ ان دنوں سید محمد کے دادا شیخ بن عبداللہ احمد آباد میں تھے، انھیں پوتے کے فضل و کمال کا پتا چلا تو ۹۸۹ھ میں انھیں احمد آباد بلا لیا۔ احمد آباد پہنچ کر اپنے جدِّ امجد سے بہت سے علوم حاصل کیے اور اس مرتبۂ علمی کو پہنچے، جس پر اس دور کے بہت سے کبار مشائخ نہیں پہنچ پائے تھے۔

غرض سید محمد حضرمی دیارِ ہند میں آ بسے تھے اور اپنے دور کے جلیل القدر عالم و فقیہ تھے۔ پہلے وہ احمد آباد میں قیام پذیر ہوئے تھے، اس کے بعد سورت چلے گئے تھے اور اسی شہر کو اپنا وطن قرار دے لیا تھا۔ اس ملک کا حکمران طبقہ بھی انھیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ علم و فضل کی فراوانی کے علاوہ جود و سخا میں بھی مشہور تھے۔ اس عالم و فقیہ نے ساٹھ سال کی عمر پا کر ۱۰۳۰ھ کو سورت میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے [۱۶]

۱۰۴۔ شیخ محمد راندیری

شیخ محمد بن علی حمید شافعی اشعری عیدروسی راندیری سورتی، صالح عالمِ دین تھے۔ ان کا شمار مشائخ صوفیا میں ہوتا تھا۔ سید عمر بن عبداللہ باشیبان سے اخذِ طریقت کیا۔ پھر ۱۰۳۰ھ میں سفرِ حج پر روانہ ہوئے۔ حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کر کے ارضِ ہند میں آئے اور سورت میں اقامت اختیار کی۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں اللمعان بتکفیر من قال بخلق القرآن، صوارم الصدیق لقطع الزندیق اور دخیق المحمدیۃ فی طریق الصوفیہ شامل ہیں۔ آخر الذکر کتاب کو صاحب نزہۃ الخواطر علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی نہایت عمدہ کتاب قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ حضرت سید

---

[۱۶] خلاصۃ الاثر، ج ۴، ص ۲۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۴۱ تا ۳۴۳

نواب صدیق حسن قنوجی کے صاحب زادے سید نور الحسن کے کتب خانے میں موجود تھا۔

شیخ محمد راندیری کی وفات کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ میں نے کتاب کی پشت پر شیخ محمد ابو بکر حنفی احمد آبادی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ تحریر پڑھی ہے کہ شیخ محمد راندیری نے ہفتے کے روز ۲۱ ذی الحجہ ۱۰۶۸ھ کو وفات پائی۔[۷]

۱۰۵- سیّد محمد عاملی

دیارِ ہند کے گیارھویں صدی ہجری کے ایک بزرگ سید شریف محمد بن علی حسینی عاملی تھے، جو مشہور شیعہ فاضل اور فقیہ تھے۔ اپنے معاصرین و اقران میں ان کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ان کے علم و فضل کا بڑا شہرہ تھا۔ علوم مروّجہ میں عبور و استحضار کا یہ عالم تھا کہ بیک وقت فقیہ، نحوی اور شاعر تھے۔ تمام اصنافِ علم سے باخبر تھے۔ نیکی اور صالحیت کے جوہر سے بھی آراستہ تھے۔ کشمیر میں رہنے لگے تھے اور اسی خطۂ ارض کو اپنا مسکن ٹھہرا لیا تھا۔[۸]

۱۰۶- شیخ محمد برہان پوری

شیخ محمد بن فضل اللہ بن صدر الدین جون پوری ثم برہان پوری، شیخ و امام اور عالم دین تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ گجرات میں میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ صغر سنی ہی میں باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے۔ شیخ صفی الدین گجراتی سے خرقۂ طریقت زیب تن کیا۔ پھر

---

[۷] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۴۹، ۳۵۰

[۸] نجوم السما، ص ۹۵ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۴۴

ارضِ حجاز کو روانہ ہوئے اور بارہ سال وہاں مقیم رہے۔ شیخ علی بن حسام الدین متقی مکی ان دنوں مکہ مکرمہ میں مقیم تھے اور ان کا سلسلۂ درس صلاح جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور فیض حاصل کیا۔ پھر احمد آباد کا قصد کیا، وہاں شادی کی اور شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ بارہ سال ان کی خدمت و صحبت میں رہے۔ بعد ازاں شیخ محمد ماہ بیرپوری سے اخذِ طریقت کیا۔ پھر شیخ ابومحمد بن خضر تمیمی سے تصوف و سلوک کی منزلیں طے کیں۔ شیخ ابومحمد خضر تمیمی ان حضرات میں سے تھے، جنھوں نے ان کے والد شیخ فضل اللہ برہان پوری سے کسبِ فیض کیا تھا۔ ان تمام منزلوں کو عبور کرنے کے بعد برہان پور کو اپنا مسکن ٹھہرایا اور درس و افادہ میں منہمک ہو گئے۔ نہایت عبادت گزار، یادِ خدا میں مصروف رہنے اور اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ ہمیشہ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علومِ دینی کی تدریس و تعلیم میں مشغول رہتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ علم و عمل، زہد و عبادت اور ورع و تقویٰ میں امام کی حیثیت رکھتے تھے اور پورے ہندوستان میں مشہور تھے۔ جس مرتبۂ بلند کو پہنچے، دوسرا کوئی نہیں پہنچ سکا۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ دن کے آخری حصے میں اپنے آپ کا محاسبہ کرتے، روزانہ جو کام کیا ہوتا وہ بھی ضبطِ تحریر میں لاتے۔ ہر وقت اللہ کے خوف میں رہتے اور موت کی توقع رکھتے۔ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ۹۹۹ھ میں اس موضوع سے متعلق ایک رسالہ بھی لکھا جس کا نام "التحفۃ المرسلہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" پھر "الحقیقۃ الموافقۃ للشریعۃ" کے نام سے اس کی ایک لطیف شرح سپردِ قلم کی۔ اس کے علاوہ ایک کتاب الھدیۃ المرسلۃ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم تصنیف کی، ایک اور کتاب "الوسیلۃ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھی، اس میں قاضی عیاض کی شفا اور ترمذی کی شمائل کی تلخیص کی گئی ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ مولانا جامی کی مشہور کتاب، لوائح کی شرح لکھی، ایک رسالہ اس موضوع پر لکھا کہ امرد کی امامتِ

نماز مکروہ ہے، معراج کے بارے میں بھی ایک رسالہ تصنیف کیا۔
شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری نے دوشنبہ کے دن ۲ رمضان المبارک ۱۰۲۹ھ کو وفات پائی، برہان پور میں مدفون ہیں[۱۹]

۱۰۷۔ مولانا محمد سندھی

مولانا محمد بن یوسف ٹھٹھوی سندھی، بہت بڑے فاضل تھے۔ علوم حکمیہ اور فنونِ ادبیہ میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، فقہ اور اصول پر بھی گہری نظر تھی، علمِ جفر تکسیر اور اعداد سے خوب آگاہ تھے۔ جہاں گیر بادشاہ کا وزیر مطلق ابوالحسن آصف جاہ جو جہاں گیر کی بیوی نور جہاں کا بھائی تھا، شیخ محمد بن یوسف ٹھٹھوی کا شاگرد اور عقیدت مند تھا۔ ابوالحسن آصف جاہ منطق و حکمت، تاریخ و رجال اور شعر و انشا کا عالم تھا اور یہ علوم اس نے انہی شیخ محمد بن یوسف سندھی سے حاصل کیے تھے۔ وہ ان کی انتہائی قدر کرتا اور بے حد تکریم سے پیش آتا تھا۔ ان کو مال و منال سے بھی نوازتا تھا۔ دیگر امرائے مملکت کے نزدیک بھی ان کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ شیخ یوسف ممدوح نے علاقہ سندھ میں قضا و افتا اور احتساب وغیرہ کے سلسلے کی خدماتِ شرعیہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔

پھر جب بادشاہِ ہند کے دربار میں مہابت خاں کا اثر و رسوخ بڑھا اور آصف جاہ کی طرف سے طبیعت میں تکدر پیدا ہوا تو ایسے تین آدمی قتل کرا دیے گئے جو آصف جاہ سے گہرا تعلق رکھتے تھے اور ان کے بارے میں یہ شبہ تھا کہ وہ آصف جاہ کے معاونِ خاص ہیں اور اسے فتنہ بپا کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، ان میں مولانا محمد بن یوسف سندھی کا نام بھی شامل تھا۔ مولانا موصوف نے کبر سنی میں

---

[۱۹] خلاصۃ الاثر، ج ۴، ص ۱۱۰ — اذکارِ ابرار، ص ۵۹۷، ۵۹۸ — نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۵۲، ۳۵۳

قرآنِ مجید حفظ کیا تھا اور ہر وقت اس کی تلاوت میں مصروف رہتے تھے، چلتے پھرتے ان کا یہی مشغلہ تھا۔ تلاوت کی وجہ سے چوں کہ ہونٹ ہلتے رہتے تھے، اس لیے آصف جاہ کے مخالفوں اور مہابت خاں کے حامیوں نے یہ یقین کرلیا کہ مولانا محمد سندھی دم اور دعائیں کرتے رہتے ہیں کہ مہابت خاں کا ستارہ گردش میں آئے اور بادشاہ کے نزدیک جو عزت و احترام اسے حاصل ہے، وہ ختم ہو جائے۔ اس بنا پر ۱۰۳۵ھ میں انھیں قتل کر دیا گیا۔[۱۲۰]

۱۰۸۔ قاضی محمد آصف الہ آبادی

قاضی محمد آصف صدر پوری ثم الہ آبادی، بڑے فاضل اور علامۂ وقت تھے۔ علومِ حکمیہ میں بڑے ماہر کامل تھے۔ ہندوستان کے شہر خیر آباد کے نواح میں ایک گاؤں صدر پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ مفتی عبدالسلام اعظمی دیوی اور دیگر علمائے عصر سے اخذِ علم کیا۔ حصولِ علم کے بعد الہ آباد کی مسندِ قضا پر متمکن ہوئے اور الہ آبادی کہلائے۔ ساتھ ہی سلسلۂ تدریس بھی جاری رکھا اور دیارِ ہند کے بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا، جن میں شیخ محمد افضل بن عبدالرحمٰن عباسی الہ آبادی بھی شامل ہیں۔ انھوں نے قاضی محمد آصف سے شرح المطالع و شرح حکمۃ العین کا کچھ حصہ پڑھا، تفسیر بیضاوی کا درس بھی لیتے رہے۔

قاضی محمد آصف، تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ مبحث جود میں محقق دوانی کے رسالے کا رد لکھا۔ تفسیر بیضاوی پر تعلیقات سپردِ قلم کیں۔[۱۲۱]

۱۰۹۔ شیخ محمد آفاق لکھنوی

شیخ محمد آفاق لکھنوی، شیخ صالح اور صوفی المشرب فقیہ اور عالم تھے۔

---

[۱۲۰] مآثر الامرا (اردو ترجمہ)، ج ۳، ص ۳۱۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۵۶

[۱۲۱] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۵۶، ۳۵۷

ہندوستان کے صوبہ بہار میں پٹنہ کے قریب ایک گاؤں "تلاوہ" میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصولِ علم کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اور رفقر و فاقہ کی راہ پر گامزن ہوئے۔ گوپامئو گئے، وہاں مفتی وجیہ الدین گوپاموی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے کتبِ درسیہ کی تکمیل کی۔ پھر لکھنؤ کا عزم کیا اور شیخ پیر محمد لکھنوی سے فیضِ طریقت حاصل کیا اور طویل عرصہ تک ان کی ملازمت و مصاحبت میں رہے ــــ شیخ پیر محمد کی وفات کے بعد ان کی جگہ خود درس و افادہ میں سرگرمِ عمل ہوئے۔ تکلفات کو بالکل پسند نہ کرتے تھے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ۲۲ ربیع الثانی ۱۰۸۹ھ کو وفات پائی ۵۲۲

۱۱۰۔ قاضی محمد اسلم ہروی

قاضی محمد اسلم ہروی، ملا خواجہ کوہی کی اولاد سے تھے جو خراسان کے مشاہیر مشائخ اور نامور علما میں سے تھے اور شیخ محمد سعید حنفی خراسانی المعروف بہ میر کلاں محدث کے والد تھے۔ میر کلاں بادشاہِ ہند جہاں گیر کے استاذ تھے۔ قاضی محمد اسلم ہرات میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ کابل آئے اور بعض علوم کی تحصیل کی۔ عہدِ جہاں گیری کے آغاز میں حصولِ علم کی غرض سے لاہور کا قصد کیا اور مولانا محمد فاضل بدخشی لاہوری اور شیخ بہلول لاہوری سے درسی کتابیں پڑھیں، جو اس دور کے فحول علما اور صنادید فضلا میں سے تھے۔ تکمیلِ علم کے بعد عازمِ آگرہ ہوئے اور جہاں گیر سے تقرب پیدا کیا۔ چوں کہ یہ مولانا میر کلاں کی اولاد سے تھے اور بادشاہ کو ان سے شرفِ تلمذ حاصل تھا، اس لیے بادشاہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور کابل کے منصبِ قضا سے سرفراز کیا۔ کافی عرصہ اس اہم منصب پر فائز رہے، پھر قاضی لشکر مقرر کر دیے گئے۔ جہاں گیر کے بعد

---

۵۲۲ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۸۲ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۵۷

اس کا بیٹا شاہ جہان تختِ ہند پر متمکن ہوا تو اس نے ان کے اعزاز میں اور بھی اضافہ کیا، اس نے پانچ وقت کی نمازوں، جمعے اور عیدین کا امام مقرر کر دیا۔ ساتھ ہی منصبِ یک ہزاری سے نوازا۔ اس نے اس حد تک ان کی تکریم کی کہ ۱۰۵۲ھ میں ان کو چاندی سے تلوایا اور جو رقم ان کے وزن کے برابر آئی، وہ عنایت کی۔ یہ رقم چھ ہزار پانچ سو روپے کی تھی۔

قاضی محمد اسلم ہروی فاضلِ وقت اور اپنے دَور کے جلیل القدر عالم تھے۔ منطق و حکمت میں بالخصوص عبور رکھتے تھے اور اس میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ تینس۲۳ سال تک قاضیِ لشکر رہے اور کمال دیانت اور وقار کے ساتھ یہ عظیم خدمت انجام دی۔ اس اثنا میں کسی کو ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ جہاں گیر بھی ان کے علم و فضل اور دیانت و تقویٰ سے بہت متاثر تھا اور شاہ جہان بھی ان کی فضیلتِ علمی اور کام سے انتہائی خوش تھا۔ لیکن بعد میں شاہ جہان کے دل میں ان کی پہلی سی قدر و منزلت باقی نہ رہی تھی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ایک مرتبہ (۱۰۶۰ھ میں) یہ گھوڑے پر سوار تھے، گھوڑا بدکا اور یہ نیچے آگرے، خاصی چوٹیں آئیں، تین مہینے صاحبِ فراش رہے، علاج ہوتا رہا اور تندرست ہوگئے۔ ان کے صحت یاب ہونے کے بعد بادشاہ نے اپنے ایک امیرِ مملکت فراست خاں کو جو حج بیت اللہ کے سلسلے میں بادشاہ کی طرف سے نظامت کے عہدے پر فائز تھا، ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کی رقم دے کر حج پر جانے کا حکم دیا، یہ رقم مکہ مکرمہ کے امیر اور وہاں کے دیگر اشراف و امرا کی خدمت میں پیش کرنا تھی۔ بادشاہ نے فراست خاں سے کہا کہ وہ قاضی محمد اسلم ہروی کو بھی سفرِ حج میں اپنے ساتھ لے جائے۔ فراست خاں نے قاضی موصوف سے کہا تو وہ حج کو جانے پر رضامند نہ ہوئے اور جو عذر پیش کیے وہ بظاہر معقول نہ تھے۔ شاہ جہان بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے بُرا مانا اور قاضی موصوف کو اپنے منصب سے الگ کر دیا، اور دس ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

ان کی جگہ خوش حال کو پورے ہندوستان کے قاضی کا منصب عطا کیا۔

ایک روایت کے مطابق قاضی محمد اسلم ہروی نے لاہور میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔ دوسری روایت کے مطابق کابل میں انتقال کیا۔ ان کا سالِ وفات ۱۰۶۱ھ ہے[۲۳۵]

منتخب اللباب میں خافی خاں نے ان کا نام قاضی محمد سلیم تحریر کیا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند الفاظ میں یہاں قاضی خوشحال کا تعارف بھی کرا دیا جائے جو قاضی محمد اسلم ہروی کے بعد منصبِ قضا پر مامور ہوئے۔ یہ دراصل مضافاتِ کابل کے باشندے تھے۔ آگرہ میں شاہ جہان بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دہلی کے قاضی مقرر کر دیے گئے۔ جب قاضی محمد اسلم، عہدۂ قضا سے معزول ہوئے تو انھیں دہلی کا قاضی مقرر کیا گیا، اس کے بعد قاضیِ لشکر مقرر ہوئے۔ پھر اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ بنا تو قاضی عبداللطیف کو لشکر کے قاضی بنا دیا اور قاضی خوش حال کو لاہور کا منصبِ قضا تفویض ہوا۔ چند سال وہ لاہور کے قاضی رہے۔ ان کے حسنِ سلوک اور دیانت داری سے خواص و عوام سب خوش تھے۔ موت کا پیغام آیا تو آواز آئی۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً (الفجر، ۲۸،۲۷)

اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کی طرف واپس ہو، اس طرح سے کہ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔

---

۲۳۵ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مآثر الکرام، ص ۱۹۵ تا ۱۹۸ — عمل صالح، ج ۱، ص ۴۴۳ — ج ۲، ص ۲۰۹، ۳۴۷، ۴۲۳ — ج ۳، ص ۲۸۹، ۳۶۷ — بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۳۳۳ — ابجد العلوم ص ۹۰۳، ۹۰۴ — قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب، ص ۲۰۰، ۲۰۱ — سبحۃ المرجان، ص ۶۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۵۷، ۳۵۸ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۸ — منتخب اللباب، ج ۱، ص ۷۵۲ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۱۲ — بزم تیموریہ، ص ۲۱۴، ۲۱۵۔

اور روح عالم علوی کو پرواز کر گئی[۳۴]

۱۱۱- سید محمد اشرف نہٹوری

سید محمد اشرف کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ محمد اشرف بن محمد سعید بن محمد معروف بن داؤد بن خیر الدین جون پوری نہٹوری، فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں معروف تھے۔ ان کا مولد نہٹور ہے، نشوونما بھی اسی شہر میں ہوئی۔ وہیں شیخ تاج الدین سنبھلی کی صاحب زادی سے شادی کی، پھر عہدِ شاہ جہانی میں امروہہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی[۳۵]

۱۱۲- علامہ محمد افضل جون پوری

علامہ محمد افضل کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ محمد افضل بن محمد حمزہ بن محمد سلطان بن فرید الدین بن بہاء الدین عثمانی جون پوری، شیخ عثمان ہارونی کی نسل سے تھے۔ عالم کبیر، علامۂ وقت اور شیخ تھے، مختلف علوم میں یگانۂ روزگار اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے جامع تھے۔

علامہ محمد افضل کے والد محمد حمزہ بلادِ مازندران کے ایک مقام دماوند کے رہنے والے تھے۔ وہ وہاں سے چلے اور اعمالِ اودھ میں ردولی کے مقام پر سکونت پذیر ہو گئے۔ ردولی میں ۱۷ رمضان ۱۰۴۷ھ کو محمد افضل کی ولادت ہوئی۔ محمد حمزہ اچھے عالم تھے، انھوں نے اپنے اس بیٹے کو ابتدائی تعلیم خود ہی دی۔ بعض درسی کتابیں بھی خود ہی پڑھائیں۔ اس اثنا میں محمد افضل کو بھی علم سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور عمر کی کچھ منزلیں بھی طے کر لی تھیں، لہٰذا مزید تعلیم کے لیے ردولی سے

---

[۳۴] فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۲۰۷، ۲۰۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۳

[۳۵] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۵۹-۳۰ بحوالہ بحر النواز ع

دہلی کا قصد کیا۔ دہلی اس زمانے میں علم وفضل کا مرکز تھا اور مختلف جلیل القدر علما وفضلا کا سلسلۂ درس جاری تھا، جن میں شیخ طاہر لاہوری کے تلمیذ شیخ حسین عمری، شیخ عبداللہ سلطان پوری کے شاگرد شیخ ابوحنیفہ اور دیگر علمائے مشاہیر کی تدریسی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور علما وطلبا کی بڑی تعداد ان سے استفادہ کر رہی تھی، محمد افضل بھی ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو گئے اور کسب علم کرنے لگے، یہاں تک کہ بحث و اشتغال میں مرتبۂ بلند کو پہنچے اور علومِ متداولہ میں منفرد حیثیت کے حامل ہوئے۔

علامہ محمد افضل کے حفظ واتقان اور جامعیتِ علم وادراک کا یہ عالم تھا کہ بیس[۳] سال کی عمر میں درس وافتا کی مسندِ بلند پر متمکن ہو گئے تھے اور ان کا شمار اکابر علما میں ہونے لگا تھا۔ جون پور ایک عرصے سے علمی شہرت کا شہر تھا اور وقت کے جید علما اور نامور فضلا کا مسکن رہ چکا تھا، جس زمانے کے حالات کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں، اس زمانے میں بھی عظیم المرتبت علما ومشائخ وہاں موجود تھے اور ان کا سلسلۂ درس اور چشمۂ فیض وہاں جاری تھا۔ علامہ محمد افضل بھی جون پور روانہ ہو گئے اور مستقل طور سے وہاں اقامت اختیار کر لی، اس کے بعد وہ جون پوری کہلائے۔ جون پور میں انھوں نے شیخ عبدالقدوس جون پوری سے اخذ طریقت کیا اور درس وافادہ میں سرگرمِ عمل ہو گئے۔ ان سے فلسفہ و حکمت کی مشہور اور انتہائی کتاب "شمس البازغہ" کے مصنف علامہ محمود فاروقی جون پوری اور فنِ مناظرہ کی درسی کتاب "رشیدیہ" کے نامور مؤلف شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری نے اخذِ علم کیا۔ ان کے علاوہ خلقِ کثیر ان کے علم وفضل کی ہمہ گیری سے مستفید ہوئی۔

علامہ محمد افضل جون پوری، نہایت نیک، پاک باز، حسنِ اخلاق کے مالک، متقی اور سلیم الطبع تھے، ان کے علم وتدریس کی وجہ سے جون پور نے بڑی شہرت پائی۔ ان کے شاگرد علامہ محمود فاروقی جون پوری بڑے فاضل بزرگ تھے اور ان استاذ (علامہ محمد افضل) کو ان سے بے حد محبت تھی، ان کے یہ لائق شاگرد استاذ

کی زندگی ہی میں وفات پاگئے تھے، علامہ محمد افضل نے ان کی وفات پر انتہائی حزن و ملال کا اظہار کیا اور بے حد مغموم رہنے لگے، غم واندوہ کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چالیس روز تک مسکرائے بھی نہیں، بالآخر چالیس روز کے بعد خود بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی تاریخ وفات ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ ہے، چوراسی سال سے زائد عمر پائی۔ جون پور کے محلہ چوچک پور میں دفن کیے گئے [۲۶]

۱۱۳۔ قاضی محمد افضل لاہوری

قاضی محمد افضل حنفی لاہوری، شیخ اور عالم تھے۔ ان کا شمار فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں ہوتا تھا، شیخ ابو تراب بن نجیب الدین شیرازی سے اخذِ طریقت کیا تھا۔ قاضی محمد افضل سے خلق کثیر فیض یاب ہوئی۔ ۱۰۹۲ھ کو لاہور میں فوت ہوئے [۲۷]

۱۱۴۔ قاضی محمد حسین جون پوری

قاضی محمد حسین ہندوستان کے مشہور مرکزِ علم و تحقیق جون پور کے باشندے تھے۔ ان کا شمار اپنے دور کے بڑے بڑے علما و فقہا کے زمرے میں ہوتا تھا۔ فقہ و اصول میں انھیں بہرۂ وافر حاصل تھا۔ شاہ جہان بادشاہ کے عہدِ حکومت میں جون پور کے منصبِ قضا پر متمکن ہوئے۔ اورنگ زیب عالم گیر تختِ نشین ہوا تو اس نے اپنے اوائل عہدِ حکومت میں انھیں الٰہ آباد منتقل کر دیا اور وہاں کی مسندِ قضا ان کے سپرد کی۔ اس کے بعد ان کے منصب میں اضافہ کر کے فوج کے

---

۲۶ سبحۃ المرجان، ص ۵۴ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۸۱ — نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۵۹ — تاریخ شیرازِ ہند جون پور، ص ۱۱، ۷۱۲ — ابجد العلوم ص ۹۰۲

۲۷ خزینۃ الاصفیا، ص ۹۸۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۶۱

محکمۂ احتساب پر متعین کر دیئے گئے۔

قاضی محمد حسین جون پوری علمائے برصغیر کی اس بلند بخت جماعت میں شامل تھے، جنھوں نے "فتاویٰ ہندیہ" یعنی فتاویٰ عالم گیری کی تدوین و تصنیف میں تحقیق و کاوش کے جوہر دکھائے۔ فرحت الناظرین کے مصنف محمد اسلم انصاری پسروری نے ان کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے:

از علم و ہنر بہرۂ وافر داشت [۵۲۸]

یعنی قاضی محمد حسین جون پوری علم و فن کے بہرۂ وافر سے سعادت اندوز تھے۔

تذکرہ علمائے ہند میں ان کے تذکرہ و تعارف کے سلسلے میں یہ الفاظ مرقوم ہیں:

قاضی محمد حسین جون پوری از علم و فضل نصیبے وافر داشت۔ در عہد شاہ جہانی قاضی جون پور بود، و در اوائل عہدِ عالم گیر بہ قضائے الہ آباد ممتاز شدہ۔ و در سنِ ہفتم جلوسِ عالم گیر بہ حضور آمدہ۔ بہ اضافہ منصب و احتسابِ لشکر سرفراز گردید، و در تالیف فتاویٰ عالم گیری بسے سعی نمودہ [۵۲۹]

قاضی محمد حسین جون پوری علم و فضل میں حصہ وافر رکھتے تھے۔ شاہ جہان کے عہدِ حکومت میں جون پور کے قاضی تھے۔ عالم گیر کے آغازِ عہدِ بادشاہت میں الہ آباد کے قاضی مقرر ہوئے اور ساتویں سالِ جلوس میں عالم گیر کے حضور آئے۔ اضافۂ منصب سے سرفراز کیے گئے اور محتسبِ لشکر کی حیثیت سے ان کا تقرر کیا گیا۔ فتاویٰ عالم گیری کی تالیف میں بڑی علمی اور تحقیقی کوششیں کیں۔

ماثر عالم گیری سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی محمد حسین جون پوری کی وفات ۱۰۸۰ھ میں ہوئی۔ کیوں کہ جلوسِ عالم گیری کے تیرھویں سال یعنی ۱۰۸۰ھ کے واقعات کے ضمن میں لکھا گیا ہے کہ:

---

[۵۲۸] فرحت الناظرین، ص ۸۴

[۵۲۹] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷۵

قاضی محمد حسین کے انتقال کی وجہ سے سید احمد خاں پسر سید محمد قنوجی کو خدمتِ احتساب عنایت ہوئی۔ جو اہلِ دربار، حضورِ شاہی میں ہاتھ سر پر رکھ کر آداب بجالانے کے لیے جھکتے تھے، ان کو حکم ہوا کہ مسنون طریقے پر سلام کیا کریں[۱۳۰]

نزہۃ الخواطر میں ان کی وفات کے متعلق یہ الفاظ مرقوم ہیں:

مات فی الثالث عشر من جلوس عالمگیر علی سریر الملک نحو ست وسبعین والف[۱۳۱]

یعنی عالم گیر کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے تیرھویں سال ۱۰۷۶ھ کے قریب فوت ہوئے۔

نزہۃ الخواطر میں مرقوم یہ سالِ وفات صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیوں کہ عالم گیر کا تیرھواں سالِ جلوس ۱۰۷۶ھ نہیں، ۱۰۸۰ھ ہے۔ اس حساب سے ان کا سنِ وفات ۱۰۸۰ھ ہونا چاہیئے۔

۱۱۵۔ مولانا محمد حسین کشمیری

مولانا محمد حسین کشمیری، شیخ اور فاضل بزرگ تھے، علمائے مشاہیر میں سے گردانے جاتے تھے۔ پٹنہ (عظیم آباد) کے منصبِ افتا پر متعین تھے، سلسلۂ تدریس بھی جاری تھا۔ عرصہ تک اقلیم ہند کے اس شہر کی مسندِ درس و افتا پر فائز رہے۔ معارفِ دینیہ کے مختلف گوشوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور اس موضوع کے مشکل اور اہم مسائل کی عمدہ انداز سے عقدہ کشائی کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں صبح صادق کے مصنف مرزا محمد صادق اصفہانی شامل ہیں۔ اس کا ذکر انھوں نے خود ہی اپنی کتاب (صبح صادق) میں کیا ہے۔ مولانا محمد حسین کشمیری نے ۱۰۳۵ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا[۱۳۲]

---

۱۳۰ مآثر عالم گیری، ص ۹۴ ۱۳۱ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۶۴

۱۳۲ صبح صادق — نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۶۶، ۳۶۷

۱۱۶۔ مفتی محمد خلیل جون پوری

جون پور کے ایک جیّد عالمِ دین مفتی محمد خلیل بن شمس الدین صدیقی برونوی جون پوری تھے، جو شیخِ وقت اور فقیہِ عصر تھے۔ ان کے والد مفتی شمس الدین صدیقی برونوی جون پوری (متوفی ۱۰۴۷ھ) بھی فحول علما اور صنادیدِ وقت میں سے تھے، جن کے علم و فضل سے متاثر ہو کر بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر نے اپنے بیٹے پرویز کا اتالیق مقرر کیا تھا اور جو عرصہ تک الٰہ آباد اور جون پور کے مفتی رہے تھے۔ یہی مفتی شمس الدین جون پوری ہیں، جن کے سامنے صاحب "شمس البازغہ" علامہ محمود عمری جون پوری اور صاحبِ "رشیدیہ" شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری نے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل کیا تھا۔ مفتی محمد خلیل نے بھی اپنے والد سے اخذِ علم کیا اور مرتبہ فضیلت کو پہنچے۔ اس زمانے میں ظاہری علوم کے ساتھ باطنی علوم کا حصول بھی ضروری تھا اور علمائے دین تصوف و طریقت سے بھی بہرہ ور ہوتے تھے، مفتی محمد خلیل نے بھی اس طرف توجہ کی اور رشیدیہ کے مصنّف شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری سے (جو ان کے پھوپھی زاد بھائی تھے) کسبِ طریقت کیا۔ حصولِ علم کے بعد اپنے بھائی مفتی محمد صادق بن مفتی شمس الدین کی جگہ مسندِ افتا کو زینت بخشی اور عمر بھر اس منصب پر متمکن رہے۔ ساتھ ہی درس و تدریس میں بھی سرگرم رہے۔ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالمِ دین تھے۔ لوگوں کی بڑی تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ جمعرات کے روز ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۷۹ھ کو جون پور میں فوت ہوئے اور اپنے بھائی محمد صادق جون پوری کے قبرستان میں دفن کیے گئے[۳۳]

---

۳۳ تجلی نور، ج ۲، ص ۷۶ — تاریخ شیرازِ ہند جون پور، ص ۱۴۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۶۷

۱۱۷- شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری

ان کا پہلا نام محمد رشید تھا، وہ اسی کو پسند کرتے اور مراسلات و مکاتبات میں لکھتے تھے، تذکرہ نگاروں میں سے بعض حضرات انھیں عبدالرشید عثمانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور بعض محمد رشید عثمانی کے نام سے! چوں کہ شیخ خود اپنے آپ کو محمد رشید لکھتے ہیں، اس لیے ہم بھی انھیں اسی نام سے موسوم کریں گے۔

شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری گیارھویں صدی کے اقلیم ہند کے ممتاز عالمِ دین، نامور فقیہ اور مشہور مصنف تھے۔ تحقیق و تدقیق اور علوم میں بالغ نظری اور جامعیت میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ عالمِ کبیر، علامۂ دوراں اور شیخ وقت تھے۔ عدیم النظیر فقیہ اور بے مثال اصولی تھے۔ تصوف و سلوک میں بھی خاص انفرادیت کے حامل تھے۔ مشہور بزرگ شیخ کبیر سری بن مفلس سقطی عثمانی کی اولاد سے تھے۔

شیخ محمد رشید عثمانی ۱۰ ذی القعدہ ۱۰۰۰ھ کو موضع "برونہ" میں پیدا ہوئے جو اعمالِ جون پور میں ایک قریہ تھا۔ ان کی والدہ معروف عالم و صوفی شیخ نورالدین بن عبدالقادر صدیقی برونوی کی صاحب زادی تھیں۔ محمد رشید نے ننھیال میں پرورش پائی تھی اور کم عمری ہی میں حصولِ علم سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ قرآن مجید اپنے قابلِ احترام نانا شیخ نورالدین صدیقی برونوی سے پڑھا، کتابت بھی انھی سے سیکھی، علمِ صرف کی کچھ کتابیں اور علمِ نحو کی لب، الارشاد اور کافیہ کی تعلیم بھی انھی سے حاصل کی۔

مختلف مروّجہ علوم و فنون کی کتابیں شیخ قاسم، شیخ مبارک مرتضیٰ، شیخ نور محمد مداری، شیخ محی الدین بن عبدالشکور، شیخ حبیب اسحاق، شیخ جمال کاکوروی، مولانا محمد لاہوری، شیخ عبدالعزیز، سید عبداللہ، مفتی شمس الدین برونوی اور

شیخ محمد افضل عثمانی جون پوری وغیرہ سے پڑھیں - یہ حضرات اس دور کے جید علمائے کرام اور مشہور فضلائے عظام تھے، جو ملک کے مختلف مقامات میں سرگرمِ درس و تدریس تھے - سندِ حدیث شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحب زادۂ گرامی مفتی نورالحق دہلوی سے لی، ان سے صحیح بخاری، مصابیح اور مشکوٰۃ کا درس لیا - شیخ ممدوح نے تمام مروّج اور متداول علوم ملک کے عظیم القدر اساتذہ سے حاصل کیے اور ہر علم میں مرتبۂ کمال کو پہنچے - ذہن نہایت رسا پایا تھا اور قوتِ اخذ انتہائی مضبوط تھی - تمام علوم کے مختلف گوشے خاص ترتیب اور بہترین انداز کے ساتھ حافظے میں محفوظ تھے -

اس زمانے میں علمائے کرام بعض مروّج سلاسلِ تصوف کے مطابق علمِ طریقت بھی حاصل کرتے تھے اور مشہور صوفیا میں سے روحانی رشد و ہدایت کے لیے کسی بڑے صوفی کے دروازے پر دستک دیتے تھے - شیخ محمد رشید جون پوری نے بھی اخذِ طریقت کیا - ان کے والدِ گرامی شیخ مصطفیٰ عثمانی جون پوری بہت بڑے عالمِ دین اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے، ہونہار بیٹے نے زمانۂ طفولیت ہی میں عظیم باپ کی نگرانی میں سلوک کی منزلیں طے کرلی تھیں اور خرقۂ طریقت حاصل کرلیا تھا، لیکن آگے چل کر وہ اس طرح علمی و تحقیقی ہنگاموں میں سرگرم ہوئے کہ صرف اذکار و اشغال کو مرکزِ التفات ٹھہرالینا ممکن نہ رہا اور عنانِ توجہ حصولِ علم ہی کی طرف مرکوز رکھی - یہاں یہ بات لائقِ تذکرہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک شیخِ طریقت طیب بن معین بنارسی (متوفی ۸ شوال ۱۰۴۰ھ) سے بنارس کے قریب ایک گاؤں "منڈواڈیہ" میں ان کی ملاقات ہوئی، ایک روز ان کے پاس رہے اور علمی بحث و اشغال کو ترک کرکے مستقل طور پر سلوک و طریقت کی وادیوں میں داخل ہونے کی خواہش ظاہر کی، لیکن شیخ طیبؒ نے اس سے اتفاق نہ کیا اور بدستور علمی و تحقیقی مساعی کو جاری رکھنے پر زور دیا - چنانچہ شیخ محمد رشید دوبارہ جون پور آگئے اور اپنے آپ کو مزید حصولِ علم کے لیے وقف کردیا - جب علم کی تمام

اصناف میں پختہ ہو گئے تو شیخ طیب کی خدمت میں دوبارہ منڈواڈیہ گئے اور باقاعدہ اخذ طریقت کیا۔ شیخ طیب نے ۱۰۴۰ھ میں ان کو اپنا خلیفہ بنایا اور وثیقۂ خلافت مرحمت کیا۔

شیخ محمد رشید جون پوری نے طویل مدت تک ہنگامۂ درس و افادہ بپا کیے رکھا، لیکن بعد میں اُسے ترک کر کے مطالعۂ کتب حقائق میں مشغول ہو گئے۔ بالخصوص شیخ محی الدین ابن عربی کی تصنیفات کو مطمح نظر ٹھہرایا اور اس میں یہاں تک آگے نکل گئے کہ ابنِ عربی کی جو عبارات بظاہر محلِ طعن نظر آتی ہیں، ان کو محاملِ حسنہ پر محمول کرتے اور ثابت کرتے کہ وہ اپنے اندر درحقیقت اچھائی اور عمدگی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔

شیخ محمد رشید بڑے ہی خوددار اور بلند کردار عالم تھے، ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ امرا و اغنیا کے دروازوں پر جانے سے احتراز کرتے اور ان سے میل جول اور اختلاط کو علمی وقار کے منافی سمجھتے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب بادشاہِ ہند شاہ جہان کو ان کے علم وادراک کی ہمہ گیری اور جامعیت کا علم ہوا تو اس نے اپنی علم پروری اور علما دوستی کی بنا پر ان سے ملنا چاہا اور ایک مکتوب کے ذریعے اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی مگر اس بوریانشین عالم نے ہندوستان کے عظیم بادشاہ کو ملنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ وہ کسی بادشاہ یا امیر مملکت کے ہاں جانے کے لیے اپنے زاویہ اور خانقاہ سے باہر قدم نہیں نکالیں گے۔

شیخ محمد رشید کے کچھ مذہبی مختارات تھے جو کتاب وسنت کی روشنی میں ان کی تحقیق پر مبنی تھے اور شیخ ان پر سختی سے عامل تھے۔ مثلاً سرّی نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے، فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان تھوڑی دیر اضطجاع کرتے یعنی دائیں جانب لیٹتے تھے۔ وفات سے پہلے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ اس زمانے کے رواج کے مطابق موت کے بعد انھیں عمامہ نہ پہنایا جائے، نہ ایصالِ ثواب کی غرض سے کوئی چارپایہ ذبح کر کے اس کا گوشت

پکایا اور تقسیم کیا جائے، نہ تین دن سے زیادہ افسوس کیا جائے اور نہ پختہ قبر بنائی جائے، مٹی کی کچی قبر بنائی جائے۔

شیخ ممدوح اونچے مرتبے کے مصنف بھی تھے۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کتابیں تصنیف کیں۔ خاص علمی اور فنی کتابیں بھی لکھیں اور تصوف و سلوک کے بارے میں بھی کچھ کتابیں یادگار چھوڑیں۔ ان کی تصنیفات میں ایک کتاب "رشیدیہ" ہے جو فنِ مناظرہ سے متعلق ہے۔ اس کتاب کو اہلِ علم میں بڑی شہرت و قبولیت حاصل ہوئی، اسے باقاعدہ کتبِ درسیہ میں شامل کیا گیا۔ علما نے اُسے اعتنا و تلقی سے نوازا اور تعلیق و تحشیہ اور تدریس و تعلیم کے لیے منتخب کیا۔ شرح ہدایۃ الحکمۃ اور شیخ اکبر کی اسرار المخلوق پر شرح سپردِ قلم فرمائی۔ عربی زبان میں خلاصۃ النحو کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ فارسی زبان میں زاد السالکین اور مقصود الطالبین ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں شرح مختصر عضدی پر حواشی لکھے، علمِ نحو کی مشہور درسی کتاب کافیہ کا فارسی زبان میں حاشیہ لکھا، ابنِ عربی کے کلام کے بعض حصوں کا محکوم مربوط کے نام سے ترجمہ کیا۔ بہت سے اشعار پر مشتمل ان کا ایک دیوان بھی ہے۔ شمسی تخلص کرتے تھے۔ شیخ محمد رشید کے ملفوظات بھی ہیں جو شیخ نصرت جمال ملتانی نے گنج ارشدی میں جمع کیے ہیں، ان کے علاوہ شیخ مودود بن محمد حسین جون پوری نے بھی ان کے ملفوظات کا ایک مجموعہ تیار کیا ہے۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس عظیم المرتبت عالم نے ترا۸۳سی سال عمر پا کر جمعہ کے روز ۹ رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔

ان کی وفات بھی عجیب طرح واقع ہوئی۔ فجر کی سنتوں سے فارغ ہو کر فرض پڑھنے لگے تھے کہ تکبیرِ تحریمہ میں داعیِ حق کا بلاوا آگیا۔[۳۴] انا للہ وانا الیہ راجعون۔

---

[۳۴] عملِ صالح، ج ۳، ص ۲۹۱ — مآثر الکرام دفتر اول، ص ۱۹۱، ۱۹۲ — سبحۃ المرجان

۱۱۸۔ قاضی محمد زاہد کابلی

قاضی محمد زاہد حنفی کابلی، شیخ، فاضل اور علامہ تھے۔ بادشاہِ ہند جہاں گیر کے عہد میں کابل کے قاضی مقرر ہوئے اور اس کے بیٹے شاہ جہان کے عہد تک اس اہم منصب پر فائز رہے۔ بہت بڑے عالم، فقہ واصول اور علومِ عربیہ کے ماہر اور دیگر فنونِ مروجہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ نیک، متقی اور متورع تھے۔ ہر وقت خدمتِ علم میں مصروف رہتے۔ ساتھ ہی طلبا کو طریقۂ ظاہری کی تلقین بھی فرماتے اور صلاح و تقویٰ کا درس دیتے۔ شاہ جہان کے تیسرے سالِ جلوس میں فوت ہوئے، جو ۱۰۳۹ھ بنتا ہے۔[۳۵]

۱۱۹۔ شیخ محمد سعید سرہندی

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے صاحب زادے خواجہ محمد صادق تھے جو عین عالمِ جوانی میں بعارضۂ طاعون وفات پاگئے تھے۔ دوسرے خواجہ محمد سعید تھے، تیسرے بیٹے کا اسم گرامی شیخ محمد معصوم تھا۔ یہ حضرت مجدد کے دوسرے خلیفہ، عروۃ الوثقیٰ اور قیومِ ثانی تھے۔ نہایت نیک اور متقی بزرگ تھے۔ سب سے چھوٹے بیٹے شیخ محمد یحییٰ تھے، یہ شاہ جیو کے

ص ۶۶، ۶۷۔ تجلی نور، ج ۱، ص ۷۱، ۷۲۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۳ — خزینۃ الاصفیا، ص ۴۷۲، ۴۷۴ — قصار الادب من ذکر علماء النحو والادب، ص ۱۹۹، ۲۰۰ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۱۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۶۷ تا ۳۷۰ — فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۸۴، ۸۵ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۸ — تاریخ شیراز ہند، جون پور، ص ۶۴۶ تا ۶۴۸ — برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ، ص ۳۰۳ تا ۳۰۵ [۳۵] عملِ صالح، ج ۱، ص ۲۴۸، ۲۴۹ — بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۳۴۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۷۱

عرف سے معروف تھے۔

شیخ محمد سعید ماہِ شعبان ۱۰۰۵ھ میں سرہند میں پیدا ہوئے اور بعض کتبِ درسیہ اپنے بڑے بھائی شیخ محمد صادق سے پڑھیں۔ زیادہ تر کتابیں شیخ محمد طاہر لاہوری سے پڑھی تھیں۔ اپنے والد حضرت مجدد الف ثانی سے بھی تحصیل کی۔ ان سے اور شیخ عبدالرحمٰن رمزی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ طویل عرصے تک اپنے والدِ محترم سے وابستہ رہے اور ان سے اخذِ طریقت کیا۔ شیخ مجدد نے آخر عمر میں ان کو طریقت و سلوک کی منزلیں طے کرانے کی غرض سے درس و تدریس کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرا یہ بیٹا علمائے راسخین میں سے ہے۔ انھیں خرقۂ طریقت و خلافت عطا کیا اور "خازنِ رحمت" کے لقب سے ملقب فرمایا۔ لیکن والد کی وفات کے بعد شیخ محمد سعید مسندِ مشیخت سے علیحدہ ہو گئے تھے اور یہ خدمت اپنے چھوٹے بھائی شیخ محمد معصوم کے سپرد کر دی تھی۔ اس کے بعد ارضِ حجاز گئے اور حج و زیارت کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ پھر ۱۰۶۹ھ کو واپس ہندوستان تشریف لائے اور تدریس و تلقین میں مصروف ہو گئے۔

شیخ محمد سعید سرہندی اپنے عظیم باپ حضرت مجدد الف ثانی کے تربیت یافتہ تھے اور عالم و فاضل، محدث و فقیہ اور شیخ و مصلح تھے۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ مشکوٰۃ کا حاشیہ سپردِ قلم کیا اور جن احادیث کو ائمہ حنفیہ اپنا ماخذ قرار دیتے ہیں، ان کی تحقیق اور مسائلِ حنفیہ کے اثبات میں بے حد محنت کی —— اس ضمن میں زبدۃ المقامات میں مرقوم ہے

مشکوٰۃ المصابیح کہ دراں بہ تحقیق صحت و قوت آں احادیث کہ ماخذ ائمہ حنفیہ است، غایت سعی مبذول داشتہ اند[۳۶]

ایک رسالہ تشہد میں عدمِ رفع سبابہ کے موضوع پر لکھا۔ اس مسئلے میں

---

[۳۶] زبدۃ المقامات، ص ۳۱۰

مذہب حنفیہ کی تائید کی ہے۔ شرح عقائد کے حاشیۂ خیالی پر ایک حاشیہ تحریر کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کتابیں تصنیف کیں۔ مختلف اہم علمی شخصیتوں اور اربابِ حکومت کے نام مکتوبات تحریر کیے، بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے نام بھی کئی خط لکھے۔ مکتوبات کا مجموعہ "مکتوباتِ سعیدیہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

بہر حال شیخ محمد سعید سرہندی اپنے دور کے نامور عالم اور مشہور صاحبِ سلوک بزرگ تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور دیگر علوم متداولہ کے ماہر تھے۔ درس و تدریس میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ تفسیر بیضاوی، عضدی اور شرح حکمۃ العین وغیرہ باقاعدہ طلبا کو پڑھاتے تھے۔ ۲۷ جمادی الاخری ۱۰۷۰ھ کو فوت ہوئے۔[۵۳۷]

۱۲۰- شیخ محمد سعید ہندی

شیخ الحاج محمد سعید ہندی، اپنے عصر کے فاضل اور علامہ تھے، تحقیق و تدقیقِ مسائل میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ متورّع اور متقی عالمِ دین تھے۔ معارفِ الٰہیہ کے ماہر تھے۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور بعض متفقہین نے عمامہ اور طیلسان پہننے کا جو التزام کر رکھا تھا، اس کی پرواہ نہ کرتے تھے، نہ اس قسم کے تکلفات کے عادی تھے۔ احتیاط اور تورّع کا یہ عالم تھا کہ اپنے والد کے گھر کا کھانا نہیں کھاتے تھے، اس لیے کہ وہ بادشاہ کی سلک ملازمت میں منسلک تھے اور یہی خدمتِ شاہی ان کی آمدنی کا ذریعہ تھی۔ والد کی وفات کے بعد ان کو مالِ وراثت کا حصہ ملا، اسی وقت سفرِ حجاز پر روانہ ہو گئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ ہندوستان واپس آئے تو درس و افادہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ملوک و سلاطین

---

۵۳۷ تفصیل کے لیے دیکھیے: زبدۃ المقامات، ص ۳۰۸ تا ۳۱۵ — حضرات القدس — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۹۰، ۲۷۵ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۱۷ — رودِ کوثر، ص ۳۳۳ تا ۳۳۶ — نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۳۶، ۳۳۷ — خزینۃ الاصفیا، ص ۶۲۸، ۶۲۹ — فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۵۲ تا ۵۴۔

کے درباروں میں بالکل نہ جاتے تھے اور علمی و تدریسی کام میں مشغول رہتے تھے۔ اُس زمانے میں شاہ جہان تختِ ہند پر متمکن تھا، وہ ان کا بہت معتقد اور ان کے فضل و کمال کا مداح تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ان سے ملنا چاہا اور علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کو انھیں بلانے کے لیے بھیجا مگر انھوں نے دربار میں جانے اور بادشاہ سے ملنے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، بیضاوی کے کئی اجزا پر حاشیہ لکھا[۳۸]۔

۱۲۱۔ مفتی محمد شریف الٰہ آبادی

مفتی محمد شریف حسینی الٰہ آبادی کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ شہر الٰہ آباد کے منصبِ قضا پر متمکن تھے۔ جامع صفات عالم اور منبعِ فیوض شیخ تھے۔ علم و عمل، صلاح و تقویٰ، ورع و عفاف اور حسنِ اخلاق و کردار کے حامل تھے۔ دینی و شرعی معاملات میں صلابت ان کی خصوصیت تھی۔ احکامِ الٰہی کے اجرا میں جری اور بے خوف تھے، اس سلسلے میں کسی قسم کی مداہنت اور نرمی کے قائل نہ تھے۔ بڑے سے بڑے سخت گیر اور ظالم حکمران کے سامنے بھی اللہ کے فرمان بلا جھجک بیان کرتے اور اس کی سختی کو بالکل خاطر میں نہ لاتے ــــــ ماہِ صفر ۱۰۳۵ھ میں الٰہ آباد میں فوت ہوئے اور وہیں اپنے گھر میں دفن کیے گئے[۳۹]۔

۱۲۲۔ قاضی محمد شریف صدیقی گجراتی

قاضی محمد شریف بن محمد فرید صدیقی گجراتی، حنفی المسلک تھے۔ علاقہ گجرات

---

[۳۸] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۷۲

[۳۹] ایضاً، ص ۳۷۴ ــــــ وفیات الاعلام از شیخ محمد یحییٰ عباسی

کے شیخ، فاضل اور عالمِ کبیر تھے، فقہ و اصول کے ماہر علما میں سے تھے۔ گجرات کی مسندِ درس و افادہ پر فائز تھے۔ شیخ احمد بن سلیمان گجراتی (متوفی ۱۶ شعبان ۱۰۲۴ھ) نے اکثر کتبِ درسیہ انھی سے پڑھی تھیں۔[۹۴]

۱۲۳۔ علامہ محمد شفیع یزدی

علامہ محمد شفیع یزدی، کتبِ رجال اور تذکروں میں ملا شفیعا یزدی کے نام سے معروف ہیں۔ یہ اقلیمِ ہند کے مشہور فضلا میں سے تھے۔ ۱۰۶۰ھ کو شاہ جہان بادشاہ کے زمانے میں تجارت اور سیاحت کی غرض سے بحری راستے سے ہندوستان آئے اور سورت میں داخل ہوئے۔ آتے ہی ملک کے حلقۂ علما میں مشہور ہو گئے۔ جب ان کے فضل و کمال کی شہرت بادشاہ تک پہنچی اور اسے پتا چلا کہ شفیعا یگانۂ روزگار اور عراق و خراسان کے نامور علما میں سے ہیں تو وہ واپس وطن جانے کے لیے سورت کی بندرگاہ میں پہنچ چکے تھے۔ بادشاہ نے سفرِ خرچ اور زادِ راہ کے لیے پانچ ہزار روپے دے کر آدمی بھیجے، بہت ہی خواہش اور اعزاز کے ساتھ اپنے ہاں بلایا اور بے حد احترام و تکریم سے پیش آیا۔ بڑی نوازشیں کیں اور مال و دولت سے نوازا۔

اس زمانے میں حکمرانوں کو علما کے درمیان مباحثوں اور مناظروں کی مجلسیں منعقد کرانے کا بہت شوق تھا۔ شاہ جہان چوں کہ خود صاحبِ علم و فضل تھا، اس لیے اس نے دیارِ ہند کے جن بڑے بڑے علما سے ذاتی تعلقات استوار کر رکھے تھے، ان میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو اوّلین درجہ حاصل تھا، مولانا سیالکوٹی ممتاز عالم اور نہایت محقق و مدقق بزرگ تھے۔ بادشاہ نے ملا شفیعا یزدی کے امتحان اور مناظرے کے لیے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو بلایا۔ بلاشبہ دونوں بے مثال فاضل تھے

---

[۹۴] مرآۃ احمدی، ج ۲، ص ۶۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۰۵

مجلسِ مباحثہ شروع ہوئی، دونوں کے درمیان سورۂ فاتحہ کی آیت: اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تفسیر پر گفتگو کا آغاز ہوا۔ حکم اور ثالث علامی سعد اللہ خاں کو مقرر کیا گیا جو شاہ جہان کے وزیر اور برصغیر کے جلیل القدر عالم اور ناموِر فضلا تھے۔ دونوں فضلائے عصر کے درمیان معیاری گفتگو ہوئی اور دلچسپ علمی نکتے بیان کیے گئے۔

شاہ جہان بادشاہ نے ملا شفیعا یزدی کے اسلوبِ کلام اور اندازِ تقریر کو بہت پسند کیا اور ان کی جامعیتِ علم سے متاثر ہو کر مقربینِ دربار میں شامل فرمایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں بڑی نوازشیں ہوئیں اور فراوانیٔ علم و فضل کی بنا پر دانشمند خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ تین ہزاری منصب اور بخشی گری کی خلعت سے نوازے گئے۔ ان کے مناصب میں برابر اضافہ ہوتا رہا، پانچ ہزاری منصب کو پہنچے شاہ جہان کے آخری ایامِ حکومت میں ملا محمد شفیع یزدی ان مناصب اور خدمتِ شاہی سے الگ ہو گئے تھے اور دہلی میں گھر کے گوشۂ عافیت میں بیٹھ گئے تھے۔

شاہ جہان کے بعد اورنگ زیب عالم گیر تخت نشین ہوا تو ملا شفیعا یزدی پھر جلوہ گر ہوئے اور عالم گیر کی نوازشہائے بیہم کے مستحق قرار پائے، ۱۰۷۸ھ کو امیر بخشی گری کے عہدے پر فائز کیے گئے اور تا زندگی یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ علاوہ ازیں مسلسل چار ہزاری اور پانچ ہزاری منصب کو پہنچے۔ بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے ان سے بعض علمی اور دینی کتابیں پڑھیں۔ امام غزالی کی احیاء علوم الدین شروع سے آخر تک پوری پڑھی۔ گویا یہ اورنگ زیب بادشاہ کے استاد تھے۔

علامہ محمد شفیع یزدی (دانشمند خاں) کے علم و فضل اور بحرِ تحقیق میں غواصی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندو، عیسائی اور افرنگی اہلِ علم کثیر تعداد میں ان کی خدمت میں آتے، ان کی جامعیتِ علم سے مستفید ہوتے اور مختلف علوم و فنون کے بارے میں مذاکرات کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس طرح ان کا حلقۂ تعارف اور دائرۂ اثر بہت بڑھ گیا تھا اور وہ اہلِ علم کے لیے مرکز و مرجع کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔

فلسفہ، تاریخ اور عمرانیات میں بالخصوص وسیع المعلومات اور کثیر المطالعہ تھے، اور مختلف زبانوں کے جید عالم اور بہت بڑے فاضل۔!

ارضِ ہند کے اس نامور حکیم و مفکر اور ممتاز عالمِ دین نے ۱۰ ربیع الاول ۱۰۸۱ھ کو عہدِ عالم گیری میں وفات پائی۔[۱۴۱]

۱۲۴۔ مولانا محمد صادق جون پوری

مولانا محمد صادق بن ابوالبقا بن محمد درویش حسینی واسطی جون پوری کی جائے ولادت اور مقامِ نشو و نما جون پور ہے۔ اپنے والد شیخ ابوالبقا سے تحصیل کی اور اونچے مرتبے کے علما و فضلا میں شمار ہوئے۔ بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر سے تقرب حاصل ہوا تو اس نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے محمد معظم کا معلم مقرر کر دیا، شہزادہ محمد معظم عرصہ تک ان سے مشغولِ تعلیم رہا۔ پھر جب وہ وارثِ ہند ہوا تو انھیں جہاں گیر نگر (ڈھاکہ) میں ایک قطعہ اراضی عنایت کیا اور وہ وہاں سے (ڈھاکہ) چلے گئے۔

علوم و فنون پر ان کی گہری نظر تھی، چنانچہ "شرح زنجانی" اور "شرح مائۃ عامل" کتابیں لکھیں۔ فنِ مناظرہ میں "الآداب الصادقۃ" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ رام پور (ہندوستان) میں موجود ہے۔ فنِ مناظرہ کی ایک اور کتاب "العضدیہ" پر حاشیہ تحریر کیا ـــــ اس عالمِ دین نے ڈھاکہ میں وفات پائی، جس کو اس زمانے میں "جہاں گیر نگر" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔[۱۴۲]

---

[۱۴۱] عملِ صالح، ج ۳، ص ۲۹۸، ۲۹۹ ـــــ فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۹۵، ۹۶ ـــــ مآثر عالم گیری، ص ۹۶ ـــــ مآثر الامرا، ج ۲ (اردو ترجمہ)، ص ۲۹ تا ۳۱ ـــــ بزمِ تیموریہ، ص ۲۲۶، ۲۲۷ ـــــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۷۵، ۲۷۶ ـــــ برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ، ص ۲۵۳، ۲۵۴

[۱۴۲] تاریخ خیراز ہند جون پور، ص ۲۹، ۳۰، ۷۰ ـــــ تجلی نور، ج ۲، ص ۶۵ ـــــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۵۱۔

۱۲۵۔ مفتی محمد صادق جون پوری

مفتی محمد صادق بن شمس الدین صدیقی برونوی جون پوری، فقہی مسلک کی رو سے حنفی تھے۔ بعض کتبِ درسیہ اپنے والدِ مکرم مفتی شمس الدین صدیقی برونوی جون پوری (متوفی ۱۰۴۷ھ) سے پڑھیں۔ زیادہ تر درسی کتابوں کی تعلیم کے لیے علامہ محمود عمری جون پوری (متوفی ۹ ربیع الاوّل ۱۰۶۲ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، اور اپنے عصر اور علاقے کے مشاہیر علما و فقہا میں سے گردانے گئے۔ بحث و اشتغال میں انتہائی محنت سے کام لیتے تھے، علم کی تمام شاخوں سے بہرہ ور تھے۔ فتویٰ اور تدریس کی اعلیٰ صلاحیتیں ان میں پائی جاتی تھیں، اسی بنا پر اپنے رفیع القدر والد مفتی شمس الدین صدیقی جون پوری کی جگہ مسندِ افتا پر فائز کیے گئے۔

شیخ محمد صادق جون پوری، ورع و تقویٰ کے زیور سے آراستہ، قناعت و عفاف کی دولت سے مالا مال اور عبادت و تدیّن کے پیکر تھے۔ ہر وقت سرگرمِ درس و افادہ رہتے۔ مدرسہ اور مسجد کے سوا اور کہیں نہ جاتے۔ کسی سے کوئی شے بطور نذرانہ یا تحفہ قبول نہ فرماتے۔ ایک مرتبہ ان کے والد مفتی شمس الدین جون پوری کے ایک شاگرد، رکن الدین نے جو مدت کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور شائستہ خاں کے ندیموں میں سے تھے، ایک کشمیری شال تحفۃً پیش کی۔ یہ شال وہ اپنے شہر سے خاص جذبۂ عقیدت کے ساتھ ان کے لیے لائے تھے، مگر انھوں نے لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا:

من دلق را با طلسِ شاہاں نمی خرم۔

[میں اپنی گدڑی میں اس شاہی اطلس سے زیادہ خوش ہوں۔ فقیر کو گدڑی کافی ہے۔]

زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ مشہور عالم اور اپنے استاذ علامہ محمود عمری جون پوری کے پیچھے نماز نہ پڑھتے تھے، کیوں کہ علامہ محمود فلسفہ اور اس کے متعلقات میں انتہائی غلو اور انہماک رکھتے تھے۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ جون پور کے امیرِ شہر نواب اللہ وردی خاں نے ان کو ایسے کاغذات پر مہرِ افتا ثبت کرنے کا حکم دیا، جن کے مندرجات غیر مشروع تھے، مفتی محمد صادق نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ امیر کو بڑا غصہ آیا اور انتقام لینے کے لیے بات دل میں رکھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ اللہ وردی خاں ایک سفر میں انھیں ساتھ لے گیا اور کشتی میں سوار کیا، خود بھی اسی کشتی میں سوار ہوا۔ کشتی جب وسطِ دریا میں پہنچی تو وہی کاغذات نکالے اور جبراً مہر تصدیق ثبت کرانا چاہی۔ مفتی ممدوح نے مجبوراً مہر امیر مذکور کے حوالے کر دی، لیکن جب امیر کاغذات پر مہر ثبت کرنے لگا تو کوشش کے باوجود مہر نمایاں نہ ہوئی۔ امیر نہایت شرمندہ ہوا اور ان کے ورع و تقویٰ کا اعتراف کیا۔

مفتی محمد صادق جون پوری نے ۴ ذی الحجہ ۱۰۶۸ھ کو جون پور میں وفات پائی۔[۵۴۳]

۱۲۶- شیخ محمد صادق گنگوہی

شیخ محمد صادق بن فتح اللہ حنفی گنگوہی، دیارِ ہند کے مرکزِ علم و فضل بلدۂ گنگوہ کے باشندے تھے اور کبارِ مشائخ چشتیہ میں سے تھے۔ ولادت اور نشو و نما گنگوہ ہی میں ہوئی، اپنے عمِ محترم شیخ ابوسعید حنفی گنگوہی سے اخذِ طریقت کیا۔ ان کے بعد مسندِ ارشاد سنبھالی۔ بہت سے حضرات نے ان سے حصول علم اور کسبِ فیض کیا۔ اپنے زمانے کے شیخ صالح اور نامور فقیہ تھے۔ ۱۰۳۶ھ کو گنگوہ میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔ خزینۃ الاصفیا میں سنِ وفات ۱۰۳۶ھ مرقوم ہے اور نزہۃ الخواطر میں ۱۰۵۸ھ۔[۵۴۴]

---

۵۴۳ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۳۹، ۴۰، ۷۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۷۷

۵۴۴ خزینۃ الاصفیا، ص ۴۵۹، ۴۶۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۷۷، ۳۷۸

۱۲۷۔ مولانا محمد صادق کشمیری

مولانا محمد صادق بن مولانا کمال الدین کشمیری، اپنے عصر اور شہر کے شیوخ میں سے تھے۔ فقہ میں حنفی مسلک رکھتے تھے۔ دیارِ کشمیر اور خطۂ ہند کے معروف عالم و مدرس مولانا کمال الدین کشمیری سیالکوٹی کے فرزند تھے، جامع علوم عقلیہ و نقلیہ اور مرتبۂ تحقیق و تدقیق پر فائز تھے۔ فروعِ مذاہب پر عمیق نظر رکھتے تھے۔ منطق و حکمت اور طب کے ماہر تھے، فصیح البیان تھے اور مسائل شرعیہ کی عمدہ انداز سے وضاحت کرتے تھے۔ جہاں گیر بادشاہ نے ان کے علم و فضل کا شہرہ سنا تو دربارِ شاہی میں باریاب کیا اور اکابر علما کی صف میں جگہ دی۔ جب علمائے اہلِ سنت اور علمائے شیعہ کے درمیان مباحثے و معارضے کا سلسلہ شروع ہوا تو اہلِ سنت کی طرف سے شیعہ عالم ملا حبیب اللہ سے مناظرے کے لیے علمائے اہلِ سنت نے مولانا محمد صادق ہی کو منتخب کیا، اور دلائل کے زور سے اپنے حریف ملا حبیب اللہ کو خاموش کرا دیا۔ مولانا محمد صادق کشمیری "ملا محمد صادق دانا" کے عرف سے معروف تھے۔ کشمیر میں وفات پائی۔

مناظرے کا یہ واقعہ مولوی فقیر محمد جہلمی نے حدائق الحنفیہ میں نقل کیا ہے اور اس کے حوالے سے علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی نے بھی مولانا محمد صادق کشمیری کی طرف منسوب کیا ہے، جب کہ تاریخ کشمیر اعظمی کے مصنفِ کشمیر خواجہ محمد اعظم کا کہنا ہے کہ جہاں گیر سے مولانا کمال الدین کشمیری کے فرزند مولانا محمد رضا نے تعلقات استوار کیے تھے، وہی "حکیم دانا" کے عرف سے معروف تھے اور شیعہ عالم ملا حبیب اللہ سے مناظرہ بھی انھی نے کیا تھا۔

صاحب تاریخِ کشمیر اعظمی نے مولانا محمد صادق کا ذکر "خواجہ محمد صادق سود" کے نام سے کیا ہے، انھیں کشمیر کے اکابر علما میں سے گردانا ہے اور لکھا ہے کہ وہ فقرا اور صوفیا کی صحبت میں رہنے لگے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کی مصاحبت

بھی اختیار کر لی تھی۔ حضرت مجدد نے دو ایک مکتوب بھی ان کے نام تحریر فرمائے تھے۔ طبعِ موزوں رکھتے تھے اور کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے[۵۴۵]

ہمارے خیال میں اس سلسلے میں تاریخ کشمیر کے مصنفِ شہیر کی روایت کو ترجیح دینی چاہیے۔ مگر ہم نے یہاں دونوں روایتیں بیان کر دی ہیں۔

۱۲۸- شیخ محمد صالح سندھی

شیخ محمد صالح بن ابراہیم سندھی ثم لاہوری، شیخ صالح اور فقیہ نامور تھے۔ علم و معرفت کے یگانۂ روزگار مشائخ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ بعض درسی کتابوں کی تحصیل مفتی رزق اللہ سے اور اکثر کتابوں کی دیگر علمائے مشاہیر سے کی تھی۔ پھر خواجہ باقی باللہ کے فرزند خواجہ عبداللہ سے وابستگی اختیار کر لی اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ لاہور میں اقامت گزین رہے۔ حسنِ اخلاق کے حامل تھے، اہلِ علم میں بڑے مشہور اور مقبول تھے[۵۴۶]

۱۲۹- شیخ محمد طاہر لاہوری

شیخ محمد طاہر بلدۂ لاہور کے مشاہیرِ افاضل میں سے تھے۔ مسلکاً حنفی تھے۔ خطۂ لاہور میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں تربیت پائی۔ قرآنِ مجید حفظ کیا اور علمائے لاہور سے تحصیلِ علم کی۔ حصولِ علم کے بعد شیخ اسکندر بن عماد کیتھلی سے بیعت ہوئے۔ بعد ازاں شیخ عبدالاحد سرہندی کی صحبت اختیار کی۔ پھر ان کے نامور فرزند حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے منسلک ہوئے اور اخذِ

---

۵۴۵ تاریخِ کشمیر اعظمی، ص ۱۳۳، ۱۳۴ —— حدائق الحنفیہ، ص ۴۲۸ —— نزہتہ الخواطر، ج ۵، ص ۳۷۸

۵۴۶ نزہتہ الخواطر، ج ۵، ص ۳۸۰ بحوالہ امرادیہ

طریقت کیا۔ لاہور ہی کو مسکن ٹھہرائے رکھا اور درس و افادہ میں مشغول رہے۔ ان کے سلسلۂ درس و تدریس کی بڑی شہرت تھی۔ مجدد الف ثانی کے بیٹوں ــــ شیخ محمد صادق، شیخ محمد سعید اور شیخ محمد معصوم سرہندی ــــ نے بھی ان سے اخذِ علم کیا۔ علما کی کثیر تعداد ان سے مستفید ہوئی۔

شیخ محمد طاہر لاہوری، قانع و عفیف اور متوکل علی اللہ بزرگ تھے۔ عمر بھر گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر استفادے کا سلسلہ جاری رکھا، کبھی کسی صاحبِ ثروت اور امیرِ مملکت کے دروازے پر دستک نہیں دی۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابوں کی کتابت و تصحیح اور تحشیہ نویسی میں مصروف رہتے، ان کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی وہی ذریعۂ اکل و شرب تھا ــــ لاہور کے اس پیکرِ زہد و تقویٰ عالم و فقیہ نے ۲۰ محرم ۱۰۴۰ھ کو لاہور میں وفات پائی[۲۴۷]

۱۳۰۔ مفتی محمد طاہر کشمیری

مفتی محمد طاہر کشمیری، حنفی تھے، اپنے عصر اور خطۂ کشمیر کے عالم و فقیہ اور شیخ تھے۔ فقہ، اصول اور علوم عربیہ میں منفرد شخصیت تھے۔ خطۂ کشمیر کے منصبِ افتا پر متعین تھے[۲۴۸]

۱۳۱۔ شیخ محمد عاشق ہندی

شیخ محمد عاشق بن عمر ہندی، فضل و کمال میں مشہور تھے۔ مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری سے حدیث پڑھی۔ عالم اور فقیہ بزرگ تھے۔ صاحبِ

---

۲۴۷ زبدۃ المقامات، ص ۳۴۰ ــــ خزینۃ الاصفیا، ص ۵۸۵ تا ۵۸۷ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۸۱ ــــ تحقیقاتِ چشتی، ص ۲۹۰ تا ۲۹۴

۲۴۸ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۸۲

تصنیف بھی تھے۔ شمائل ترمذی کی بڑی لطیف اور عمدہ شرح لکھی۔ ۱۰۳۳ھ کو فوت ہوئے [۴۹]

۱۳۲۔ میر محمد علی کشمیری

میر محمد علی بن محمد نازک حسینی قادری کشمیری، شیخ صالح اور خیر و فضل سے متصف فقہائے ہند میں سے تھے۔ ارضِ کشمیر میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی او اپنے والد گرامی قدر شیخ محمد نازک سے علمِ فقہ حاصل کیا۔ سلسلۂ قادریہ کے مطابق ان سے اخذِ طریقت بھی کیا۔ پھر عازمِ سرہند ہوئے۔ اس زمانے میں مجدد الف ثانی کے فرزند شیخ محمد معصوم سرہندی کی مسندِ رشد و ہدایت آراستہ تھی، ان سے طریقہ نقشبندیہ کے مطابق کسبِ فیض کیا۔ بعد ازاں کشمیر کو مراجعت فرمائی اور خود ارشاد و ہدایت کی مسند بچھائی، ان سے بہت سے مشائخ کرام نے استفاضہ کیا۔ ۱۰۷۲ھ کو سرزمینِ کشمیر میں فوت ہوئے [۵۰]

۱۳۳۔ مولانا محمد فاضل بدخشی

مولانا محمد فاضل بدخشی لاہوری، عین القضاۃ ہمدانی کی اولاد سے تھے۔ روستاق کے باشندے تھے جو اعمالِ بدخشاں میں واقع ہے، اسی علاقے کے مختلف مقامات کے علما سے علم حاصل کیا۔ پھر کابل گئے جہاں مولانا محمد صادق حلوائی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بعد ازاں عازمِ توران ہوئے، وہاں اس عہد کے مشہور فاضل مرزا جان شیرازی اور ان کے تلمیذِ رشید ملا کوسج سرگرم تدریس تھے، بہت سی کتابوں کی ان سے تحصیل کی۔ پھر واردِ ہند ہوئے اور

---

[۴۹] حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۴ ـــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۸۲، ۳۸۳

[۵۰] خزینۃ الاصفیا، ص ۹۸۹ ـــ ایضاً، ص ۳۸۳

لاہور تشریف لائے، لاہور میں شیخ جمال الدین تلوی لاہوری کا ہنگامۂ درس و افادہ بپا تھا، ان سے تفسیر اور اصول وغیرہ کی کتابیں پڑھیں اور علم و فضل کے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ تختِ ہند پر اس زمانے میں نور الدین محمد جہاں گیر متمکن تھا۔ مولانا محمد فاضل نے اس سے ملاقات کی، اس نے ان کے علم و فضل کی وجہ سے صوبہ پنجاب کی صدارت مرحمت فرمائی۔ اس کے لشکر کے میر عدل مقرر ہوئے۔ شاہ جہان بادشاہ کے آٹھویں سالِ جلوس تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر غالباً ۱۰۴۴ھ کو اس خدمت سے استعفا دے دیا اور بادشاہ کی طرف سے جو وظیفہ ملتا تھا یا جو قطعۂ اراضی حاصل تھا، اسی پر قانع ہو گئے۔

درس و تدریس ان کا مشغلہ تھا، فاضلِ کبیر اور علامۂ عصر تھے، کتابوں پر گہری نظر تھی۔ علما و طلبا کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۰۵۰ھ کو لاہور میں وفات پائی اور اسی شہر میں مدفون ہوئے[۵۱]۔

۱۳۴ - مولانا محمد قلی دہلوی

مولانا محمد قلی بن رستم نقشبندی کا مولد و مسکن دہلی ہے۔ شیخ عبدالباقی (باقی باللہ) کے نامور فرزند شیخ عبداللہ سے اخذِ علم اور کسب طریقت کیا۔ طویل مدت تک ان سے منسلک رہے۔ شیخ صالح اور متورع عالمِ دین تھے۔ "سراج المشکوٰۃ" ان کی تصنیف ہے، جس میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی "اشعۃ اللمعات" کے فوائد و نوادر جمع کیے گئے ہیں — ۱۰۷۳ھ کو فوت ہوئے[۵۲]۔

---

[۵۱] بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۳۴۰ — عملِ صالح، ج ۳، ص ۲۹۹ — مرآۃ العالم (قلمی) — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۸۴ — فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۲۰۶ — مآثر الامرا، ج ۱، ص ۴۸۳

[۵۲] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۸۶ بحوالہ اسراریہ

۱۳۵- شیخ محمد معصوم سرہندی

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے بیٹے شیخ صادق تھے جو عالمِ جوانی میں بہ عارضۂ طاعون وفات پاگئے تھے۔ بہت نیک، متقی اور عامِ دین تھے۔ دوسرے بیٹے شیخ محمد سعید تھے، جو شعبان ۱۰۰۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۷۰ھ کو وفات پاگئے۔ ان کا مرتبۂ علم وفضل اور مقامِ زہد و تقویٰ بہت بلند تھا، تیسرے فرزند شیخ محمد معصوم تھے، جو ۱۱ شوال ۱۰۰۷ھ (یا ۱۰۰۹ھ) کو متولّد ہوئے۔ نہایت زاہد، متقی اور پرہیزگار تھے۔ علم و فضل کی دولت سے بھی بہرۂ وافر رکھتے تھے۔ علوم و معارف، اندازِ بیان، اسلوبِ کلام، تدیّن و تورّع، ہر بات میں اپنے جلیل القدر والد (شیخ احمد سرہندی) سے مشابہ تھے۔ چھوٹی عمر ہی میں حصولِ علم میں مشغول ہوگئے تھے۔ گھر میں علم کی نہر جاری تھی اور تصوف و طریقت کا چشمہ بہہ رہا تھا، جس سے لاتعداد لوگ فیض پارہے تھے۔ شیخ محمد معصوم نے بھی حصولِ علم و اخذِ فیض کا اوّلین سلسلہ گھر سے شروع کیا۔ بعض درسی کتابیں اپنے برادرِ کبیر شیخ محمد صادق سے پڑھیں اور زیادہ کتابوں کا درس اپنے عظیم المرتبت والد اور شیخ محمد طاہر لاہوری سے لیا۔

مجدد الف ثانی نے اپنے اس بیٹے کو تقویٰ و تدین اور علم و فضل کے مقاماتِ عالیہ پر فائز ہونے کی بشارت دی تھی۔ باپ کی وفات کے بعد مسندِ ارشاد پر بیٹھے، حج و زیارت کی سعادت حاصل کی اور عرصے تک مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ حج کے بعد واپس ہندوستان آئے اور درس و افادہ میں مشغول ہوگئے۔ عمر بھر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ زیادہ تر تفسیر بیضاوی، مشکوٰۃ، ہدایہ، عضدی اور تلویح پڑھاتے تھے۔

شیخ محمد معصوم سرہندی کی مساعی فیض و ہدایت کا سلسلہ بہت وسیع تھا، ان کی علمی و روحانی تگ و تاز سے جہالت کے اندھیرے ختم ہوئے اور علم کی

روشنی پھیلی، بدعات کا زور ٹوٹا اور سنت کی راہیں نمایاں ہوئیں۔ کئی لاکھ افراد ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے اور اللہ و رسول کے احکام کی اتباع کرنے لگے۔ ان کے مکتوبات بھی ہیں جو تین مجلدات میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے والد کے مکتوبات کی طرح تصوف کے اسرار و لطائف اور شریعت کے احکام و اوامر کو متضمن ہیں۔

شیخ محمد معصوم نے ۹ ربیع الاوّل ۱۰۷۹ھ کو سرہند میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔[۵۵۳]

۱۳۶۔ مولانا محمد مومن ترمذی

مولانا محمد مومن بن عبداللہ حسینی ترمذی، مشہور خطاط، بہت بڑے فاضل، بہترین شاعر اور فقہ و اصول کے جیّد عالم تھے۔ شاہ جہاں بادشاہ نے ان کی قابلیت و صلاحیت کی بنا پر اپنے پوتے شہزادہ سلیمان بن داراشکوہ کا معلم مقرر کیا۔ جب کبر سنی کو پہنچ گئے اور اسّی سال کی عمر ہو گئی تو اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ان کا ایک دیوانِ شعری بھی ہے۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۰۹۰ھ کو عہدِ عالم گیری میں وفات پائی۔[۵۵۴]

۱۳۷۔ قاضی محمد مودود جون پوری

قاضی محمد مودود بن محمد حسین جون پوری، ۱۰۵۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں حصولِ علم کو مرکزِ توجہ ٹھہرالیا۔ حصولِ علم کے بعد صاحبِ رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری سے اخذِ طریقت کیا اور ایک ضخیم کتاب کی صورت میں ان کے ملفوظات

---

۵۵۳ تفصیل کے لیے دیکھیے: زبدۃ المقامات، ص ۳۱۵ تا ۳۲۶ ــــ فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۱۸۵ تا ۱۸۶

۵۵۴ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۰ بحوالہ مرآۃ العالم

بھی جمع کیے، ملفوظات کی جمع و ترتیب کا سلسلہ ۱۴ صفر ۱۰۷۴ھ کو شروع کیا تھا، جو ۵ ربیع الثانی ۱۰۷۵ھ میں ختم کیا۔ جلیل القدر عالم اور مشہور فاضل تھے۔ فقہ، اصولِ فقہ اور علومِ عربیہ کے ماہر تھے۔ اپنے والد شیخ محمد حسین جون پوری کی زندگی ہی میں بادشاہ کی طرف سے جون پور کے محکمہ قضا پر متعین ہونے کی درخواست کی گئی۔ لیکن اس منصب کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ باپ کو پتا چلا تو بیٹے کو ڈانٹا اور دھمکی دی کہ اگر بادشاہ کی جانب سے پیش کردہ منصبِ قضا قبول نہ کیا تو وہ انھیں گھر سے نکال دیں گے اور قطع تعلق کر لیں گے۔ قاضی محمد مودود نے باپ کے دباؤ میں آکر قضا کا عہدہ قبول تو کر لیا لیکن جب بادشاہ کے حضور پیش ہوئے تو وہ مراسمِ تعظیم ادا نہ کیں جو بادشاہوں کے سامنے ادا کی جاتی تھیں، سنت کے مطابق سلام کیا۔ پھر جب باقاعدہ عہدۂ قضا سنبھال لیا تو چنگی محصول کی وصولی ختم کر دی، حدودِ جون پور میں مال پر جو ٹیکس لیے جاتے تھے، وہ معاف کر دیے اور یہ سب بادشاہِ ہند سے باقاعدہ اجازت لے کر کیا۔ جون پور میں مسجدیں تعمیر کیں، ہر مسجد میں امام، موذن اور خادم مقرر کیے اور انھیں معقول تنخواہیں اور وظیفے دینے کا فیصلہ کیا۔ قاضی محمد مودود نے ایک کام یہ کیا کہ موذنوں کو جمعے کی پہلی اذان کہنے سے منع کر دیا لیکن اس ممانعت کی بہ ظاہر کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

قاضی محمد مودود جون پوری نے ۶ شوال ۱۰۸۷ھ کو الہ آباد میں وفات پائی[۵۵]

۱۳۸ - مولانا محمد نافع اکبر آبادی

مولانا محمد نافع اکبر آبادی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے مصاحب و ندیم بختاور خاں کے لیے، فارسی زبان میں "خلاصۃ الخانیہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو مسائلِ فقہیہ

---

[۵۵] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۱، ۳۹۲ گنج ارشدی

پر مشتمل تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے عالم اور فقیہ تھے[۵۶]

۱۳۹۔ شیخ محمد نعمان بدخشی

شیخ محمد نعمان بن شمس الدین بن جلال الدین بن حمید الدین حسینی بدخشی کا شمار اپنے عہد کے کبار مشائخ نقشبندیہ اور جلیل القدر فقہا میں ہوتا تھا۔ ان کے والد شیخ شمس الدین بھی فضل و تقویٰ میں یگانۂ روزگار اور مشاہیر بدخشاں و ماوراالنہر میں سے تھے۔ دادا شیخ جلال الدین اور پردادا حمید الدین بھی فضل و کمال کے جامع اور علم و ادراک میں وحید الدہر تھے۔

شیخ محمد نعمان کی ولادت ۹۷۷ھ کو بدخشاں میں ہوئی۔ منقول ہے کہ ان کی ولادت سے پیشتر ان کے والد شیخ محمد نعمان نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا کہ انھوں نے ان کو ایک سعادت مند فرزند کے تولد کی خوشخبری سنائی ہے اور فرمایا کہ حضرت امام کے نام کی مناسبت سے اس کا نام نعمان رکھا جائے۔ ان دنوں شیخ شمس الدین سخت مالی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ بیٹا پیدا ہوا تو نعمان نام رکھا۔ نعمان نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو اپنے علاقے کے فضلائے نامدار کی خدمت میں حاضری دی اور علم حاصل کیا۔ حصولِ علم کے بعد عنفوانِ شباب ہی میں شیخ عبداللہ بلخی عشقی سے بیعت ہو گئے۔ اس زمانے میں ہندوستان کو علم و فضل، زہد و تقویٰ اور تصوف و طریقت میں بڑی شہرت حاصل تھی اور اس برِّصغیر میں بے شمار اصحابِ کمال کا سلسلہ فیض جاری تھا۔ بہت سے شائقینِ علم و سلوک عرب و عجم کے متعدد ممالک سے یہاں آتے اور علم و عرفان کے مختلف گوشوں سے بہرہ یاب ہوتے۔ انہی بلند بخت حضرات میں شیخ محمد نعمان بھی تھے جو بدخشاں سے واردِ ہند ہوئے۔ سب سے پہلے دہلی گئے اور خواجہ عبدالباقی

---

[۵۶] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۳ بحوالہ مرآۃ العالم

(باقی باللہ) نقشبندی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے فیض حاصل کیا، کافی عرصہ ان کی صحبت و ملازمت میں گزارا۔ ان کی وفات کے بعد شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی سے منسلک ہو گئے۔ جو خواجہ باقی باللہ ہی کے فیض یافتہ تھے۔ مجدد الف ثانی سے علم و معرفت پر عبور حاصل کیا اور بلند مرتبے کو پہنچے۔ پھر ۱۰۱۸ھ کو عازم برہان پور ہوئے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۰۵۸ھ کو (ایک روایت کے مطابق ۱۰۶۰ھ کو) اکبر آباد (آگرہ) میں فوت ہوئے[۵۷]

۱۴۰۔ شیخ محمد ہاشم دہلوی

شیخ محمد ہاشم دہلوی، حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے تھے۔ مشہور عالم اور محدث و فقیہ تھے۔ علمائے باعمل اور اللہ کے صالح بندوں میں سے تھے۔ مولد و منشا دہلی ہے، جس کو اس برصغیر میں مرکزِ علم کی حیثیت حاصل تھی۔ اپنے والد گرامی شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے تعلیم حاصل کی اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے۔ یہاں تک کہ حدیث اور فقہ میں ماہر کامل ہوئے۔ ان کے ایک بھائی مفتی نور الحق دہلوی تھے، وہ بھی علم و عمل میں یگانۂ روزگار تھے۔

فہرس التوالیف میں ان کے مرتبہ علمی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا:

جوہرِ طبع او بجودت و سلامت و قوت در علم خصوصاً بعلم شریفِ حدیث موصوف و ممتاز است[۵۸]

۵۷؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: زبدۃ المقامات، ص ۳۲۶ تا ۳۴۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۳

۵۸؎ حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ص ۲۵۶ — تذکرہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ص ۲۷۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۴

۱۴۱- خواجہ محمد ہاشم کشمی

خواجہ محمد ہاشم کشمی اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے استاذ تھے۔ ان کا مولد و منشا سرزمینِ بدخشاں کا ایک قریہ "کشم" ہے۔ اپنے علاقے کے علمائے کرام سے علم حاصل کیا اور حدیث، فقہ اور دیگر علوم مروجہ میں مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ بعد ازاں ہندوستان آئے اور برہان پور گئے۔ وہاں شیخ محمد نعمان بدخشی کا سلسلۂ فیض جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے۔ ان سے اخذِ طریقت کیا۔ پھر ۱۰۳۱ھ کو سرہند گئے، وہاں حضرت مجدد الف ثانی کا چشمۂ علم و طریقت جاری تھا، عرصہ تک ان سے استفاضہ کناں رہے، ۱۰۳۳ھ میں ان سے سندِ حدیث حاصل کی اور تلقینِ ذکر کی اجازت سے بہرہ ور ہوئے۔ اس کے بعد برہان پور کو مراجعت فرمائی اور وہاں سکونت اختیار کی۔

خواجہ محمد ہاشم کشمی سے کثیر التعداد حضرات نے استفادہ کیا۔ فارسی زبان میں "زبدۃ المقامات" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جس میں حضرت خواجہ باقی باللہ، ان کے فرزندانِ گرامی، خلفائے عالی مقام، شیخ عبدالاحد سرہندی، حضرت مجدد الف ثانی، ان کی اولاد، ان کے خلفا اور فیض یافتہ حضرات کے حالات بیان کیے ہیں۔ اپنے موضوع میں یہ ایک دلچسپ اور پُراز معلومات کتاب ہے اور اس دور کے تذکرۂ رجال میں بطور حوالے کے اس کا نام آتا ہے۔ یہ کتاب مطبع نامی منشی نول کشور واقع کان پور میں باہتمام منشی بھگوان دیال، جنوری ۱۸۹۰ء میں پہلی مرتبہ طبع ہوئی۔

۱۴۲- میر محمد ہاشم گیلانی

میر محمد ہاشم بن محمد قاسم حسینی گیلانی، شیخ، فاضل اور علامہ تھے۔ کبار علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے متعدد علما سے مختلف علوم کی تحصیل کی۔

علومِ حکمیہ مرزا ابراہیم ہمدانی اور نصیر الدین حسین شیرازی سے حاصل کیے، حدیث فقہ اور علوم عربیہ کے لیے شیخ محمد عربی محدث، شیخ عبدالرحیم حسانی اور شیخ علی نبیرۂ علامہ عصام الدین اسفرائینی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بارہ سال مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اقامت گزیں رہے اور وہاں کے مختلف علما و فضلا سے مستفید ہوئے۔ شیخ حکیم علی گیلانی سے فنونِ ریاضی اور علمِ طب کی تحصیل کی۔ اس کے بعد احمد آباد میں مقیم ہو گئے اور درس و افادہ کا غلغلہ بلند کیا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کے تختِ حکومت پر شاہ جہان بادشاہ متمکن تھا۔ میر محمد ہاشم گیلانی کی شہرتِ علمی اس کے کانوں میں پہنچی تو اس نے ان کو احمد آباد کی صدارت پیش کی۔ عرصے تک اس منصب پر فائز رہے، پھر شاہ جہان نے ان کو اپنے بیٹے اورنگ زیب عالم گیر کا معلم مقرر کر دیا۔

میر محمد ہاشم گیلانی تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ جس زمانے میں وہ اورنگ زیب کو تعلیم دینے پر مامور تھے، اس زمانے میں تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا اور شاہ جہان کے نام معنون کیا۔ تحریر اقلیدس کے مقالہ تاسعہ پر بھی حواشی سپردِ قلم کیے۔ اس عالم و فقیہ ماہر معقولات و منقولات اور ممتاز طبیب نے اسّی سال عمر پا کر ۱۰۶۱ھ کو اورنگ آباد میں انتقال کیا[۵۹]

۱۴۴۔ شیخ محمد یحییٰ سرہندی

شیخ محمد یحییٰ سرہندی حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند تھے۔ ۱۰۲۷ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے دو بھائیوں شیخ محمد سعید اور شیخ محمد معصوم سے اخذِ علم کیا، تدقیق و فقاہت کے مرتبے کو پہنچے اور درس و افادہ کا سلسلہ شروع فرمایا۔ علمائے

---

۵۹ بادشاہ نامہ، ج اول، ص ۳۴۵ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۵ — بزمِ تیموریہ ص ۲۱۶ — مقالات یوم عالم گیر، ص ۲۲ — مرآۃ العالم

ربانی میں سے تھے، حضرت خواجہ باقی باللہ کے بیٹے خواجہ عبید اللہ کی صاحبزادی سے شادی ہوئی۔ حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ ۲۷ جمادی الاخریٰ ۱۰۹۸ھ کو اکہتر اے سال کی عمر میں فوت ہوئے۔
ایک روایت کے مطابق سالِ پیدائش ۱۰۲۴ھ اور سال وفات ۱۰۹۶ھ ہے۔[۶۰]

۱۴۴۔ مولانا محمد یعقوب بنانی لاہوری

مولانا ابو یوسف محمد یعقوب بنانی لاہوری، گیارھویں صدی ہجری کے دیارِ لاہور کے مشہور شیخ و عالم اور معروف محدث و فقیہ تھے۔ فنونِ حکمیہ میں بھی ماہر تھے۔ مولد و منشا لاہور ہے، اپنے عصر کے ممتاز اساتذہ سے علم حاصل کیا اور علوم و فنون میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ شاہ جہان بادشاہ نے ان کو فوج کے میر عدل کے عہدے پر مامور کیا۔

معقولات و منقولات کے جامع اور فروع و اصول کے ماہر تھے۔ مدرسۂ شاہ جہانیہ کی مسندِ درس پر فائز تھے، بے شمار اصحابِ علم نے ان سے استفادہ کیا۔ حدیث میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ "الافق المبین فی اخبار المقربین" کے طبقۂ تاسعہ میں رزق اللہ ان کی فراوانیٔ علم و فضل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں نے ان کو اثنائے درس میں دیکھا کہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی پر شدید تنقید کرتے تھے۔

مولانا یعقوب بنانی لاہوری بہت بڑے مصنف اور شارح بھی تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں: الخیر الجاری شرح صحیح البخاری، المعلم شرح صحیح الامام مسلم، المصفی شرحِ الموطا، شرح تہذیب الکلام، شرح حسامی، شرح شرعۃ الاسلام،

۶۰۔ البانع الجنی — مشائخ مجددیہ، ص ۲۲۲، ۲۲۳ — ہدیہ احمدیہ، ص ۸۶، ۸۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۳۵ — فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۵۸

اساس العلوم (علم صرف میں) حاشیہ رضی، حاشیہ عضدی اور حاشیہ بیضاوی۔ درسی کتابوں کے ان شروح و حواشی اور تعلیقات سے ان کی وسعتِ علم اور کثرتِ مطالعہ کا پتا چلتا ہے۔ کتبِ درسیہ اور علوم مروجہ سے انہماک کا یہ عالم تھا کہ دورِ عالم گیری میں لشکر کے میر عدلیہ تھے، لیکن درس و افادہ کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ اس میں مشغول رہے، اس کا اندازہ مندرجہ بالا کتبِ درسیہ پر ان کی تعلیقات و شروح سے بآسانی ہو جاتا ہے۔

لاہور کے اس عظیم عالم و فقیہ اور محدث نے ۱۰۹۸ھ کو وفات پائی[۱۱]

۱۴۵۔ سید محمود سندھی

سید محمود بن عبدالباقی بن محمود بن ابو سعید حسینی سبزواری ثم سندھی، اپنے عصر کے عالم و فقیہ تھے اور اللہ کے نیک بندوں اور باعمل علما میں ان کا شمار ہوتا تھا، علم و کمال اور فضل و تقویٰ میں بے نظیر تھے۔ ان کے والد شیخ عبدالباقی بلادِ سندھ کے شیوخ میں سے تھے اور مسندِ مشیخت پر فائز تھے۔ باپ کی وفات کے بعد شیخ محمود نے مسندِ مشیخت سنبھالی اور ۱۰۲۰ھ کو انتقال کیا[۱۲]

۱۴۶۔ شیخ محمود گجراتی

شیخ محمود بن محمد حسن عمری چشتی احمد آبادی گجراتی، احمد آباد میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اپنے والد شیخ محمد حسن عمری سے جو عالم و فاضل بزرگ تھے،

---

[۱۱] عمل صالح، ج ۳، ص ۳۰۱ — مآثر عالم گیری، ص ۱۲۰، ۱۲۴، ۱۶۰ — انفاس العارفین ص ۸۰، تا ۹۱ — بزم تیموریہ، ص ۲۴۴ — فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۱۲۳ — نقوش ۹ لاہور نمبر، ص ۵۰۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۳۹، ۴۴۰

[۱۲] تحفۃ الکرام، ص ۶۱۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۷

تعلیم حاصل کی، طویل مدت تک ان کی خدمت و مصاحبت میں رہے، ان سے اخذِ طریقت بھی کیا، یہاں تک کہ اپنے علاقے اور عصر کے فقیہِ صالح تسلیم کیے گئے۔ والد کی وفات کے بعد مسندِ مشیخت کو زینت بخشی اور بے شمار تشنگانِ علم کو مستفید فرمایا۔ ۹ ربیع الثانی ۱۰۴۰ھ کو احمد آباد میں فوت ہوئے[۶۲۳]

۱۴۷۔ شیخ محمود فاروقی جون پوری

میر سید غلام علی آزاد بلگرامی سبحۃ المرجان میں شیخ محمود فاروقی جون پوری کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولا ریب انہ لم یظہر بالہند مثل فاروقیین احدھما فی الحقائق وھو مولانا الشیخ احمد السرھندی والثانی فی العلوم الحکمیۃ والادبیۃ وھو الملا محمود الجون پوری۔

یعنی سرزمینِ ہند میں دو ایسی فاروقی النسل شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں کہ کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک شیخ احمد سرہندی جو حقائق و معارف میں فقید المثال تھے، دوسرے شیخ محمود جون پوری جن کا علومِ حکمیہ و ادبیہ میں کوئی حریف نہ تھا۔

لیکن صاحبِ نزہۃ الخواطر علامہ عبد الحی حسنی لکھنوی ان میں تیسرے فاروقی النسل ہندی کا اضافہ کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

اقول وثالثہم الشیخ ولی اللہ بن عبد الرحیم العمری الدھلوی فانہ کان عدیم النظیر فی الفلسفۃ الالٰہیۃ۔

ان میں تیسرے فاروقی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں، جن کی فلسفۂ الٰہیات میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ان سطور میں اختصار کے ساتھ فاروقی نسل کے جیّد عالم اور معقولات و منقولات

۶۲۳ھ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۷ بحوالہ محبوب ذی المنن

کے وحید العصر فاضل، شیخ محمود جون پوری کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ شیخ محمود ۹۹۳ھ کو کشورِ ہند کے مرکزِ علم و فضل جون پور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ محمد جون پوری کی نگرانی میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ شیخ محمد جون پوری اپنے علاقے کے بلند پایہ عالم تھے، لائق بیٹے نے درسی کتابیں انھی سے پڑھیں۔ اس زمانے میں جون پور کی مسندِ تدریس پر شیخ محمد افضل عثمانی جون پوری متمکن تھے، شیخ محمود نے ان کی طرف رجوع کیا اور منطق و حکمت کی مروج و متداول کتابیں ان کے حلقۂ درس میں پڑھیں، یہاں تک کہ فضیلتِ علمی کے مرتبۂ علیا کو پہنچے اور اپنے تمام اقران سے فوقیت لے گئے۔ سترہ سال کی عمر میں درسیات از بر ہو چکی تھیں۔ ذکاوت و فطانت، حدتِ ذہن و فکر اور قوتِ حفظ و ادراک کا یہ عالم تھا کہ اصنافِ علوم کے ہر گوشے پر گہری نظر تھی۔ صغر سنی ہی میں بڑی بڑی علمی مجلسوں اور فکری محفلوں میں جانے لگے تھے۔ وہاں کبار و مشاہیر علما سے ہم کلام ہوتے، اہم اور پیچیدہ مسائل پر ان سے مباحثے کرتے اور زورِ استدلال سے سب پر چھا جاتے۔ ان کی روانیٔ کلام اور قوتِ استدلال سے جون پور کے علما و فضلا اور اعیان و اکابر انتہائی متحیر ہوتے۔ اس عہد میں علومِ حکمیہ اور معارفِ ادبیہ میں انھیں جو عبور و استحضار تھا، اس میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ یوں تو تمام اصنافِ علم پر عبور رکھتے تھے، لیکن فلسفہ و حکمت اور منطق و کلام میں تو بالخصوص ماہرِ کامل تھے، گیارھویں صدی ہجری کے ہندوستان میں انھیں عالمِ کبیر اور امامِ شہیر کی حیثیت حاصل تھی۔ فلسفہ و حکمت کی جزئیات کی وضاحت میں مجتہد کے مرتبے پر فائز تھے۔

محمد یحییٰ بن محمد امین عباسی الہ آبادی وفیات الاعلام میں لکھتے ہیں کہ معانی، بیان اور فلسفہ و منطق میں ارضِ ہند کا کوئی عالم شیخ محمود جون پوری کے مرتبے کو نہیں پہنچا۔ ایک مرتبہ ملک میں رصدگاہ تعمیر کرنے کا جذبہ دل میں بیدار ہوا، اور اس موضوع پر شاہ جہان بادشاہ سے گفتگو کے لیے اکبر آباد (آگرہ) گئے، اس

سے بات کی، منصوبے کے تمام پہلو اس کے سامنے رکھے اور رصد گاہ کی ضرورت و اہمیت کو واضح کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کو اس عظیم اور مفید ترین منصوبے کی تکمیل کے لیے آمادہ کر لیا اور رصد گاہ کی تعمیر کے مسئلے پر وہ سنجیدگی سے غور کرنے لگا، لیکن اس کے ایک وزیر نے اس منصوبے کی مخالفت کی اور کہا کہ بلخ کی مہم درپیش ہے اور اس کے لیے بہت سے روپے کی ضرورت ہے۔ وزیر کی اس بات سے معاملہ ختم ہو گیا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شیخ محمود جون پوری نے رصد گاہ کے لیے جو زمین تجویز کی تھی، کہتے ہیں یہ وہی زمین تھی جو اس سے قبل بعض حکما اس کام کے لیے منتخب کر چکے تھے۔

علامہ کو تعمیر رصد گاہ کے سلسلے میں اپنی ناکامی اور شاہ جہان بادشاہ کے وزیر کی مخالفانہ گفتگو سے بہت مایوسی ہوئی۔ وہ واپس جون پور آگئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ بعد ازاں شاہ جہان کے بیٹے شاہزادہ شجاع نے ان کی طرف رجوع کیا، وہ انھیں اپنے ساتھ بنگال لے گیا اور ان سے علومِ حکمیہ و فنونِ فلسفہ کی تحصیل کی۔ نواب شائستہ خاں (یعنی ابوطالب بن ابوالحسن اکبر آبادی) نے ان سے الفرائد المحمودیہ پڑھی، علاوہ ازیں شیخ نور الدین جعفر جون پوری ”الآداب الباقیہ“ کے مصنف شیخ عبدالباقی صدیقی اور خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

شیخ محمود جون پوری اور شیخ محمد رشید جون پوری، دونوں شیخ محمد افضل جون پوری کے شاگرد تھے، دونوں ایک ہی شہر کے رہنے والے تھے اور دونوں کے علم و فضل کی ہمہ گیری اور جامعیت سے شیخ محمد افضل بہت خوش تھے، اور ان عظیم الشان شاگردوں کا استاذ ہونا ان کے لیے باعثِ فخر تھا۔ ان کا ارشاد ہے:

وقتے کہ علامہ تفتازانی و جرجانی از عالم رفتہ اند کسے اجتماع فاضل بر ایں فضیلت در یک شہر نشان نہ دادہ۔

یعنی جب سے علامہ سعد الدین تفتازانی (متوفی ۷۹۳ھ) اور سید شریف جرجانی

(متوفی ۱۰۶۱ھ) اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے ہیں، ایک شہر میں اس قسم کی فضیلت کے حامل فضلا کا اجتماع نہیں ہوا۔

شیخ محمد افضل کی مراد شیخ محمود جون پوری اور شیخ محمد رشید جون پوری سے تھی کہ ایک ہی وقت میں دونوں جون پور میں موجود تھے اور خدمتِ علم انجام دیتے تھے۔

جس زمانے میں شیخ محمود جون پوری بنگال میں مقیم تھے اور شہزادہ شجاع کو درس دیتے تھے، اس زمانے میں بنگال ہی میں ان کی ملاقات مشہور بزرگ شیخ نعمت اللہ بن عطاء اللہ فیروز پوری (متوفی ۱۰۷۲ھ) سے ہوئی، ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے اور ۱۰۵۲ھ میں ان سے اخذِ طریقت کیا۔

شیخ محمود نہایت حاضر جواب تھے، کبھی ایسی بات زبان سے نہ نکالتے جس سے بعد میں رجوع کرنا پڑے۔

میر سید غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں :

مدت العمر قولے ازو سر بر نہ زد کہ ازاں رجوع کردہ باشد، ہر گاہ سائلے مسئلہ می پرسید، اگر دل حاضر می بود بہ جواب می پرداخت، والا می گفت دریں وقت خاطر متوجہ جواب نیست۔

عمر بھر کبھی ایسی بات نہیں کی جس سے رجوع کرنے کی نوبت آئے۔ اگر طبیعت حاضر ہوتی سائل کے ہر علمی سوال کا جواب دیتے۔ ورنہ فرماتے کہ اس وقت طبیعت آمادۂ جواب نہیں ہے۔

شیخ ممدوح کا جہاں درس و افادہ کا سلسلہ جاری تھا، وہاں وہ تصنیف و تالیف کے بھی ماہر تھے اور قلم میں بڑا زور تھا۔ علمِ فلسفہ میں شمس البازغہ ان کی شہرہ آفاق کتاب ہے، اور وہ کتاب ہے جس کی وجہ سے فلسفہ و حکمت کے بڑے بڑے مراکز میں اسلامی ہند کی علمی سرگرمیوں کو ممتاز مقام عطا ہوا۔ یہ کتاب درسِ نظامیہ میں باقاعدہ پڑھائی جاتی ہے اور علما و طلبا میں متداول ہے۔ حلقۂ اہلِ علم میں اس سے بے حد اعتنا کیا گیا۔ ملا حسن، مولانا محمد یوسف اور مولانا عبد الحلیم وغیرہ اصحابِ حکمت نے اس پر حواشی لکھے۔ اس کے علاوہ معانی و بیان اور بدیع میں قاضی

عضد الدین ایجی کی کتاب فوائد غیاثیہ پر جو بڑی مشہور کتاب ہے، الفرائد کے نام سے شرح قلم بند کی اور اس کو الفرائد شرح الفوائد کے نام سے موسوم کیا۔ اس کتاب پر ممدوح نے نہایت عمدہ تعلیقات و حواشی لکھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ محمود فصاحت و بلاغت اور بدیع و معانی میں کس درجہ تبحر رکھتے تھے۔ ایک کتاب شیخ محب اللہ الہ آبادی کی التسویہ کے جواب میں حرز الایمان کے نام سے تصنیف کی۔

شیخ محمود جون پوری نے ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ کو جون پور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔

شیخ موصوف کی وفات کے وقت ان کے استاذ شیخ محمد افضل جون پوری زندہ تھے۔ ان کو لائق شاگرد کی موت کا پتا چلا تو نہایت حزن و ملال کا اظہار کیا۔ اور اس درجہ غم و الم میں مبتلا ہوئے کہ چالیس دن تک لب آشنائے تبسم بھی نہیں ہوئے۔ بالآخر چالیس روز بعد ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ کو اپنے اس جلیل القدر شاگرد سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گیارھویں صدی ہجری کا ہندوستان علمی و تحقیقی لحاظ سے نہایت سرخیز اور پُرثروت تھا۔ مختلف مقامات میں فحول علمائے کرام کے تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس کے وسیع سلسلے جاری تھے۔ اُس دور میں خاندانِ مغلیہ کے یکے بعد دیگرے تین عظیم الشان حکمران تختِ نشین ہند ہوئے، جلال الدین اکبر، نور الدین محمد جہاں گیر اور شہاب الدین شاہ جہان۔ انھوں نے اس ملک کی بے حد علمی خدمت کی۔ اس کی تہذیب اور ثقافت کو خوب ترقی دی اور برصغیر میں علم و تحقیق کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا جس سے اب تک لوگ متمتع ہو رہے ہیں۔ جن علمائے عالی مقام، فضلائے عظام اور فقہائے نام دار نے اس صدی میں علم و فضل، زہد و تقویٰ اور تصوف و طریقت میں ارتقا و تقدم کی منزلیں طے کیں، ان میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، علامہ عبدالحکیم

سیالکوٹی، مولانا محمد فاضل لاہوری، مولانا محمد یعقوب صرفی کشمیری، شیخ محمود جون پوری، مولانا محمد افضل جون پوری، صاحبِ رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری، شیخ معین الدین کشمیری، مولانا عبدالسلام لاہوری، مولانا کمال الدین کشمیری، مولانا جمال الدین کشمیری، مولانا عبداللہ سیالکوٹی، شیخ علیٰی سندھی، شیخ اسماعیل لاہوری، علامی سعداللہ چنیوٹی لاہوری، قاضی اللہ داد بلگرامی، شیخ بلال لاہوری اور مولانا جان محمد لاہوری وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

علمائے کرام اور فقہائے عظام کے علاوہ اصحابِ طریقت اور اربابِ تصوف کی بھی بہت بڑی جماعت اس عہد میں برِّ صغیر پاک و ہند کے مختلف بلاد و امصار اور قصبات و دیہات میں موجود تھی۔[۶۶۵]

۱۴۸۔ شیخ محمود سہارن پوری

شیخ محمود بن مصطفیٰ ابن عبدالستار انصاری سہارن پوری کی ولادت و تربیت ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر سہارن پور میں ہوئی۔ پہلے علمِ نحو اور دیگر علومِ عربیہ کی تحصیل کی، پھر اپنے دور کے اساتذہ سے علمِ فقہ حاصل کیا۔ حصولِ علم کے بعد گنگوہ کا قصد کیا۔ وہاں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے بیٹے شیخ رکن الدین گنگوہی کا سلسلۂ فیض جاری تھا، ان سے اخذِ طریقت کیا۔ علم اور طریقت سے فارغ ہو کر حجازِ مقدس کا عزم فرمایا، سعادتِ حج سے بہرہ ور ہوئے اور مدینہ منورہ بھی

۶۶۵۔ شیخ محمود جون پوری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: عملِ صالح، ج ۲، ص ۲۴۲ — تجلی نور، ج ۲، ص ۴۸ تا ۵۱ — تاریخ شیرازِ ہند جون پور، ص ۶۸۸ تا ۶۹۰ — ماثر الکرام، دفترِ اول ص ۱۸۹ تا ۱۹۱ — وفیات الاعلام — قضار الادب من ذکر علماء النحو والادب، ص ۱۹۸ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۱ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۱۲، ۴۱۳ — ابجد العلوم، ص ۹۰۱، ۹۰۲ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۷ تا ۳۹۹ — سبحۃ المرجان، ص ۵۳ تا ۶۳ — رودِ کوثر، ص ۳۳۶ — فرحت الناظرین

(خصات)، ص ۱۳۴، ۱۳۵

گئے۔ عرصے تک مختلف بلاد و امصار کی سیر و سیاحت بھی کرتے رہے۔ اس اثنا میں بہت سے مشائخ و علما سے ملاقات ہوئی، ان کی صحبت اختیار کی اور کسبِ فیض فرمایا۔ بعد ازاں اپنے شہر سہارن پور آگئے تھے۔

شیخ محمود انصاری سہارن پوری اللہ کے برگزیدہ بندوں اور صالح مشائخ میں سے تھے۔ ۵ ذی الحجہ ۱۰۵۰ھ کو فوت ہوئے[۶۵]

۱۴۹۔ مولانا محی الدین بہاری

مولانا محی الدین بن عبداللہ بہاری، ملا موہن بہاری کے عُرف سے معروف تھے۔ ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر "بہار" کے نواح میں متولد ہوئے، نشوونما بھی اسی گاؤں میں پائی۔ حصولِ علم کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ نو سال کی عمر کے تھے کہ قرآنِ مجید حفظ کر لیا۔ ان کے والد مولانا عبداللہ بہاری بھی صاحبِ علم بزرگ تھے، حفظِ قرآن کے بعد ان سے درسی کتابیں پڑھنا شروع کیں اور سترہ[۱۷] سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ پھر اپنے شہر ہی میں درس و افادے کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس دَور کے مشاہیر فقہا میں گردانے گئے۔ کچھ عرصہ شائقینِ علم کو پڑھاتے اور مستفید کرتے رہے۔ بعد ازاں دہلی گئے اور شاہ جہان بادشاہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ان کی علمی قابلیت سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے اورنگ زیب کا معلم مقرر کر دیا۔ بارہ سال اس خدمتِ علمی پر مامور رہے۔ پھر تصوف و طریقت کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اور شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کے پوتے شیخ حیدر کی خدمت میں حاضری دی، ان سے اخذِ طریقت کیا۔ اس کے بعد اپنے شہر بہار واپس چلے گئے اور سب اطراف سے منقطع ہو کر زہد و عبادت کی زندگی اختیار کر لی۔ اس اثنا میں علمِ نحو کی انتہائی کتاب "کافیہ" کی مبحث

---

۶۵ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۹۔ بحوالہ مرآۃ جہاں نما

غیر منصرف تک فارسی زبان میں حقائق و معارف کے اسلوب پر شرح سپرد قلم کی۔ حقائق و معارف کے انداز ہی میں مبحث غیر منصرف تک عربی زبان میں "کافیہ" کی ایک شرح شیخ ابوالبقا نے لکھی ہے۔

گنج ارشدی میں شیخ غلام ارشد جون پوری لکھتے ہیں کہ مولانا محی الدین بہاری شیخ محمد افضل جون پوری کے شیوخ میں سے تھے۔ وہ ایک مرتبہ جون پور تشریف لائے اور شیخ محمد افضل کے ہاں گئے۔ شیخ اس وقت درس دے رہے تھے اور طلبا کی جماعت ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے مولانا محی الدین کے اعزاز میں درس بند کرنے کا ارادہ کیا لیکن مولانا نے روک دیا اور فرمایا کہ ان کی موجودگی میں سلسلۂ درس جاری رکھا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری طلبا کی جماعت میں شیخ محمد افضل سے درس لے رہے تھے اور مولانا محی الدین بہاری شیخ محمد رشید کی استعدادِ علمی سے واقف ہونا چاہتے تھے۔ غالباً یہ اس بنا پر تھا کہ شیخ محمد رشید کی شہرت زمانۂ طالب علمی ہی میں اہلِ علم میں پہنچ گئی تھی۔ مولانا محی الدین بہاری نے دورانِ درس میں کسی مسئلے میں شیخ محمد رشید سے مذاکرہ و مباحثہ شروع کر دیا۔ شیخ نے ان کو اس انداز سے جواب دیا اور اس نہج سے بحث میں حصہ لیا کہ قریب تھا کہ مولانا کو خاموش کرا دیں، مگر شیخ محمد افضل نے اپنے لائق شاگرد کو خاموش رہنے کا حکم دیا اور وہ خاموش ہو گئے۔

مولانا محی الدین بہاری نے ۱۰۶۸ھ کو وفات پائی [۵۶۶]

۱۵۰۔ قاضی مرتضیٰ بیجاپوری

قاضی مرتضیٰ بن محمود نائطی بیجاپوری کا لقب رضی الدین تھا۔ اپنے عصر کے

---

[۵۶۶] مآثر الکرام، دفتر اوّل ص ۴۱، ۴۲ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۰۰، ۴۰۱

نامور عالم و فقیہ اور شیخ تھے۔ ان کے والد محمود نائطی بندرگاہ گوا کے قاضی تھے۔ والد کی وفات کے بعد ۹۹۳ھ میں یہ منصب لائق بیٹے کو ملا۔ قاضی ممدوح مصنف بھی تھے، فنِ صنائع و بدائع سے متعلق سلطان ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں "تحفۃ الفقیر" کے نام سے ایک مفید کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب لکھ کر بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ کو بطور تحفہ پیش کی، بادشاہ نے اسے بہت پسند کیا۔[۶۷]

۱۵۱۔ سیّد مصطفیٰ بیجاپوری

سید مصطفیٰ بن ہاشم بن برہان الدین علوی گجراتی بیجاپوری کا مولد و منشا بیجاپور ہے۔ ان کے والد سید ہاشم بیجاپوری عالم و فاضل بزرگ تھے، بیٹے نے انہی سے اخذِ علم اور کسبِ طریقت کیا، طویل عرصے تک ان کی مصاحبت و ملازمت میں رہے، علمائے ربانی اور فضلائے مشاہیر میں گردانے گئے۔ والد کے بعد مسندِ مشیخت کے وارث بنے۔ عوام و خواص میں مقبول اور حسنِ اخلاق میں مشہور تھے۔ ۱۰۰۷ھ کے لگ بھگ بیجاپور میں فوت ہوئے۔[۶۸]

۱۵۲۔ شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی

شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی کا نسب نامہ یہ ہے: مصطفیٰ بن عبدالحمید بن بن راجو بن سعدی بن عارف بن عبدالواسع بن منخلی بن ہدی بن عبدالملک بن منتقن بن نصیر الدین بن بخشی — شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی کو لوگ شیخ رومی عثمانی برونوی کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔ شیخ سری بن مفلس سقطی عثمانی کی اولاد سے تھے، جو مشہور ولی اور متقی بزرگ تھے۔ شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی

---

[۶۷] تاریخ النوائط، ص ۳۰۵ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۰۳

[۶۸] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۰۶ بحوالہ محبوب ذی المنن

اپنے دَور کے عالم و فقیہ اور پرہیزگار بزرگ تھے، اور صاحبِ رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ) کے والد تھے۔ یہ دراصل "سکلائی" کے باشندے تھے جو علاقہ اودھ میں اعمالِ امیٹھی میں ایک قریہ تھا۔ شیخ مصطفٰی نے موضع سکلائی میں نشو و نما پائی اور شیخ محمد بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی (متوفی ۲۶ ذی القعدہ ۱۱۰۱ھ) سے بیعت ہوئے۔ پھر حصولِ علم کا شوق پیدا ہوا اور اپنے علاقے کے علما سے تحصیل کی۔ بعد ازاں ان کے مرشد شیخ محمد بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی نے جون پور جانے کی اجازت مرحمت فرمائی اور وہ جون پور چلے گئے۔ جون پور علمائے عظام کا مرکز تھا اور مختلف علما و مشائخ کے درس و تدریس اور تصوف و طریقت کے سلسلے جاری تھے، شیخ مصطفٰی بھی ان سے منسلک ہوگئے، وہاں کے اساتذہ سے علم حاصل کیا اور شیخ قیام الدین بن قطب الدین جون پوری سے خرقۂ طریقت عطا ہوا۔ پھر امیٹھی کا قصد کیا اور کافی عرصہ وہاں مقیم رہے۔ امیٹھی سے موضع برونہ منتقل ہوگئے جو اس زمانے میں اعمالِ جون پور میں ایک گاؤں تھا۔ برونہ کے نامور بزرگ شیخ نور الدین بن عبدالقادر صدیقی برونوی کی صاحب زادی سے شادی کی اور اللہ نے اس سے اولاد عطا کی۔ پھر ایک وقت آیا کہ اہل و عیال کو برونہ میں چھوڑا اور خود علاقہ بنگال کے ایک شہر "پُرینہ" چلے گئے، وہاں اقامت اختیار کرلی، مدفن بھی وہی ہے۔ ان کے بیٹے شیخ محمد رشید جون پوری نے جو سرزمین برصغیر کے بہت بڑے عالم و فاضل اور صاحبِ تصنیفاتِ مشہورہ تھے، اپنے نانا شیخ نور الدین برونوی کے ہاں تربیت حاصل کی اور ابتدائی کتابیں (بعض انتہائی بھی، جیسا کہ شیخ محمد رشید جون پوری کے حالات میں بیان کیا جاچکا ہے) انھی سے پڑھیں ——— شیخ مصطفٰی عثمانی برونوی، فقیہ، زاہد، متورع اور متوکل علی اللہ تھے۔ مشتبہات سے دامن کشاں رہتے تھے۔ انھوں نے ۲۰ ذی الحجہ ۱۰۷۶ھ کو پُرینہ میں وفات پائی۔

شیخ مصطفٰی عثمانی برونوی، فقیہ، زاہد

۱۵۳۔ خواجہ معین الدین کشمیری

خواجہ معین الدین نقشبندی کشمیری کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ معین الدین بن خاوند محمود بن ضیاء الدین بن میر محمد بن تاج الدین بن علاء الدین عطار بخاری نقشبندی کشمیری۔ خواجہ معین الدین کشمیری، خطۂ کشمیر کے ممتاز بزرگ حضرت خواجہ خاوند محمود (متوفی ۱۲ شعبان ۱۰۵۲ھ) کے فرزند تھے۔ خواجہ خاوند محمود کبار مشائخ نقشبندیہ میں سے تھے، ماوراء النہر اور اس کے گرد و نواح میں بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے اور ان کے ارادت مند دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ شاہجہان بادشاہ کے عہد میں کابل سے ہندوستان آئے اور کشمیر میں سکونت اختیار کی، کئی مرتبہ لاہور، دہلی اور آگرہ گئے، ملوک و امرائے سلطنت سے ملے اور اپنی نیکی کی وجہ سے ان کے نزدیک انتہائی عزت و اکرام کے مستحق قرار پائے۔ کشمیر میں بڑی ترویج اسلام کی اور ہزاروں لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔[۵۷]

خواجہ معین الدین کشمیری، انہی خواجہ خاوند محمود کے بیٹے تھے، جن کا شمار مشائخ نقشبندیہ اور کشمیر کے فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ ان کا مولد و منشا کشمیر ہے۔ گھر میں علم کے چشمے بہہ رہے تھے اپنے والدِ گرامی خواجہ خاوند محمود سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں اور فقہ کی کچھ تعلیم حاصل کی۔ مزید حصولِ علم کی غرض سے دہلی گئے، وہاں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تدریسی سرگرمیاں جاری تھیں، ان کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور کافی عرصہ وہاں رہ کر حدیث و فقہ کی کتابیں پڑھیں، یہاں تک کہ اپنے عہد کے جید عالم اور نامور فقیہ گردانے گئے۔ بعد ازاں کشمیر واپس آئے اور مسندِ مشیخت کو زینت بخشی۔ علم و فضل کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ اس عہد کے بڑے بڑے کشمیری اصحابِ علم اور اربابِ طریقت ان کی خدمت میں آتے

---

[۵۷] عملِ صالح، ج ۳، ص ۲۸۴۔ نیز ملاحظہ ہو، تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۳۸ تا ۱۴۰۔

اور استفادہ کرتے تھے، ان علمائے کرام میں ملا محمد طاہر کشمیری ملف مولانا حیدر کشمیری، علامہ ابوالفتح کلو، ملا یوسف مدرس، مفتی محمد طاہر، مولانا عبدالغنی اور مولانا مفتی شیخ احمد وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ حضرات علمائے عظام تھے، جو علوم شریعت کے ماہر اور مبلغ تھے اور احکامِ شرعیہ میں خواجہ معین الدین کشمیری سے طالبِ فتویٰ ہوتے تھے۔ یعنی وہ وضاحتِ مسائلِ شرعیہ اور افتا میں خواجہ ممدوح علمائے کشمیر کے مرکز و مرجع تھے، خطۂ کشمیر کے ارکانِ دولت، اربابِ حکومت اور خواص و عوام سب اس سلسلے میں ان سے رجوع کرتے تھے۔

خواجہ معین الدین کشمیری نے کشمیری مسلمانوں میں اتباعِ شریعت اور ترویجِ سنت کا جذبہ پیدا کیا، بدعات کو ختم کرنے اور خلافِ شرع رسوم کو مٹانے میں بے حد کوششیں کیں۔ وہ زاہد و عابد اور متقی و متورع عالم و فقیہ تھے مصنف بھی تھے، فتاوی نقشبندیہ اور کنز السعادات، مسائل فقہ میں ان کی تصنیفات ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں سیر و سلوک سے متعلق ایک رسالہ "رضوانی" لکھا۔ مراۃ القلوب، سید خیر البشر اور مراۃِ طیبہ بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ سعیدیہ لائبریری ٹونک میں ان کی دو ضخیم تفسیریں بھی ہیں۔ ایک زبدۃ التفاسیر عربی میں اور دوسری شرح القرآن فارسی میں۔!

خواجہ ممدوح نے ماہِ محرم ۱۰۸۵ھ میں کشمیر میں وفات پائی[۱]

۱۵۴۔ شیخ منوّر لاہوری

شیخ منور بن عبدالحمید بن عبدالشکور بن سلیمان بن اسرائیل لاہوری، علومِ

---

[۱] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۶۷ تا ۱۶۹ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۹ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۲۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۰۶، ۴۰۷ — رودِ کوثر، ص ۱۴۰ — ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ۔ مارچ ۱۹۶۷ء

عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ شیخ سعد اللہ بن ابراہیم لاہوری ان کے خالو تھے، جو اپنے وقت کے جیّد عالم اور متقی بزرگ تھے، انہی سے اخذِ علم کیا اور مرتبۂ عالی کو پہنچے، قوتِ حفظ و ادراک نہایت تیز تھی۔ تقریباً بیس[۲] سال کی عمر میں علومِ متداولہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تھے۔ قرأت و تجوید پر عبور رکھتے تھے اور قراتِ سبعہ کے عالم تھے، حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کے زیور سے آراستہ تھے، مغل بادشاہ جلال الدین اکبر ان کی فراوانیٔ علم و فضل سے بہت متاثر تھا، ۹۸۵ھ میں اس نے ان کو مالوہ کے منصبِ صدارت پر مامور کیا۔ جب وہ مالوہ کے شہر سارنگ پور پہنچے تو وہاں علما و فضلا اور اصحابِ طریقت و سلوک کی ایک جماعت موجود تھی، انھوں نے جوش اور مسرت سے انھیں خوش آمدید کہا اور بڑی تکریم سے پیش آئے۔ دس سال سارنگ پور میں قیام رہا، منصبِ صدارت کے ساتھ ساتھ وہاں غلغلۂ تدریس بھی بلند کیے رکھا، اس اثنا میں بے شمار شائقینِ علم و عرفان نے ان سے استفادہ کیا اور شہرتِ علمی پورے ملک میں پھیل گئی۔

شیخ منوّر ارضِ لاہور کے وہ عالمِ کبیر ہیں، جن کا ذہنِ رسا، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق و حکمت اور تمام علوم مروجہ کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اکبر کے سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہونے سے پہلے چوالیس[۴۴] سال اقلیم علم میں سیاحت کناں رہے اور درس و تدریس کو بنیادی مشغلہ قرار دیے رکھا۔

امیر فتح اللہ شیرازی (متوفی ۹۹۷ھ)، ان کے علم و فضل کے بہت مداح تھے۔ یہ شیراز میں پیدا ہوئے تھے۔ مسلکاً شیعہ تھے اور علومِ حکمیہ کے متبحر عالم تھے، بیجاپور کے بادشاہ علی عادل شاہ کی دعوت پر ہندوستان آئے اور اس کے پاس بیجاپور میں قیام پذیر ہوئے۔ اس کے قتل کے بعد ۹۹۱ھ میں آگرہ گئے اور جلال الدین اکبر بادشاہ سے ملاقات ہوئی، اکبر نے ان کی بڑی پذیرائی کی۔ ۹۹۳ھ میں منصبِ صدارت عطا کیا اور امین الملک کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ پھر عضد الدولہ کا خطاب دیا، بعد ازاں عضد الملک کے لقب سے نوازا اور دیوانِ وزارت میں

داخل کیا، اپنے دور کے فحول علما اور مشاہیر حکما میں سے تھے۔ جب یہ اکبر کے فرمان کے مطابق آگرہ گئے تو شیخ منور لاہوری بھی وہیں سکونت فرما تھے۔ ایک روز منطق و حکمت کے موضوع پر شیخ منور سے گفتگو ہوئی تو بہت سے فکری عقدے حل ہوئے اور متعدد علمی گوشوں سے پردے اُٹھے، خوش ہو کر شیراز کے اس عظیم عالم نے فرمایا۔ سیرِ ہند کرتے ہوئے مدت گزر گئی، اس طویل عرصے میں آج پہلا موقعہ ہے کہ شیراز کی مہکِ علمی دماغ آرزومند میں پہنچی ہے۔

حکیم شمس الدین علی گیلانی، اکبر کی عنایاتِ شاہی سے حکیم الملک کے خطاب سے سرفراز تھے اور مولانا شاہ محمد شاہ آبادی سے نسبتِ تلمذ کرتے تھے، ان کے بارے میں شیخ منور لاہوری کے بیٹے شیخ کبیر کا بیان ہے کہ ایک روز بادشاہ کے حضور عرض گزار ہوئے کہ تفسیر بیضاوی اور دیگر منتہی کتابوں پر ان کے استاذ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے ایسے اعتراضات کیے ہیں کہ علمائے وقت ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں، اور شاہ آبادی عالم اس باب میں سب پر غالب ہیں۔ حکیم گیلانی نے شاہنشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ علما کی مجلس منعقد کر کے ان کے اعتراضات و ایرادات سے متعلق گفتگو کی جائے۔ چنانچہ اکبر نے جو پہلے ہی اس قسم کی مجالس کے انعقاد کا متمنی رہتا تھا، اس کا انتظام کیا اور مجلسِ علما میں علم و عقل کا دنگل شروع ہوا۔ چنانچہ قرآن کی آیت: وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ کی تفسیر پر حکیم موصوف نے مولانا شاہ آبادی کا اعتراض پیش کیا۔ قاضی صدر الدین لاہوری ثالث مقرر ہوئے۔ شیخ منور نے اس انداز سے اس آیۂ کریمہ کی وضاحت کی اور اس اسلوب سے اعتراض کا جواب دیا کہ حاضرینِ مجلس حیران رہ گئے۔ قاضی صدر الدین نے شیخ کو داد دیتے ہوئے کہا کہ شیخ منور نے قاضی ناصر الدین بیضاوی کی عبارت کی اس حسن و خوبی سے وضاحت کی ہے اور اس عمدگی سے اعتراض کا جواب دیا ہے کہ اگر خود بیضاوی موجود ہوتے تو شیخ کی نگاہِ دور بین کی تحسین فرماتے۔

دس سال کے بعد ۹۹۵ھ میں اکبر نے شیخ منور کو سارنگ پور (مالوہ) کے عہدۂ صدارت سے معزول کیا اور ان کی جگہ عضد الدولہ میر فتح اللہ شیرازی کو صدر مقرر کر کے بھیجا۔ میر شیرازی وہاں پہنچے تو شیخ منور سے بعض علمی نکات پر بحث شروع ہوئی۔ شیخ منور نے مقدمہ طوالع کی شرح ان کو دکھائی جس کی عبارت بڑی مشکل اور الجھی ہوئی تھی۔ میر فتح اللہ نے جواب کے لیے ایک دن کی مہلت مانگی، دوسرے دن پھر گفتگو شروع ہوئی تو فرمایا میں نے اس پر کچھ مسوّدہ تیار کیا ہے، جس سے مسئلۂ زیرِ بحث کی عقدہ کشائی ہوتی ہے، کسی شخص کو میرے ساتھ بھیجیے تاکہ میں اسے صاف کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ شیخ کا فرستادہ دو تین منزل تک ان کے ساتھ گیا اور بغیر جواب لیے واپس آگیا۔

بہر حال شیخ منور لاہوری بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ اکبر نے ۹۹۵ھ میں ان کو سارنگ پور کی صدارت سے معزول کر کے قلعہ گوالیار میں محبوس کر دیا، پانچ سال قید و بند میں مبتلا رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے بڑا تصنیفی کام کیا۔ چنانچہ "الدرر النظیم فی ترتیب الآی و سور القرآن الکریم" کے نام سے قرآن کی تفسیر لکھی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تفسیر قرآن حکیم "البحر المواج" کو جو فارسی زبان میں ہے، عربی میں منتقل کیا، ایک کتاب "حدائق البیان شرح علی بدیع البیان"، سپر دِ قلم کی، شرحِ طوالع لکھی، بوصیری کے قصیدہ بردہ کی شرح قلم بند کی، ایک رسالہ "الحق الصریح فی اثبات عدم قبول التوبۃ لساب النبی صلی اللہ علیہ وسلم" تحریر کیا۔ یہ رسالہ انھوں نے مخدوم الملک شیخ عبد اللہ سلطان پوری کے جواب میں لکھا تھا، عبد اللہ سلطان پوری نے ایک رسالے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب و شتم کرنے والوں کی قبولیتِ توبہ کا اثبات کیا ہے، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی "الارشاد" کی شرح بھی لکھی، نیز شیخ حسن صغانی لاہوری (متوفی ۶۲۰ھ) کی حدیث کی مشہور کتاب "مشارق الانوار"

کی شرح سپردِ قلم فرمائی۔

شیخ منور پانچ برس قلعہ گوالیار میں قید رہے، اس مدت میں انھوں نے اپنی تفسیر "الدر النظیم فی ترتیب الآی وسور القرآن الکریم" اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی (متوفی ۲۵ رجب ۸۴۹ھ) کی تفسیر "البحر المواج" کو عربی کے قالب میں ڈھال لیا تھا، اور دونوں تفسیروں کا مسودہ مکمل کر لیا تھا۔ اب وہ نظر ثانی اور تصحیح کرنا چاہتے تھے کہ فرماں روائے ہند جلال الدین اکبر کے غیظ و غضب کا پارہ اور چڑھ گیا اور وہ تمام کتابیں جو جیل میں لکھی تھیں، اور کم و بیش ڈیڑھ ہزار اجزا پر مشتمل تھیں، ایک ایک ورق کر کے چھین لی گئیں اور کتب خانہ شاہی میں جمع کر دی گئیں۔ افسوس ہے وہ سب کتابیں ضائع ہو گئیں، صرف ایک کتاب تفسیر قرآن "الدر النظیم فی ترتیب الآی وسور القرآن الکریم" محفوظ رہ سکی، جو کسی طرح قید خانے میں مصنف کے پاس رہ گئی تھی۔

اسی اثنا میں بادشاہ کا غصہ اور بڑھا تو حکم صادر ہوا کہ شیخ منور کو قلعۂ گوالیار سے دار الخلافہ آگرہ میں لایا جائے، اس حکم کی تعمیل کی گئی اور زندگی کے جو چند روز باقی رہ گئے تھے، نہایت تنگی اور تاریکی میں بسر کیے۔ بالآخر ۱۲ ذی القعدہ ۱۰۱۱ھ کو اس عالمِ کون و فساد سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ موت کے بعد مرکزِ علم و تحقیق لاہور کے اس جلیل القدر عالم و فقیہ اور مفسر و محدث کو غربا اور فقرا کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ بعد ازاں ماہِ محرم ۱۰۱۵ھ میں ان کے فرزندانِ گرامی کسی مناسب تدبیر سے رفیع المرتبت باپ کی میت کو خاکِ آگرہ سے نکال کر لاہور لے آئے، اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیا[۵۳]

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بادشاہ کی ناراضی کی اصل وجہ کیا تھی۔ دس سال مالوہ کی صدارت پر مامور رہے۔ اس عرصے میں بادشاہ ان سے خوش رہا۔ ۹۹۵ھ

---

۵۳ اذکارِ ابرار (ترجمہ گلزارِ ابرار)، ص ۴۷۲ تا ۴۷۵ ـــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۱، ۴۱۲

میں میر فتح اللہ شیرازی کو اس منصب پر مامور کیا۔ ان سے شیخ کی علمی بحثیں رہیں، وہ شیخ کی رفعتِ علمی سے بہت متاثر تھے۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ ناراضی کی بنیاد کیا شی تھی۔ ہو سکتا ہے، اکبر کی تبدیلیٔ مذہب سے انھیں اختلاف ہو، وہ اس پر نکتہ چینی کرتے ہوں اور دربار کے کسی شخص نے ان کے خلاف اکبر کے کان بھر دیتے ہوں۔ وجہ ناراضی پردۂ راز میں ہے۔

۱۵۵۔ شیخ مودود کالپوی

شیخ مودود بن اولیا بن سراج حنفی کالپوی، علم و مشیخت کی گود میں پلے بڑھے اور اپنے والد گرامی شیخ اولیا کے ساتھ سعادتِ حج حاصل کی۔ شیخ علی متقی کے خلیفہ شیخ عبدالوہاب بن ولی اللہ متقی برہان پوری سے حدیث کا درس لیا، عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے اور حدیث کے ماہر علما میں شمار ہوئے[۱۷۳]

۱۵۶۔ سید میرانِ بیجاپوری

سید میران بن اسد اللہ بن عبد اللہ بن وجیہ الدین علوی بیجاپوری کا مولد و منشا گجرات ہے، گجرات کے علمائے عظام سے اخذِ علم کیا اور نامور فقہا و علما میں شمار کیے گئے۔ زہد و مجاہدہ میں بھی ممتاز تھے۔ حصولِ علم کے بعد گجرات سے بیجاپور چلے گئے تھے، اس زمانے میں وہاں کا حکمران ابراہیم عادل شاہ تھا، بیجاپور میں درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا اور اسی عظیم کارِ خیر میں عمر صرف کر دی۔

جمادی الاولیٰ ۱۰۵۵ھ کو بیجاپور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے[۱۷۴]

---

[۱۷۳] اذکارِ ابرار (ترجمہ گلزار ابرار)، ص ۴۸۳، بضمن یادِ شیخ اولیا — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۳

[۱۷۴] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۵

ن

۱۵۷۔ شیخ ناصر الدین شیخ پوری

شیخ ناصر الدین شیخ پوری، عالم و فقیہ تھے اور خواجہ کلاں بن نصیر الدین جھونسوی الہ آبادی کے سلسلۂ طریقت سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ تاج الدین جھونسوی سے اخذِ علم و معرفت کیا اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے، تا آنکہ مرتبۂ مشیخت کو پہنچے۔ شیخ طیبؒ بن معین بنارسیؒ سے بھی شرفِ اجازہ حاصل کیا۔ جمعۃ المبارک کے دن غرہ ربیع الاول ۱۰۶۸ھ کو فوت ہوئے۔[۱]

۱۵۸۔ قاضی نصیر الدین برہان پوری

قاضی نصیر الدین بن قاضی سراج محمد برہان پوری، شیخ و عالم اور محدث و فقیہ تھے، حدیث و فقہ اور علومِ عربیہ میں اس درجہ عبور رکھتے تھے کہ اس دور میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ حدیث و رجال پر پوری نظر تھی، متبع کتاب و سنت اور پابندِ احکامِ شرعیہ تھے۔ حصولِ علم اپنے والد گرامی قاضی سراج محمد (متوفی ۳ شعبان ۱۰۱۰ھ) سے کیا۔ شیخ عثمان بن عیسٰی سندھی (متوفی شعبان ۱۰۰۸ھ) سے بھی تحصیل کی، طویل عرصہ ان کی خدمت میں گزارا اور بہت مستفید ہوئے، حتٰی کہ اپنے تمام معاصرین سے سبقت لے گئے۔ بحث و مناظر میں بہت تیز تھے اور علمی و تحقیقی مباحث میں درک کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ جب کہ صرف اٹھارہ برس کی عمر تھی، فلسفہ و حکمت اور ہیئت و ریاضی کے نامور فاضل علامہ شکر اللہ شیرازی (متوفی ۱۸ رمضان ۱۰۴۸ھ) سے پنجہ آزما ہو گئے اور دلائل کے زور سے انھیں خاموش کرا دیا۔

---

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۶ بحوالہ گنج ارشدی۔

قاضی نصیر الدین برہان پوری ان علمائے کرام میں سے تھے جو حدیث کو قیاسِ مجتہد پر ترجیح دیتے تھے اور ارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں قولِ امام کو ہرگز نہ مانتے تھے۔ وہ صاف لفظوں میں کہا کرتے تھے کہ اگر ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہو اور دوسری طرف امام ابو حنیفہ کا قول ہو تو ترجیح بہرحال فرمانِ رسولِ اکرم کو حاصل ہوگی، امام ابوحنیفہ کا قول حدیث کے مقابلے میں رد کر دیا جائے گا۔ وہ ہر صورت میں اپنے اس موقف پر قائم رہتے اور کسی کی کوئی پروا نہ کرتے تھے۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حدیث "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" موضوع ہے۔ ان کے سُسر شیخ علم اللہ بیجاپوری (متوفی ۱۱ ذی الحجہ ۱۰۲۴ھ) اس سلسلے میں انتہائی سخت اور ان کے مخالف تھے، وہ قاضی نصیر الدین کی یہ بات بالکل نہ مانتے تھے، لیکن قاضی نصیر الدین بے جھجک ان کے سامنے اس قسم کی باتیں کرتے رہتے۔ ایک مرتبہ شیخ علم اللہ بیجاپوری نے قولِ امامِ ابوحنیفہ سے استدلال کیا تو قاضی نصیر الدین نے مخالفت کی اور اس کے مقابلے میں حدیث پیش فرمائی، شیخ نہ مانے تو قاضی ممدوح نے کہہ دیا کہ "ھو رجل و انا رجل" (امام ابوحنیفہ بھی انسان ہیں اور میں بھی انسان ہوں) یعنی اصل شی جو ہمارے لیے قابلِ حجت ہے، وہ حدیثِ رسول ہے نہ کہ قولِ امام، جس میں امکانِ خطا موجود ہے۔ اس پر شیخ علم اللہ نے غصے میں آکر تلوار نکال لی اور اپنے داماد قاضی نصیر الدین کو قتل کرنے کے لیے ان کے پیچھے دوڑے۔ لیکن قاضی نے بھاگ کر جان بچائی۔ شیخ نے ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور حکم دیا کہ انھیں آگ میں جلا دیا جائے۔ ساتھ ہی علما کا محضر طلب کر لیا، تمام علمانے ان کے فتوے پر تصدیق کی مہریں ثبت کر دیں۔ البتہ دو جلیل القدر عالموں ــــ شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری (متوفی ۲ رمضان ۱۰۲۹ھ) اور شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی (متوفی ۱۴ شوال ۱۰۳۱ھ) ــــ نے اس کی تصویب و تصدیق نہیں کی۔

اس موقع پر عبدالرحیم خان خاناں نے ان کی امداد کی، معاملہ جب بہت ہی نازک صورت اختیار کر گیا تو ہندوستان کے بادشاہ جہاں گیر کو اطلاع دی گئی۔ اس نے قاضی نصیر الدین اور شیخ علم اللہ دونوں کو لشکر گاہ میں بلایا، لیکن بادشاہ کی خدمت میں جانے کے بجائے، شیخ علم اللہ تو بیجا پور چلے گئے اور وہاں کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ سے منسلک ہو گئے اور قاضی نصیر الدین نے حجاز کا عزم فرمایا۔ اس موقع پر عبدالرحیم خان خاناں نے ان کی مدد کی اور حجاز جانے کے لیے سفر خرچ عطا کیا۔ قاضی پانچ سال مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔

قاضی نصیر الدین برہان پوری حجاز سے واپس آ رہے تھے کہ ان کا جہاز فرنگیوں کے قبضے میں آ گیا۔ فرنگیوں سے قاضی ممدوح کی گفتگو ہوئی تو وہ ان کی فہم و فراست اور کمالاتِ علمی سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھیں اپنے بادشاہ کے پاس لے گئے۔ دربار میں پہنچے تو قاضی موصوف نے فرنگی بادشاہ کو سلام نہ کیا۔ فرنگیوں نے پوچھا کہ آپ سلام و آداب کیوں بجا نہیں لائے، فرمایا کہ بادشاہ کے لیے جو تمھارے ہاں اسلوب آداب مروّج ہیں، وہ اسلام میں نہیں ہیں۔ کچھ عرصہ وہاں محصور رہے، اس کے بعد رہا کر دیے گئے اور ۱۰۲۴ھ میں ابراہیم عادل شاہ کی سلطنت میں بندرگاہ وائل میں داخل ہوئے۔ ابراہیم عادل شاہ کو اپنے ملک میں ان کی آمد کی اطلاع ملی تو تین میل آگے بڑھ کر استقبال کیا اور انتہائی اعزاز کے ساتھ اپنے دار الخلافہ میں لایا۔

کچھ عرصہ بعد ہندوستان کے بادشاہ جہاں گیر کو ان کی تشریف آوری اور بیجا پور میں سلطان ابراہیم عادل شاہ کے پاس قیام کا پتا چلا تو حکیم ہمام کے بیٹے حکیم خوشحال کو ان کی خدمت میں بھیجا اور تاکید کی کہ ہر حال میں آگرہ کے لشکر گاہ میں لے کر آئیں۔ قاضی نصیر الدین کو اس کا علم ہوا تو وہ بیجا پور سے برہان پور چلے گئے اور اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ گھر سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اسی اثنا میں شہزادہ شاہ جہان

آگرہ سے دکن جاتے ہوئے برہان پور پہنچا تو قاضی ممدوح کو یاد فرمایا، قاضی نے پہلے تو شہزادے کے پاس جانے سے انکار کیا، لیکن بعد میں لوگوں کے کہنے سے چلے گئے۔ مگر آدابِ بادشاہت بجانہیں لائے، شہزادے نے بھی اس کی پروا نہیں کی، بڑی عزت سے پیش آیا اور کہا کہ ہم آپ سے ملاقات کے بہت مشتاق تھے۔ قاضی نے پوچھا، کس بنا پر؟ کہا، آپ کے کمالاتِ علمی سنتے تھے۔ قاضی نے جواب دیا، اب مجھ میں وہ کیفیت باقی نہیں رہی۔ قاضی کے اس جواب سے اگرچہ مجلس میں کچھ تکدر کے آثار پیدا ہوئے، لیکن بادشاہ نے اس کو اہمیت نہ دی اور معاملہ وہیں ختم ہوگیا۔

شہزادہ شاہ جہان نے قاضی سے عرض کیا کہ اس کے والد جہان گیر بادشاہ ان سے ملاقات کے بہت خواہاں ہیں، وہ ہر حال میں آگرہ تشریف لے جائیں۔ بڑے اصرار کے بعد وہ آگرہ کو روانہ ہوئے۔ ابھی دربارِ شاہی میں نہیں پہنچے تھے کہ بادشاہ کی سواری باغ سے محل کی طرف جارہی تھی۔ قاضی نصیر الدین نے سلام کرنا چاہا تھا کہ بادشاہ کی نظر ان پر پڑگئی۔ وہ دوڑ کر آیا اور ان کے ہاتھ پکڑ کر بغل میں لے لیا۔ کچھ روز آگرہ میں رہے، اس کے بعد اپنے شہر برہان پور چلے گئے اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرلی۔

قاضی نصیر الدین کا حلقۂ تلمذ بڑا وسیع تھا، جن علما نے ان سے کسبِ علم کیا، ان میں فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کے سربراہ اور اورنگ زیب عالم گیر کے استاذ شیخ نظام الدین برہان پوری بھی شامل ہیں، جو بہت بڑے عالم و فقیہ تھے۔

قاضی نصیر الدین برہان پوری نے ۱۰۳۱ھ کو وفات پائی [2]

[2] مآثرِ رحیمی، ج ۳، حصہ اوّل، ص ۲۰ تا ۲۲ — تاریخ برہان پور، ص ۱۵۳، ۱۵۴ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۳۸، ۲۳۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۱۷، ۲۱۸۔

۱۵۹۔ شیخ نظام الدین تھانیسری

شیخ نظام الدین بن عبدالشکور عمری بلخی تھانیسری عالم و فقیہ اور زاہد و عابد تھے، مشائخ چشتیہ میں سے تھے، علم و عمل کے جامع اور ریاضت و مجاہدہ کے دلدادہ تھے، شیخ جلال الدین عمری تھانیسری (متوفی ۹۸۹ھ) سے اخذِ علم کیا جو اُن کے چچا اور سُسر تھے، ان کے بعد مسندِ مشیخت پر فائز ہوئے۔ ۱۰۰۷ھ کو سفرِ حج پر روانہ ہوئے دورانِ سفر میں برہان پور پہنچے تو شیخ عیسیٰ سندھی نے اعیان و اکابر کے ساتھ بڑھ کر ان کا استقبال کیا، کچھ عرصہ برہان پور میں ٹھہرایا اور مستفید ہوئے۔ ۱۰۲۰ھ کو واپس ہندوستان آئے، واپسی پر بیجاپور سے گزرے تو وہاں کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا، اور بے حد عزت و احترام سے پیش آیا۔ بعد ازاں اپنے وطن تھانیسر گئے اور درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔

جب شہزادہ خسرو نے اپنے باپ جہاں گیر بادشاہ کے خلاف بغاوت کی اور برسرِ پیکار ہوا تو وہ تھانیسر سے گزرتے ہوئے شیخ نظام الدین سے بھی ملا، جس کی وجہ سے جہاں گیر کے دل میں شیخ کے متعلق اپنی مخالفت کا شبہ پیدا ہوا اور اس کا دل غصے سے بھر گیا، چنانچہ اس نے ہندوستان سے ان کی جلاوطنی کا حکم صادر کیا اور وہ بلخ چلے گئے، بلخ میں مدتِ مدید تک درس و افادہ میں مصروف رہے، اس اثنا میں علماء و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ خود والیٔ بلخ سلطان امام قلی ازبک ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔ وہ ہفتے میں ایک مرتبہ ان کی خدمت میں آتا اور فیض حاصل کرتا۔

شیخ نظام الدین تھانیسری مصنف اور شارح بھی تھے۔ غزالی کی شرح سوانح، عراقی کی شرح لمعات، رسالہ حقیقیہ، رسالہ بلخیہ وغیرہ ان کی تصنیفات ہیں۔ تفسیر نظامی کے نام سے قرآنِ مجید کی تفسیر بھی لکھی —— اس عالم و فقیہ نے

۲۶ شوال ۱۰۲۴ھ کو (ایک روایت کے مطابق ۱۰۳۶ھ کو) بلخ میں انتقال کیا۔[۵۳]

۱۶۰۔ سید نظام الدین سندھی

سید نظام الدین بن نور محمد بن شکر اللہ بن ظہیر الدین بن شکر اللہ حسینی ٹھٹھوی سندھی، فقہ و اصول کے نامور علما میں سے تھے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو دہلی گئے اور فتاویٰ عالم گیری کی تدوین میں بھرپور حصہ لیا۔ تدوینِ فتاویٰ کے بعد سلطان اورنگ زیب عالم گیر سے فوجی منصب کے طالب ہوئے مگر بادشاہ نے یہ درخواست قبول نہ کی، کیوں کہ وہ علما کو فوجی خدمات پر مامور نہ کرتا تھا۔ اس کے بدلے میں اورنگ زیب عالم گیر نے ان کا سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا، لیکن وہ اس وظیفے پر خوش نہ تھے اور تادمِ وفات دار الخلافہ ہی میں رہے۔

تذکرہ علمائے ہند کی روایت کے مطابق سید نظام الدین ٹھٹھوی علم فقہ میں کامل اور دیگر علوم میں عالمِ اجلّ اور ماہر تھے، جذبۂ رغبتِ طبع کی بنا پر دہلی تشریف لے گئے اور فتاویٰ عالم گیری کی تدوین میں شامل ہو کر فقہ کے بہت سے مشکل اور پیچیدہ مسائل کی عقدہ کشائی کی۔

سید شیخ نظام الدین ٹھٹھوی، سندھ کے ایک بلند پایہ علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، ان کے آباو اجداد شیراز کے رہنے والے تھے، جنھوں نے بعد کو ہرات میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس خاندان کے ایک بزرگ قاضی شکر اللہ تھے جو حدیث، فقہ، اصول اور علومِ عربیہ کے جیّد علما میں سے تھے اور تدین و اتقا سے بہرہ ور تھے۔

۵۳؎ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۱، ۲۸۸ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۱، ۴۰۲ — خزینۃ الاصفیا، ص ۴۶۳ تا ۴۶۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۸، ۴۱۹ — علمائے ہند کا شاندار ماضی، ج ۱، ص ۴۵۱ تا ۴۵۵

قاضی شکر اللہ ۹۰۶ھ میں ہرات سے قندھار منتقل ہوئے۔ اکیس سال وہاں مقیم رہنے کے بعد ۹۲۷ھ میں سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں تشریف لائے۔ اس زمانے میں سندھ کا حکمران شاہ بیگ تھا، اس نے ان کی خداداد صلاحیتوں اور حُسنِ سیرت سے متاثر ہو کر ٹھٹھہ کی مسندِ قضا پر مامور کر دیا۔ اس منصب کی ذمہ داریوں کو انھوں نے نہایت وقار و احترام اور دبدبہ و طنطنہ کے ساتھ انجام دیا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ شاہ بیگ کے بعد اس کا بیٹا شاہ حسن تختِ سندھ کا وارث بنا تو اس نے بعض تاجروں سے چند گھوڑے خریدے اور ان کی قیمت ادا کرنے میں عمداً تساہل اور تاخیر سے کام لیا۔ تاجروں نے ناامید ہو کر قاضی شکر اللہ سے رجوع کیا اور ان کی عدالت میں بادشاہ کے خلاف مدعی بن کر حاضر ہوئے۔ قاضی موصوف نے مدعیٰ علیہ بادشاہ کو عدالت میں طلب کیا۔ بادشاہ قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا تو اُسے مدعی تاجروں کے ساتھ کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا۔ دعویٰ پیش ہوا، قاضی کے سوال پر مدعی علیہ بادشاہ نے تاجروں کے موقف کی تصدیق کی اور قیمت ادا نہ کرنے کا اقرار کیا۔ قاضی نے تاجروں کے حق میں فیصلہ دیا اور سلطان نے تاجروں کو قیمت ادا کر دی۔

فیصلے کے بعد قاضی شکر اللہ اپنی جگہ سے اُٹھے، قاعدے کے مطابق آدابِ سلطانی بجا لائے اور بادشاہ کو اپنے پاس بٹھایا۔ اب بادشاہ نے تلوار نکالی جو اس نے قبا میں چھپا رکھی تھی اور اسے قاضی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تلوار میں نے آپ کے لیے رکھی تھی، اگر آپ صحیح فیصلہ نہ کرتے اور میرے لحاظ و آداب میں اپنے مقام و منصب کا خیال نہ رکھتے تو اس تلوار سے آپ کی گردن اڑا دیتا۔“ اس کے بعد بادشاہ اس فیصلے پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے عدالت سے باہر نکل گیا۔

اس نے تاجروں کو صرف اس بنا پر قیمت ادا کرنے میں تاخیر کی تھی کہ وہ قاضی شکر اللہ کو اپنے بارے میں آزمانا چاہتا تھا اور اُسے یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ قاضی صحیح فیصلہ کرتا ہے یا نہیں۔ اس واقعہ سے کچھ عرصہ بعد قاضی شکر اللہ منصب

قضا سے الگ ہو گئے اور لوگوں سے منقطع ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

تحفۃ الکرام میں تاریخ طاہری کے حوالے سے یہ سارا واقعہ بیان کر کے لکھا ہے کہ قاضی شکر اللہ نے بھی بادشاہ کی بات سن کر مسند کے نیچے سے برہنہ تلوار نکالی اور اسے دکھائی اور کہا "میں نے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ مبادا بادشاہ خلافِ شرع قدم اٹھائے اور کوئی شخص اس کو ٹوکنے کی جرأت نہ کرے، اگر یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تو میں خود اس تلوار سے سیاستِ شرعی بجا لاؤں گا۔"

قاضی سید شکر کی نسبت سے میر سید نظام الدین کا خاندان ٹھٹھہ میں ساداتِ شکر اللٰہی کے نام سے موسوم ہوا۔ اس خانوادہ کے تقریباً تمام افراد علم و فضل اور مرتبۂ دینی کی وجہ سے یگانۂ روزگار ہیں۔ اب بھی ان کا خاندان اپنے قدیم محلے میں آباد ہے۔[۱۶۵]

۱۶۱۔ شیخ نظام الدین برہان پوری

شیخ نظام الدین برہان پوری، اکابر علمائے حنفیہ اور مشہور فقہائے ہند میں سے تھے، ان کا شمار ان خوش بخت اہلِ علم میں ہوتا ہے، جو علوم میں متبحرِ کامل تھے، اور جنھوں نے تحریرِ مسائل، نقلِ احکام اور محاسنِ فتویٰ نویسی میں خاص طور سے نام پیدا کیا۔ ان کو قاضی نصیر الدین محدث برہان پوری سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ جس زمانے میں عالم گیر اپنے والد شاہ جہان بادشاہ کی طرف سے بلادِ دکن میں والی کی حیثیت سے متعین تھا، اس زمانے میں اس نے شیخ نظام الدین کو اپنے ساتھ وابستہ کر کے اپنے خاص ندیموں اور مشیروں میں شامل

---

[۱۶۵] تفصیل کے لیے دیکھیے۔ تحفۃ الکرام، ص ۵۹۲ و ۶۰۰ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۸۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۳۸، ۱۳۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۹، ۴۲۰ — ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ) بابت ماہ جون ۱۹۴۷ء، مضمون، "فتاوی عالم گیری کے دو سندھی مؤلفین اور ان کے اجداد" — برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ، ص ۲۷۷ تا ۲۷۹

کر لیا تھا۔ بعد ازاں جب وہ بادشاہ بنا اور ہندوستان کی عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تو فتاویٰ عالم گیری (فتاویٰ ہندیہ) کی تدوین و ترتیب کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس نے دیگر فقہائے حنفیہ کی خدمات حاصل کر کے اس کا اہتمام شیخ نظام الدین کے سپرد کر دیا، اور ان فقہا میں سے چار کو اس طرح ان کے نائب مقرر کیا کہ فتاوے کے چار حصے کر کے ان چار فقہا میں تقسیم کر دیے، ان میں سے ایک قاضی محمد حسین جون پوری محتسب، دوسرے سید علی اکبر سعد اللہ خانی، تیسرے شیخ حامد جون پوری اور چوتھے مفتی محمد اکرم لاہوری تھے۔

شیخ نظام الدین برہان پوری نے اس خدمتِ جلیلہ کی انجام دہی کے لیے اپنی تمام مساعی وقف کر دیں، یہاں تک کہ اس ضخیم و مبسوط فتاویٰ کو دو سال کی مختصر مدت میں مرتب کر دیا۔ اس کے نتیجے میں عالم گیر نے ان کے منصب میں بڑا اضافہ کیا اور ان تمام تکلفاتِ شاہی اور مروجہ درباری تسلیمات سے جو بادشاہ کے ہاں حاضری کے وقت ضروری تھیں اور جنھیں کورنش سے تعبیر کیا جاتا تھا، انھیں مستثنیٰ قرار دے دیا۔

عالم گیر کے نزدیک شیخ نظام الدین برہان پوری، علمی اعتبار سے اس قدر او نچا مرتبہ رکھتے تھے کہ وہ ان سے ہفتے میں تین دن امام غزالی کی احیاء علوم الدین، فتاویٰ عالم گیری اور بعض کتب سلوک سے متعلق مذاکرہ کرتا۔

شیخ نظام الدین پورے چالیس سال عالم گیر سے وابستہ رہے اور اسّی سال سے زائد عمر پائی۔ ۱۰۹۲ھ میں فوت ہوئے۔ ان کے ایک بیٹے عبداللہ تھے، جنھوں نے اپنے باپ (شیخ نظام الدین برہان پوری) سے اخذِ علم کیا اور اپنے عصر میں بڑی فضیلت و تکریم کے مستحق قرار پائے۔[۵۵]

---

۵۵ عالم گیر نامہ، ص ۱۰۸۷ھ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۲ — مرأۃ العالم، ص ۲۷۴ — مآثر عالم گیری، ص ۵۲۹، ۵۳۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۲۰ — فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۱۰۱، ۱۰۲ — تاریخ برہان پور، ص ۱۵۴ — انفاس العارفین، ص ۲۴ — برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ، ص ۲۶۹ تا ۲۷۷

۱۶۲۔ سید نعمت اللہ فیروز پوری

سید نعمت اللہ بن عطاء اللہ نارنولی فیروز پوری کا لقب جلال الدین تھا۔ عالم کبیر اور فاضلِ وقت تھے، مولد و منشا نارنول ہے، بڑے ہوئے تو حصولِ علم کے لیے مختلف بلاد و امصار کی خاک چھانی، جون پور بھی گئے اور شیخ محمد افضل عثمانی جون پوری سے علم ہیئت پڑھا، پھر ازدواجی زندگی اختیار کی اور فیروز پور میں متوطن ہوئے۔ فیروز پور (مضافاتِ گوڑ) میں سیف خاں نے انھیں کچھ زمین عطا کر دی تھی۔ شاہ جہان بادشاہ کا بیٹا شاہ شجاع جب باپ کی طرف سے بنگال کا والی بنا تو اُن کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گیا تھا اور شہزادے کی بیعت اور خود ان کے زہد و تقویٰ کی بنا پر لوگوں میں انھیں بے حد مقبولیت اور شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ پھر جب شجاع شکست کھا گیا اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں بھاگ گیا تو زمامِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ نے انھیں پانچ ہزار روپے نقد مرحمت فرمائے۔

شیخ نعمت اللہ فیروز پوری متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں قرآنِ مجید کی ایک تفسیر ہے جو تفسیر جلالین کے انداز میں ہے، یہ تفسیر صرف چھ مہینے کی مختصر مدت میں لکھی اور ۱۰۷۰ھ میں مکمل کی۔ ایک ترجمہ قرآن ہے جو جہاں گیر کے لیے لکھا اور اس کی طرف منسوب کیا، اس کا نام "تفسیر جہاں گیری" ہے۔

اس ہندی عالمِ دین نے ۱۰۷۲ھ کو وفات پائی[۲۶]۔

۱۶۳۔ مفتی نور الحق دہلوی

مفتی نور الحق دہلوی، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے

---

[۲۶] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۲۳، ۴۲۴ — فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۶۶ تا ۶۸ — گنجِ ارشدی — مرآۃ العالم

فرزند کبیر تھے۔ ۹۸۳ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے، تعلیم و تربیت عظیم المرتبت باپ ہی کی آغوش میں پائی۔ شیخ و امام، عالم و عامل اور محدث و فقیہ تھے۔ کبار فقہائے حنفیہ اور مشاہیر مشائخ ہند میں سے تھے۔ علمِ حدیث اور دیگر علوم باپ ہی سے حاصل کیے۔ شیخ محدث کی زندگی ہی میں اکبر آباد (آگرہ) کے منصبِ قضا پر فائز ہو گئے تھے۔ بات یہ ہے کہ شاہ جہان زمانۂ شہزادگی سے ان کی فضیلتِ علمی اور استعداد و قابلیت سے آگاہ اور اس کا معترف تھا تخت نشین ہوا تو انتہائی اصرار سے یہ خدمت ان کے سپرد کی، اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے یہ خدمت نہایت دیانت و خوبی سے انجام دی۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

حق ایں منصبِ نازک نوعے کہ باید بہ تقدیم رساند

حق یہ ہے کہ اس نازک منصب کی ذمہ داریوں کو خوب نبایا۔

مفتی نور الحق زیادہ عرصہ اس منصبِ شاہی سے وابستہ نہیں رہے انھوں نے زندگی کا بہت بڑا حصہ باپ کی جگہ مسندِ درس پر ہی گزارا۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی وفات کے بعد منصبِ قضا سے دست کش ہو گئے تھے اور زمامِ تدریس ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس سلسلے میں عملِ صالح کے الفاظ ہیں:

پس از رحلتِ آں جناب، نور الحق خلف الصدق قش کہ در علم و فضل شہرہ آفاق بود، مدت مدید صدر آرائے مدرسہ استفادہ گشتہ۔

شیخ محدث کی وفات کے بعد ان کے خلف الصدق مفتی نور الحق، جو علم و فضل میں شہرۂ آفاق تھے، طویل مدت تک مسندِ درس پر فائز رہ کر لوگوں کو مستفید فرماتے رہے۔

شیخ محدث کو اپنے اس عظیم فرزند سے انتہائی محبت تھی اور وہ مختلف مجالس اور خطوط میں اس کا اکثر اظہار بھی کرتے تھے، وہ انھیں اپنے "وجودِ ثانی" سے تعبیر کرتے اور ان کے علم و فضل کے مداح تھے۔

مفتی نور الحق کو تصنیف و تالیف سے بہت دلچسپی تھی۔ مندرجہ ذیل کتابیں

ن کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

تیسیر القاری شرح صحیح البخاری۔ یہ شرح فارسی میں لکھی اور اورنگ زیب عالم گیر کے نام سے منسوب کی۔ ۱۲۹۸ھ میں مطبع علوی محمد علی حسن خاں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی، شرح شمائل ترمذی، تفسیر سورۃ الفاتحہ، حاشیہ علی شرح الجامی، شرح عضدی، شرح مطالع الانوار، شرح ہدایۃ الحکمۃ، شرح قران السعدین، رسالہ دربیان رویا، محی القلوب، زبدۃ التواریخ، ایک رسالہ تشہد میں انگشت شہادت اٹھانے کے بارے میں ہے۔

فرحت الناظرین میں ہے کہ شیخ نورالحق دہلوی نے صحیح بخاری کی مکمل شرح لکھی اور احادیث کی مشکلات اور پیچیدگیوں کو حل کیا۔ امام ابوحنیفہ کے مذہب (حنفی) کی تقویت کے لیے انھوں نے بہت کوشش اور جدوجہد کی اور اس مذہب کی مخالف احادیث کی مستحسن تاویلات فرمائیں۔

مفتی نورالحق شاعر بھی تھے اور مشرقی تخلص کرتے تھے۔ فرحت الناظرین کی روایت کے مطابق انھوں نے تحفۃ العراقین کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی، اور ایک دیوان بھی تھا جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ یہ مثنوی اور دیوان اب دست یاب نہیں ہیں۔

اس جلیل القدر ہندی عالم و فقیہ اور شیخ و محدث نے ۹ شوال ۱۰۷۳ھ کو نوّے (۹۰) سال کی عمر پاکر داعی اجل کو لبیک کہا اور دہلی میں اپنے باپ کے احاطۂ قبرستان میں دفن ہوئے[1]

---

[1] عمل صالح، ج ۳، ص ۲۹۶ — مآثر الکرام دفتر اول، ص ۱۸۸، ۱۸۹ — فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۶۸ تا ۷۱ — حدائق الحنفیہ، ص ۴۱۸ — سبحۃ المرجان، ص ۵۳ — ابجد العلوم، ص ۹۰۱ — خزینۃ الاصفیا، ص ۹۸۹ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۶ — اتحاف النبلا، ص ۴۲۶، ۴۲۷ — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۵۷ تا ۲۶۱ — تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۳۱۱ تا ۳۱۳ — قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب، ص ۱۹۸ ۔

۱۶۴- شیخ نور محمد سہارن پوری

شیخ نور محمد بن محمود انصاری سہارن پوری، سہارن پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ شیخ عزیز اللہ بن رکن الدین گنگوہی سے علم فقہ کی تحصیل کی۔ عالم و فقیہ اور صالح بزرگ تھے۔

۲۰ ربیع الاوّل ۱۰۹۱ھ کو ان کا انتقال ہوا [۵۸]

۱۶۵- شیخ نور محمد جون پوری

شیخ نور محمد بن نصیر الدین انصاری جون پوری، جمعۃ المبارک کی رات ۱۷ / جمادی الاخریٰ ۹۷۵ھ کو پیدا ہوئے، سنِ رشد کو پہنچے تو اپنے والدِ گرامی شیخ نصیر الدین انصاری جون پوری (متوفی ۴ جمادی الاخریٰ ۱۰۲۶ھ) اور دیگر علما سے اخذِ علم کیا۔ تاآنکہ بلند علمی مرتبے کو پہنچے اور قرأت و تجوید میں کمال حاصل کیا۔ فقہ میں بھی مہارت پیدا کی اور جون پور میں زاویۂ شیخ بدیع الدین کی مسجد میں خطابت پر مامور ہوئے۔

شیخ نور محمد طریقت میں سلسلۂ مداریہ سے منسلک تھے، خطابت و سلوک کے علاوہ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ صاحبِ رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری نے ان سے کافیہ کے کچھ سبق پڑھے تھے۔

شیخ نور محمد تقریباً پچاسی سال کی عمر پا کر ۲۹ رجب ۱۰۵۹ھ کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے [۵۹]

---

۵۸ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۲۸ بحوالہ مرآۃ جہان نما

۵۹ تجلی نور، ج ۲، ص ۶۰ — تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۲۳، ۲۴ — نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۴۲۸ بحوالہ گنج ارشدی

۱۶۶- شیخ نور محمد پٹنی

شیخ نور محمد حنفی نقشبندی پٹنی، ہندوستان کے شہر پٹنہ کے رہنے والے تھے، بہت بڑے عالم و فقیہ اور صاحبِ فضل و صلاح تھے۔

وقت کے معروف اساتذہ سے اخذِ علم کیا۔ کشورِ ہند کے متعدد خدا دوست حضرات سے ملے اور بلند مرتبت مشائخ امجاد سے مستفیض ہوئے۔ بعد میں حضرت مجدد الف ثانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے اور اذکار و اشغال اور تصوف و معرفت کے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ حضرت مجدد نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور واپس وطن پٹنہ جانے کی اجازت فرمائی۔ انھوں نے دریائے گنگا کے کنارے سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں ایک مسجد تعمیر کر لی تھی۔ ان سے بہت سے اہم لوگوں نے استفاضہ کیا۔[۱۰]

---

[۱۰] زبدۃ المقامات، ص ۳۵۱ تا ۳۵۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۲۹

و

۱۶۷۔ مفتی وجیہ الدین گوپاموی

مفتی وجیہ الدین بن عیسیٰ بن آدم بن محمد صدیقی گوپاموی، شیخ جعفر بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی کی اولاد سے تھے۔ ممتاز عالم، تیز ذہن اور صاف دل بزرگ تھے، تقریر نہایت عمدہ کرتے تھے، علم معانی و بیان میں اپنے دور کے عدیم المثال عالم تھے۔ ولادت یک شنبہ کے روز ۲ رجب ۱۰۰۵ھ کو اودھ کے مشہور مرکزِ علم گوپامئو میں ہوئی۔ اپنے جدِّ امجد شیخ جعفر اور دیگر علمائے عصر سے تعلیم حاصل کی، علم و تحقیق کی گود میں پرورش پائی اور تصوف و طریقت کے ماحول میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ان کے والد مفتی عیسیٰ بن آدم گوپاموی (متوفی ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۲۳ھ) بہت بڑے عالم اور گوپامئو کی مسندِ افتا پر فائز تھے، اور دورِ جہاں گیری کے نامور عالم تھے۔ والد کی وفات کے بعد یہ مسندِ افتا ان کے حصے میں آئی۔ ان کے دادا شیخ آدم بن محمد صدیقی گوپاموی (متوفی ۱۰۰۱ھ) بھی گوپامئو کے مفتی تھے اور ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے شیخ عیسیٰ اس منصب پر متعین ہوئے تھے۔

مفتی وجیہ الدین صدیقی گوپاموی کی وسعتِ فکر و نظر اور علمِ فقہ میں عبور کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت میں شامل تھے، انھوں نے فتاویٰ عالم گیری کے چوتھے حصے کی تکمیل کی، یہ اہم خدمتِ علمی انجام دینے کے لیے دس فقہائے کرام ان کے زیرِ نگرانی کام کرتے تھے۔

مفتی وجیہ الدین نے اشاعتِ علم کی غرض سے اپنے وطن گوپامئو میں سلسلۂ درس شروع کر رکھا تھا، جس میں دور دراز سے شائقینِ علم استفادے کے لیے آتے تھے، جن حضرات نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، ان میں شیخ محمد آفاق لکھنوی (متوفی ۲۲ ربیع الثانی ۱۰۸۹ھ)، قاضی عصمت اللہ بن عبدالقادر فاروقی اور

دیگر بے شمار اہلِ علم شامل ہیں۔

فتاویٰ عالم گیری کی تدوین و تالیف میں شرکت کے علاوہ مفتی ممدوح نے اور بھی کئی تصنیفی کام کیے، مثلاً حصن حصین کی شرح، خیالی اور مطول پر حواشی و تعلیقات، تصوف و سلوک سے متعلق رسائل حلقۂ اہلِ علم میں مشہور ہیں۔۔۔ علوم میں علمِ معانی اور علم بیان میں خصوصاً درک حاصل تھا۔ اس کی شہادت میں فرحت الناظرین کے یہ الفاظ قابلِ ذکر ہیں:

خصوصاً در علمِ معانی و بیان عدیم المثال عصر بود۔

علم معانی اور بیان میں بالخصوص اپنے وقت کے بے مثال عالم تھے۔

فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے جو محنت کی اس کا ثبوت "معارف" [اعظم گڑھ] کی مندرجہ ذیل عبارت سے مل سکتا ہے۔ مرقوم ہے:

"زمخشری کی قسطاس" کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش خاں لائبریری (پٹنہ) کا لکھا ہوا موجود ہے، اس پر شیخ وجیہ الدین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت ہے۔ کاتب اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے:

"عبارت منقول از دستخط مولانا وجیہ الدین رئیس علمائے فتاویٰ عالم گیری"

عبارت کا یہ آخری ٹکڑا واضح کرتا ہے کہ فتاویٰ عالم گیری کی تالیف میں مفتی وجیہ الدین گوپاموی کا بہت بڑا حصہ تھا اور وہ اس میں کوئی ممتاز حیثیت رکھتے تھے، اگرچہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

یہ بزرگ خاندانی لحاظ سے صاحب افتا تھے، ان کے والد شیخ عیلی بھی مفتی تھے جو اپنے والد مفتی آدم کی وفات کے بعد مسندِ افتا پر فائز ہوئے تھے۔ کچھ دن دارا شکوہ کے مقربین میں بھی شامل رہے۔ جلوس عالم گیری کے نویں سال عالم گیر کے حضور پہنچے اور منصب سے سرفراز ہوئے ۔۔۔ ۵ جمادی الاخریٰ ۱۰۸۳ھ کو دہلی میں وفات پائی اور اپنے اصل وطن گوپامئو میں دفن کیے گئے۔[۱]

---

[۱] فرحت الناظرین، ص ۸۵ ۔۔۔ فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۱۳۱ تا ۱۳۴ ۔۔۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۳۰، ۴۳۱ ۔۔۔ "معارف" (اعظم گڑھ) دسمبر ۱۹۴۶ء

ھ

۱۶۸۔ سید ہدایت اللہ حسنی نصیر آبادی

سید ہدایت اللہ بن اسحاق بن معظم بن احمد بن محمود بن علا حسینی نصیر آبادی، نصیر آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے بڑے بھائی سید احمد بن اسحاق حسینی نصیر آبادی (متوفی ۱۰۸۸ھ) سے اخذِ علم کیا، طویل عرصہ ان کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ فقہ، اصول اور علومِ عربیہ میں ماہر کامل ہوئے۔

سید ہدایت اللہ نصیر آبادی، سید قطب الدین محمد بن احمد حسنی مدنی کی اولاد سے تھے اور اپنے وقت کے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ صاحبِ نزہۃ الخواطر علامہ سید عبد الحی حسنی لکھنوی اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ میرا (سید عبد الحی حسنی) کا سلسلۂ نسب سات واسطوں سے سید ہدایت اللہ تک پہنچتا ہے۔ انھوں نے سید ہدایت اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قلمی رسالہ بھی دیکھا ہے جو خراج کے موضوع سے متعلق تھا[1]

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۳۳

ی

۱۶۹- شیخ یٰسین بنارسی

شیخ یٰسین کا سلسلۂ نسب یہ ہے: یٰسین بن احمد بن محمد بن عبدالرحیم بن اوحدالدین صدیقی جون پوری ثم بنارسی، ۱۰۲۲ھ کو نواحِ بنارس کے ایک گاؤں "منڈواڈیہ" میں پیدا ہوئے اور شیخ طیّب بن معین بنارسی (متوفی ۸ شوال ۱۰۴۲ھ) کی مہدِ علم و تصوف میں تربیت پائی۔ صرف، نحو (ارشاد تک) اور فقہ (کنز تک) ان سے کتابیں پڑھیں۔ پھر جون پور چلے گئے، وہاں سات یا آٹھ سال مقیم رہے۔ اس عرصے میں جون پور کے دو اعاظم رجال — شیخ محمد افضل جون پوری (متوفی ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ) اور شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۹ رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ) — سے نحو، منطق، فلسفہ، فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ شیخ محمد رشید جون پوری سے سندِ حدیث بھی حاصل کی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۲۳ ربیع الثانی ۱۰۵۲ھ) کے فرزندِ کبیر مفتی نورالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۷۳ھ) سے بھی حدیث کی سند لی۔ حتیٰ کہ اپنے وقت کے عالم و فقیہ ہوئے۔

بعدازاں شیخ طیّب کی خدمت میں گئے اور ان سے وابستگی اختیار کی اور ذکر و تلقین کا درس لیا۔ شیخ طیب نے ۱۰۴۰ھ میں انھیں وثیقۂ خلافت لکھ کر دیا اور موضع "کوڑہ" جانے کو کہا۔ کوڑہ جاکر بھی حصولِ علم میں مشغول رہے، وہاں شیخ جمال اولیا گوروی (متوفی ۲۹ رمضان ۱۰۴۷ھ) سے ہدایہ کے کچھ حصے اور تفسیر بیضاوی کا درس لیا۔ پھر منڈواڈیہ کو معاودت فرمائی لیکن ان کے شیخ اور استاذ شیخ طیّب وہاں پہنچنے سے پہلے وفات پاچکے تھے — تمام عمر افادہ و عبادت میں صرف کر دی اور بے شمار مشائخ و علما کو مستفید فرمایا[۱]۔

---

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۳۴ بحوالہ گنج ارشدی

۱۷۰- مولانا یتیم اللہ احمد نگری

مولانا یتیم اللہ بن جمال بن حسین حسنی حسینی قادری احمد نگری، شیخ عبدالوہاب بن شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد سے تھے۔ مقامِ ولادت اعمالِ احمد نگر کا ایک گاؤں "پہتری" ہے، تربیت بھی وہیں پائی، کبار اساتذہ سے علم حاصل کیا اور عالم و فقیہ ہوئے۔ ان کے والد بھی عالمِ دین تھے اور درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ حصولِ علم کے بعد مولانا یتیم اللہ نے بھی باپ کی جگہ یہی سلسلہ شروع کیا۔ "گلزار ابرار" کے مصنف شیخ محمد بن حسن غوثی ۱۰۰۳ھ کو احمد آباد میں ان سے ملے تھے۔ اس کے پانچ سال بعد ۱۰۰۸ھ یا ۱۰۰۹ھ میں فوت ہوئے۔[۵۲]

۱۷۱- میر سید یحییٰ بلگرامی

میر سید یحییٰ بن عبدالواحد بن ابراہیم بن قطب الدین حسینی بلگرامی کی ولادت ۲ ذی القعدہ ۹۸۵ھ کو ہوئی اور علم و معرفت کے ماحول میں پرورش پائی۔ اپنے والد گرامی میر سید عبدالواحد بلگرامی (متوفی ۳ رمضان المبارک ۱۰۱۷ھ) سے علم حاصل کیا اور فضل و کمال کو پہنچے، پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اپنے وقت کے شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ نیک، متقی، زاہد و عابد، قانع اور متوکل علی اللہ تھے۔ قرآن مجید کے حافظ تھے۔ تلاوت اس انداز سے کرتے کہ سامعین پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ انسانی شکل میں فرشتہ تھے، دنیا اور اس کے مال و اسباب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ سلوک و طریقت سے متعلق ایک کتاب "میزان الاعمال و معیار الاحوال" کے نام سے تصنیف کی۔ بلگرام میں فوت ہوئے اور اپنے باپ میر سید عبدالواحد بلگرامی کے قریب دفن کیے گئے۔[۵۳]

۵۲- اذکارِ ابرار، ص ۲۳۱ بضمن یادِ شیخ جمال بھکری — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۳۵

۵۳- مآثر الکرام، ص ۴۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۳۸

۱۷۲۔ شیخ یعقوب صرفی کشمیری

مولانا یعقوب بن شیخ حسن صرفی کشمیری گنائی عاصمی، خطۂ کشمیر کے عالم کبیر ممتاز شیخ اور نہایت فاضل بزرگ تھے۔ ۹۰۸ھ کو کشمیر میں پیدا ہوئے۔ فطانت و فراست اور زیرکی و بزرگی کے آثار صغرسنی ہی میں ہویدا تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآنِ مجید حفظ کر لیا تھا۔ حصولِ علم کے لیے اپنے دَور کے جلیل القدر علما کی خدمت میں حاضری دی۔ صَرف و نحو اور فقہ کی کتابیں مولانا رضی الدین کشمیری سے پڑھیں۔ منطق، فلسفہ و حکمت اور معانی و بیان کا علم شیخ بصیر الدین سے حاصل کیا اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ شعر و عروض کے لیے مولانا عبدالرحمٰن جامی کے شاگرد شیخ محمد آنی سے استفادہ کیا۔ حصولِ علم کے بعد اخذِ طریقت کا شوق پیدا ہوا، اور سمرقند کی راہ لی، وہاں شیخ حسین خوارزمی کے حلقۂ طریقت میں داخل ہوئے اور کچھ عرصہ ان کے پاس مقیم رہے۔ پھر واپس اپنے وطن کشمیر آ گئے اور سلسلۂ تدریس شروع کیا۔ اس کے بعد عازمِ حجاز ہوئے اور سعادتِ حج حاصل کی، مدینہ منورہ گئے۔ حجاز کے علمائے عظام سے استفادہ کیا اور شیخ ابنِ حجر ہیثمی مکّی سے کتبِ حدیث کا درس لیا۔ حجازِ مقدس سے بغداد کا عزم فرمایا اور وہاں کے مشائخِ کرام سے مستفیض ہوئے۔ بغداد سے اپنے وطن کشمیر آئے اور طویل مدت تک کشمیر میں اقامت گزین رہے۔ اس اثنا میں بہت سے علما و طلبا کو مستفید فرمایا۔ دوبارہ پھر دل میں سفرِ حجاز کے شوق نے کروٹ لی اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ حجاز سے واپسی پر تفسیر، حدیث اور فقہ کی بہت سی نفیس کتابیں ساتھ لائے، اور انھیں علمائے کشمیر میں مروّج کیا۔ اب کشمیر میں باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا اور بے شمار تشنگانِ علوم کی علمی تشنگی بجھائی۔ اکابر و اعاظم رجالِ ہند میں سے جو حضرات ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے، ان میں حضرت شیخ مجدد الف ثانی کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔

شیخ یعقوب صرفی کشمیری گیارھویں صدی ہجری کے بہت بڑے ہندی عالم تھے، اور تمام اصنافِ علوم، تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، علوم عربیہ، فلسفہ و حکمت، معانی و بیان اور صرف و نحو پر کامل عبور رکھتے تھے۔ عظیم المرتبت مصنف بھی تھے۔ یہ کتابیں ان کی تصنیفات میں شامل ہیں: تفسیر قرآنِ حکیم جو نامکمل رہی، شرح صحیح بخاری، مغازی النبوۃ، حاشیہ توضیح و تلویح، مسلک الاخیار، کتاب مناسکِ حج، روائح، وامق و عذرا، رسالہ اذکار، لیلیٰ مجنوں، مقاماتِ مرشد، مولانا عبدالرحمٰن جامی کی جواہر خمسہ کا جواب، شرح رباعیات وغیرہ۔

عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں مولانا یعقوب کی شخصیت اور علم و فضل کی بہت تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ہمایوں بادشاہ اور شہنشاہ جلال الدین اکبر کو ان سے بڑی عقیدت تھی، ان دونوں بادشاہوں سے ان کو گفتگو اور مصاحبت کا شرف حاصل تھا۔ اکبر کے تو بڑے منظورِ نظر اور مکرم و محترم تھے، طبعاً فیاض اور ایثار پیشہ تھے۔

شیخ یعقوب صرفی شاعر بھی تھے، لیکن بدایونی اپنے خاص انداز سے ان کی شعر گوئی پر بڑی میٹھی اور تیکھی تنقید کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں: ان کے مرتبے کے لحاظ سے شعر گوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی لیکن اس وادی میں بھی ان کا عمل دخل تھا۔

بہر حال شیخ یعقوب صرفی دورِ اکبری کے علمائے عظام میں سے تھے اور جامعیتِ علم کی بنا پر ہر طبقے کے اہلِ علم میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ خود شاہِ ہند جلال الدین اکبر ان کی بہت تکریم کرتا تھا۔ عبدالقادر بدایونی سے ان کو خاص تعلقِ خاطر تھا، انھوں نے بدایونی کے نام چند خط بھی لکھے، جو منتخب التواریخ میں درج ہیں۔ بدایونی بھی ان کی بہت توصیف کرتے اور احترام سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ جس زمانے میں شیخ یعقوب صرفی حجاز سے واپس کشمیر پہنچے، وہاں شیعہ سنی جھگڑے زوروں پر تھے۔ جب یعقوب چک نے قاضی

موسیٰ کو شیعہ طریقے سے خطبہ نہ پڑھنے پر شہید کرادیا اور اہلِ سنت کے لیے حالات بہت ناسازگار ہوگئے، تو شیخ یعقوب، بابا داؤد کو ساتھ لے کر اکبر کے پاس لاہور پہنچے اور کشمیری عوام کی طرف سے دعوت حملہ دی اکبر تو اس موقع کا پہلے سے منتظر تھا۔ اس نے اپنی فوجیں بھیجیں اور اکتوبر ۱۵۸۶ء کو کشمیر مملکتِ مغلیہ کا حصہ ہوگیا۔

اس کے آگے وہ لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد اکبر اور شیخ کے درمیان خاص روابط استوار ہوجانا عجب نہیں۔

اکرام صاحب مزید رقم طراز ہیں کہ "شیعہ سُنی مسئلے پر شیخ یعقوب کے جو شدید احساسات تھے، اس کا اندازہ ان اقدامات سے ہوسکتا ہے جو انھوں نے قاضی موسیٰ کی شہادت پر شروع کیے۔ لیکن اس کی مثالیں اس سے پہلے بھی ملتی ہیں۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد اپنی کتاب "پاکستان میں فارسی ادب" (جلد اوّل) میں لکھتے ہیں کہ شیخ یعقوب صرفی کے سری نگر میں ایک استاذ تھے، ملّا بصیر، بڑے بڑے صاحبِ عظمت بزرگ ان کے حلقۂ تلمذ میں شریک تھے۔ مثلاً شیخ داؤد خاکی۔ لوگوں نے مشہور کیا کہ ملّا بصیر بھی مائل بہ تشیّع ہیں، تو شیخ صرفی ان کے مدرسے سے اُٹھ آئے۔"

مجدد الف ثانی، شیخ یعقوب صرفی کے تلمیذ تھے اور وہ شیعہ کے مخالف تھے۔ انھوں نے "رَدِّ روافض" ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ اس ضمن میں شیخ محمد اکرام مرحوم بطور استفسار تحریر فرماتے ہیں کہ "کیا (حضرت مجدد میں) اس نقطۂ نظر کے پیدا کرنے یا اسے تقویت دینے میں ان (حضرت مجدد) کے مرشد اور استاذ شیخ یعقوب صرفی کا اثر بھی کارفرما تھا؟"[۵۴]

بہرحال شیخ یعقوب صرفی اپنے دَور کے جلیل القدر عالم اور عظیم فقیہ تھے۔

[۵۴] رودِ کوثر، ص ۲۲۵، ۲۲۶

انھوں نے پنجشنبہ کے روز، بعد نمازِ عشا، ۱۲ ذی القعدہ ۱۰۰۳ھ کو وفات پائی [۵]

۱۷۳۔ قاضی یوسف بلگرامی

قاضی یوسف بن ابوالمکارم بن ابوالفتح بن عبدالدائم عثمانی بلگرامی کا مولد بلگرام ہے۔ بڑے ہوئے تو کچھ عرصہ تک اپنے شہر بلگرام ہی میں حصولِ علم میں مصروف رہے، بعد ازاں عازمِ الٰہ آباد ہوئے اور شیخ محب اللہ الہ آبادی سے کتبِ درسیہ پڑھیں۔ اپنے دَور کے عالم و فقیہ تھے۔ قاضی یوسف کے والد قاضی ابوالمکارم بلدۂ بلگرام کے عہدۂ قضا پر متعین تھے۔ والد کی وفات کے بعد شاہ جہان کے نویں سالِ جلوس میں قاضی یوسف کو ان کی جگہ قاضی بنایا گیا۔ دارا شکوہ نے سولہ سوالوں پر مشتمل ایک رسالہ لکھ کر شیخ محب اللہ آبادی کو بھیجا تھا، اس کا جواب عربی اور فارسی میں قاضی یوسف بلگرامی نے رسالے کی شکل میں تحریر کیا اور اس کا نام "ہدیۃ السلطانیہ" رکھا۔

قاضی یوسف بلگرامی نے ۵ ذی القعدہ ۱۰۸۴ھ کو بلگرام میں وفات پائی [۶]

۱۷۴۔ مولانا یوسف لاہوری

مولانا یوسف لاہوری، حنفی المسلک تھے، عالمِ کبیر اور علامۂ عصر تھے۔ ہمیشہ مصروفِ عمل رہتے۔ کثرتِ درس و افادہ، وعظ و تذکیر، صلاح و تقویٰ اور تفسیر و توضیحِ مسائل میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ مولانا جمال الدین تلوی لاہوری کے تلمیذ تھے۔ بادشاہ نامہ میں عبدالحمید لاہوری لکھتے ہیں کہ پچاس سال تک لاہور

---

[۵] منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۱۴۲ تا ۱۴۹ ــــ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۱۰، ۱۱۱ ــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۵۵ ــــ حدائق الحنفیہ، ص ۳۹۴، ۳۹۵ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۳۸، ۴۳۹

[۶] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۴۰، ۴۴۱۔ بحوالہ شرائف عثمانی

میں سرگرمِ تدریس رہے۔ (قریب پنجاہ سال با فادہ پرداخت) پچاس سال کی اس طویل مدت میں لاتعداد علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ تفسیرِ قرآن، حلوِ کلام اور حسنِ بیان میں بے مثال تھے۔ حسنِ اخلاق اور حسنِ سیرت کے زیور سے آراستہ تھے۔ علومِ عقلیہ و نقلیہ میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ شاہ جہان کے عہد میں اسّی سال عمر پاکر فوت ہوئے۔

مرآۃ العالم کی روایت کے مطابق اوائل عمر میں کچھ عرصے تک خدمتِ سلطانیہ کو ترجیح دیتے رہے، لیکن بعد کو یہ سلسلہ ترک کر دیا تھا اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر درس و افادہ کو مطمحِ نظر ٹھہرا لیا تھا۔ اس خدمتِ علمی کے لیے انھوں نے مرکزِ علم لاہور کو منتخب فرمایا۔ بارہ سال یہ خدمت انجام دی، اس اثنا میں بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا، جن میں شیخ عبداللطیف سلطان پوری اور علامی سعداللہ خاں وزیر کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں [۷]۔

۱۷۵۔ مفتی یوسف کاشمیری

مفتی یوسف کشمیری، مفتی یوسف چچک کے نام سے معروف تھے۔ بے مثال عالم اور بے نظیر فقیہ تھے۔ مباحثہ و معارضہ میں ایسے تیز اور حاضر جواب کہ کوئی انھیں زیر نہ کر سکا۔ اُس دَور کے علما میں سے ملّا فاضل اور ملّا عبدالرزاق کشمیری بالخصوص ان کے علمی کمال کے معترف تھے اور کسی بحث میں انھیں مغلوب نہ کر سکتے تھے۔ اکثر خواجہ خاوند محمود بخاری کشمیری کی خدمت و صحبت میں رہتے اور ان سے دقائقِ علم فقہ اور مشکلاتِ تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں استفادہ کرتے۔ فقرا و مشائخ سے بڑی محبت سے پیش آتے۔ نہایت

---

[۷] بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۳۴۲ —— فرحت الناظرین (شخصیات)، ص ۲۰۷ —— نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۱۔

تواضع اور انکسار سے ملتے اور ان کی خدمت کو بڑی سعادت سمجھتے۔

مفتی یوسف چچک کے فرزند ملا عبدالنبی تھے، وہ بھی اپنے وقت میں دیارِ کشمیر کے فقیہ اور جلیل القدر عالم تھے[۸]

۱۷۶۔ مولانا یونس کردی

مولانا یونس بن ابو یونس حسینی کردی، گیارھویں صدی ہجری میں کشورِ ہند کے فحول علما میں سے تھے۔ محدث و فقیہ تھے۔ ہمیشہ حدیث، فقہ اور فنونِ عربیہ کے درس و تدریس میں مشغول رہتے، زہد و قناعت اور اتباعِ سنت میں مرتبۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ اپنے وطن کرڑہ سے کالپی منتقل ہوگئے تھے۔ سید محمد بن ابو سعید حسینی ترمذی نے مطول تک ان سے درسی کتابیں پڑھیں اور حدیث کی سند حاصل کی[۹]

---

[۸] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۴۸ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۵۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۴۱، ۴۴۲

[۹] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۴۲ بحوالہ ضیاء محمدی

ایک گزارش

"فقہائے ہند" کی جلد چہارم کا حصہ اوّل جو گزشتہ سال (۱۳۹۷ھ / ۱۹۷۷ء میں) شائع ہوا، گیارھویں صدی ہجری کے برصغیر کے ایک سو چھبیس ۱۲۶ فقہا و علما کے حالات پر مشتمل ہے، اسی جلد کا حصہ دوم جو قارئین کرام کے زیرِ مطالعہ ہے، ایک سو چھہتر ۱۷۶ فقہائے عظام کی زندگی کے واقعات و کوائف کو محیط ہے۔ یعنی کتاب کے ان دونوں حصوں میں گیارھویں صدی ہجری کے تین سو دو ۳۰۲ علما و فقہا کے سوانحِ حیات اور ان کے علمی و فقہی کارنامے مندرج ہیں۔ معلومات کے اخذ و اندراج میں حتی الوسع حزم و احتیاط سے کام لیا گیا ہے — بعض بزرگوں کے حالات کچھ زیادہ ملے ہیں اور بعض کے کم دست یاب ہوئے ہیں، جو کچھ کتب تذکرہ و رجال نے بہم پہنچایا، خاص ترتیب کے ساتھ حوالۂ قرطاس کر دیا گیا۔

یہ اس موضوع کا نقشِ اوّل ہے، جسے بہرحال مکمل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تحقیق و کاوش کے دروازے کبھی بند نہیں ہوئے، ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور اہلِ تحقیق کی دور رس نگاہیں، واقعات کی تلاش میں مصروف رہتی ہیں۔ اگر اس سلسلے میں کسی صاحبِ علم کو زیادہ معلومات حاصل ہوں یا انھیں کسی معاملے میں اختلاف ہو تو مطلع فرمائیں، ہم ان کے شکر گزار ہوں گے اور ان کے مشورے سے ان کے حوالے کے ساتھ استفادہ کریں گے۔ یہ کام خالص جذبۂ خدمتِ دین کے تحت کیا جا رہا ہے، اس میں اہلِ علم کا تعاون نہایت ضروری ہے۔

اس کے بعد ان شاء اللہ "فقہائے ہند" کی جلد پنجم پیش کی جائے گی جو بارھویں صدی ہجری کے علما و فقہا کے حالات کو محیط ہو گی — معزز قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے اس خدمتِ دین کی تکمیل

کی دعا فرمائیں — اللہ سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ اس ادنیٰ خدمت کو شرف قبولیت بخشے اور اس بندۂ عاجز کے لیے اُسے توشۂ آخرت بنائے ۔ اٰمین یا ارحم الراحمین ۔!

اللّٰھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا و اجرنا من خزی الدنیا و عذاب الاخرۃ — و اٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین و الصلوٰۃ والسلام علیٰ عبدہ و رسولہ محمد خاتم النبیین و شفیع المذنبین و علیٰ اٰلہ وصحبہ الاکرمین ۔

مراجع و مصادر

فقہائے ہند جلد چہارم حصہ دوم کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱- آئینِ اکبری : ابو الفضل - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۸۹۳ء

۲- آثارِ بدایوں : حافظ فضل اکبر بدایونی - وکٹوریہ پریس، بدایوں - ۱۹۱۵ء

۳- ابجد العلوم : نواب صدیق حسن خاں - مطبع صدیقیہ، بھوپال - ۱۲۹۵ھ

۴- اتحاف النبلا : نواب صدیق حسن خاں - مطبع نظامی، کان پور - ۱۲۸۸ھ

۵- اخبار الاخیار : شیخ عبدالحق محدث دہلوی - مطبع مجتبائی، دہلی - ۱۳۳۲ھ

۶- اخبار الصنادید : حکیم نجم الغنی رام پوری - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۹۱۸ء

۷- ادبیاتِ سرحد : رضا ہمدانی - نیا مکتبہ، پشاور - ۱۹۵۳ء

۸- ادبیاتِ سرحد : فارغ بخاری - نیا مکتبہ، پشاور - ۱۹۵۵ء

۹- اذکارِ ابرار : (ترجمہ گلزارِ ابرار) تصنیف، محمد غوثی شطاری مانڈوی - ترجمہ فضل احمد جیوری، مطبع مفید عام، آگرہ - ۱۳۲۶ھ

۱۰- اذکار الابرار : شاہ محمد تقی حیدر - شاہی پریس، لکھنؤ - ۱۳۵۷ھ

۱۱- الاعلام : خیر الدین زرکلی -

۱۲- الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام : مفتی قطب الدین محمد نہروالی المکی - لیزگ، بروکلیس - ۱۸۵۹ء

۱۳- اقبال نامہ جہاں گیری : مرزا محمد عرف معتمد خاں بخشی - نول کشور، لکھنؤ

۱۴- اکبر اینڈ دی جیوئٹس : سی، ایچ، پین - طبع لندن - ۱۹۲۶ء

۱۵- اکبر نامہ : ابو الفضل - مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ

۱۶- انسان العین فی مشائخ الحرمین : شاہ ولی اللہ محدث دہلوی - مطبع احمدی، دہلی -

۱۷- انفاس العارفین : شاہ ولی اللہ محدث دہلوی - مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء

۱۸- انوار العارفین : حافظ محمد حسین مراد آبادی - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۸۷۶ء

۱۹- ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون : اسماعیل پاشا - مطبع بہیہ، استنبول ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۵ء

۲۰- بادشاہ نامہ : عبد الحمید لاہوری - مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ - ۱۸۶۷- ۱۸۷۲ء

۲۱- البدر الطالع : امام محمد بن علی شوکانی - طبع قاہرہ، مصر - ۱۳۴۸ھ

۲۲- برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ : محمد اسحاق بھٹی - ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور - ۱۹۷۳ء

۲۳- برہان پور کے سندھی اولیا المعروف بہ تذکرہ اولیائے سندھ : سید محمد مطیع اللہ راشد برہان پوری - سندھی ادبی بورڈ، کراچی - طبع اول - ۱۹۵۷ء

۲۴- بزم تیموریہ : سید صباح الدین عبد الرحمٰن - دار المصنفین، اعظم گڑھ -

۲۵- بوستان اخبار : سعید احمد مارہروی - مطبوعہ آگرہ - ۱۳۳۱ھ

۲۶- التاج المکلل : نواب صدیق حسن خاں - المطبعۃ الہندیۃ العربیہ - بمبئی - طبع ثانی - ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء

۲۷- تاریخ برہان پور : خلیل الرحمٰن برہان پوری - مطبع مجتبائی، دہلی - ۱۳۱۷ھ

۲۸- تاریخ برہان مآثر : سید علی طباطبائی - ناشر مجلس مخطوطات فارسیہ، حیدر آباد، دکن - مطبع جامعہ، دہلی - ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء

۲۹- تاریخ تحفۃ الکرام : جلد اول، دوم، سوم، مطبع حسینی اثنا عشری، محلہ فراش خانہ، وزیر گنج، لاہور - ۱۳۰۴ھ و مطبع ناصری -

۳۰- تاریخ شیراز ہند جون پور : سید اقبال حسین - ادارہ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس، جون پور - ۱۹۶۳ء

۳۱- تاریخ طاہری : سید طاہر محمد نسیانی ٹھٹھوی - سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد، سندھ - ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء

۳۲- تاریخ کشمیر اعظمی : خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری - ناشر، غلام محمد نور محمد، تاجرانِ کتب سری نگر- ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء

۳۳- تاریخ مشاہیرِ چشت : خلیق احمد نظامی - ندوۃ المصنفین، دہلی- ۱۹۵۳ء

۳۴- تاریخ معصومی : میر محمد معصوم بھکری - سندھی ادبی بورڈ، کراچی - ۱۹۵۹

۳۵- تاریخ النوائط : نواب عزیز جنگ بہادر - مطبوعہ عزیز المطابع حیدر آباد، دکن- ۱۳۲۲ھ-

۳۶- تجلی نور المعروف بہ تذکرہ مشاہیر جون پور : نور الدین زیدی - مطبع اعظم المطابع، جون پور- ۱۸۸۹ء

۳۷- تحفۃ الکرام : میر علی شیر قانع - سندھی ادبی بورڈ، کراچی - ۱۹۵۹ء

۳۸- تحقیقاتِ چشتی : نور احمد چشتی - پنجابی ادبی اکیڈیمی، لاہور- ۱۹۶۴ء

۳۹- تذکرہ : مولانا ابو الکلام آزاد- مکتبہ احباب، لاہور

۴۰- تذکرۃ الابرار والاشرار : حضرت اخون درویزہ- ادارہ اشاعتِ سرحد، قصہ خوانی بازار، پشاور-

۴۱- تذکرہ صوفیائے سندھ : اعجاز الحق قدوسی- اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی- ۱۹۵۹ء

۴۲- تذکرہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی : سید احمد قادری- ناشر شاہ بک ڈپو، پٹنہ-

۴۳- تذکرۃ العلماء والمشائخ : محمد الدین فوق- گلزار محمدیہ اسٹیم پریس، لاہور- ۱۳۲۸ھ/۱۹۲۰ء

۴۴- تذکرہ علمائے ہند : مولوی رحمان علی- مطبع نول کشور، لکھنؤ- ۱۹۱۴ء

۴۵- تذکرہ مشائخ بنارس : ابو الاثر عبد السلام - ندوۃ المعارف، بنارس- ۱۳۷۱ھ

۴۶- تذکرہ مشاہیر کاکوری : محمد علی حیدر- مطبع اصح المطابع، لکھنؤ- ۱۹۲۷ء

۴۷- تذکرہ مؤرخین : نبی احمد سندیلوی - مطبع سلیمانی، بنارس- ۱۹۲۴ء

۴۸- ترخاں نامہ : سید میر محمد بن سید جلال ٹھٹھوی- سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد سندھ- ۱۹۶۴ء

۴۹- تزکِ جہانگیری : مطبع نامی، منشی نول کشور، لکھنؤ - ۱۹۱۴ء

۵۰- تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار : نواب صدیق حسن خاں- مطبع شاہ جہانی، بھوپال- ۱۲۹۸ھ

۵۱- "ثقافت" ماہ نامہ لاہور- جواب "المعارف" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ ادارہ

ثقافت اسلامیہ کا ترجمان ہے) بابت ماہ اپریل اور جون ۱۹۶۷ء

۵۲- الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند : سید عبدالحی حسنی لکھنوی- مطبوعہ دمشق- ۱۹۵۸ء

۵۳- جہاں گیر نامہ : خواجہ ابوالحسن- مطبع نامی منشی نول کشور، لکھنؤ- ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء

۵۴- حدائق الحنفیہ : مولوی فقیر محمد جہلمی- مطبع نول کشور، لکھنؤ- ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء

۵۵- حدیقۃ الاولیا : مفتی غلام سرور لاہوری- مطبع نول کشور، لکھنؤ- ۱۸۷۷ء

۵۶- حیات العلما : سید عبدالباقی سہسوانی- مطبع نول کشور، لکھنؤ- ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء

۵۷- حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی : خلیق احمد نظامی- ندوۃ المصنفین، دہلی- ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء

۵۸- خزانۂ عامرہ : غلام علی آزاد بلگرامی- مطبع نول کشور، لکھنؤ- ۱۹۱۴ء

۵۹- خزینۃ الاصفیا : مفتی غلام سرور لاہوری- مطبع نامی گرامی سراج پنڈت دیج ناتھ الموسوم بہ ثمر ہند، لکھنؤ- ۱۲۹۰ھ

۶۰- خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر : محمد امین بن فضل اللہ المحبی- مکتبہ خیاط، بیروت، لبنان-

۶۱- خلاصۃ التواریخ : لالہ سجان رائے بٹالوی- بہ تصحیح ظفر احسن- مطبع جی اینڈ سنز، دہلی- ۱۹۱۸ء

۶۲- دربار اکبری : محمد حسین آزاد- دارالاشاعت پنجاب- مطبع رفاہ عام، لاہور- ۱۸۹۸ء

۶۳- دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی : ابن حسن، ترجمہ، عبدالغنی نیازی- مجلس ترقی ادب، لاہور- ۱۹۵۸ء

۶۴- دہلی اور اس کے اطراف : سید عبدالحی حسنی لکھنوی- انجمن ترقی اردو، دہلی- ۱۹۵۸ء

۶۵- ذخیرۃ الخوانین : شیخ فرید بھکری- مقدمہ و تصحیح ڈاکٹر سید معین الحق- پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی-

۶۶- "الراعی" ہفت روزہ، لاہور، بابت ۱۹۴۳ء- مضمون پروفیسر علم الدین سالک مرحوم-

۶۷- الرسالۃ الخاقانیہ : پروفیسر امین اللہ وثیر- اورینٹل کالج میگزین، لاہور- فروری ۱۹۶۵ء

۶۸- رقعات ابوالفضل : مطبع نول کشور، لکھنؤ-

۶۹- رقعات عالم گیری : مطبع نول کشور، لکھنؤ- ۱۹۲۴ء

۷۰- رودِ کوثر : ڈاکٹر شیخ محمد اکرام - ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور - ۱۹۷۵ء

۷۱- روضۃ الاولیا : غلام علی آزاد بلگرامی - مطبع اعجاز صفدری - حیدر آباد، دکن - ۱۳۰۱ھ

۷۲- زبدۃ المقامات : خواجہ محمد ہاشم کشمی - مطبع نول کشور، کان پور - طبع اوّل - ۱۸۹۰ء

۷۳- سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان : غلام علی آزاد بلگرامی - طبع بمبئی - ۱۳۰۳ھ

۷۴- سروِ آزاد : غلام علی آزاد بلگرامی - مطبع مفید عام، آگرہ - ۱۹۱۰ء

۷۵- سفینۃ الاولیا : دارا شکوہ - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۸۸۴ء

۷۶- سوانح عبدالحکیم سیالکوٹی : محمد الدین فوق - برقی پریس، لاہور - ۱۹۲۴ء

۷۷- سیاحتِ ہند : حافظ عبدالرحمٰن امرتسری - مطبوعہ رفاہِ عام پریس، لاہور - ۱۹۰۹ء

۷۸- سید احمد شہید : غلام رسول مہر - کتاب منزل، لاہور - ۱۹۵۴ء

۷۹- سیرت سید احمد شہید : ابوالحسن علی ندوی -

۸۰- سیر الاولیا : محمد مبارک علوی معروف بہ امیر خرد کرمانی - مطبع محبِ ہند، دہلی - ۱۳۰۲ھ

۸۱- سیر المتاخرین : غلام حسین خاں طباطبائی - نول کشور، لکھنؤ -

۸۲- شذرات الذہب : ابوالفلاح عبدالحی بن العماد حنبلی - طبع قاہرہ، مصر - ۱۳۵۱ھ

۸۳- صحیح بخاری : امام محمد بن اسماعیل - طبع کراچی

۸۴- طبقاتِ اکبری : نظام الدین ہروی - طابع نول کشور - مطبع گرامی قدر اودھ اخبار، لکھنؤ - ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء

۸۵- طرب الاماثل بتراجم الافاضل : مولانا ابوالحسنات عبدالحی حسنی لکھنوی - مطبع یوسفی، لکھنؤ - ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء

۸۶- عالمگیر نامہ : منشی محمد کاظم بن محمد امین - کالج پریس، کلکتہ - ۱۸۶۸ء

۸۷- علمائے ہند کا شاندار ماضی : مولانا محمد میاں - مطبوعہ دہلی -

۸۸- عمل صالح (الموسوم بہ شاہ جہان) : محمد صالح کمبو (جلد اول و دوم، طبع دوم - ۱۹۶۷ء - جلد سوم، طبع دوم - ۱۹۷۲ء)

۸۹- عہدِ اسلامی کا ہندوستان : ریاست علی ندوی - ادارۃ المصنفین، پٹنہ - ۱۹۵۰ء

۹۰- عہدِ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے فرامین و اسناد : مطبوعہ ہند، ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء

۹۱- فتح الباری شرح صحیح بخاری : جلد۹، حافظ ابنِ حجر عسقلانی- طبع مصر

۹۲- فرحت الناظرین (شخصیات) : محمد اسلم پسروری - ترجمہ و ترتیب، محمد ایوب قادری، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی - ۱۹۷۲ء

۹۳- فقہائے ہند جلد سوم : محمد اسحاق بھٹی - ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور - ۱۹۷۶ء

۹۴- الفوائد البھیہ فی تراجم الحنفیہ : مولانا ابو الحسنات عبدالحی حنفی لکھنوی، مطبوعہ مصر، طبع اوّل - ۱۳۲۴ھ

۹۵- قاموس الاعلام : شمس اللہ قادری - حیدر آباد، دکن - ۱۹۳۵ء

۹۶- قاموس المشاہیر : جلد اوّل، دوم، سوم، نظام الدین حسین نظامی بدایونی نظامی پریس، بدایوں - ۱۹۲۴ء — ۱۹۲۶ء

۹۷- قصار الارب من ذکر علماء النحو والادب : ذوالفقار احمد - مطبع فیض منبع مفید عام، آگرہ - ۱۳۱۶ھ

۹۸- کشف الظنون : جلد اوّل، ثانی، حاجی خلیفہ - مطبع بہیہ، استنبول - ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء

۹۹- گجرات کی تمدنی تاریخ : سید ابوظفر ندوی - دار المصنفین اعظم گڑھ - ۱۹۶۲ء

۱۰۰- گلزارِ اولیا : مظفر حسین - مطبع سبحانی، حیدر آباد، دکن - ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء

۱۰۱- لطائف قدوسی : (ملفوظات شیخ عبدالقدوس گنگوہی) مرتب، شیخ رکن الدین گنگوہی - مطبع مجتبائی، دہلی - ۱۳۱۱ھ

۱۰۲- مآثر الامرا : جلد اوّل، دوم، سوم، صمصام الدولہ شاہ نواز خاں - ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ - ۱۸۸۸ء — ۱۸۹۰ء

۱۰۳- مآثر رحیمی : جلد اوّل، دوم، سوم، ملا عبدالباقی نہاوندی - ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ - ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء، ۱۹۳۱ء

۱۰۴- مآثر عالم گیری : محمد ساقی الملقب بہ مستعد خاں - ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ -

۱۰۵- مآثر الکرام : (دفتر اوّل) غلام علی آزاد بلگرامی - مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ، لاہور - ۱۹۷۱ء

۱۰۶- مرآت احمدی : مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خاں بہادر، مطبوعہ کلکتہ - ۱۹۲۷ء

۱۰۷- مرآت العالم : بختاور خاں (قلمی نسخہ) پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور -

۱۰۸- المسوّیٰ شرح موطا : شاہ ولی اللہ محدث دہلوی - طبع دہلی -

۱۰۹- مشاہیرِ کشمیر : منشی محمد الدین فوق - کریمی پریس - لاہور

۱۱۰- مشکوٰۃ المصابیح : ولی الدین - طبع کراچی

۱۱۱- "معارف" (ماہ نامہ) اعظم گڑھ - بابت ماہ جون ۱۹۴۷ء

۱۱۲- "المعارف" (ماہ نامہ) لاہور - بابت ماہ جون ۱۹۷۰ء

۱۱۳- معجم المؤلفین : عمر رضا کحالہ - مطبعۃ الترقی، دمشق - ۱۹۵۷ء

۱۱۴- مفتاح التواریخ : منشی دانشور - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۲۸۴ھ

۱۱۵- منتخب التواریخ : جلد اوّل، دوم، سوم، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ -
۱۸۶۸ء --- نیز دیکھیے، مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ - ۱۲۸۴ھ

۱۱۶- منتخب اللباب : جلد اوّل، دوم، محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں - ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ - ۱۸۶۹ء

۱۱۷- مؤرخین ہند : شمس اللہ قادری - تاریخ آفس - حیدر آباد، دکن - ۱۹۳۳ء

۱۱۸- موضوعات الکبیر : ملا علی قاری حنفی ہروی - مطبع مجتبائی، دہلی - ۱۳۱۵ھ

۱۱۹- موطا : امام مالک - کتب خانہ دار الاشاعت، کراچی - ۱۹۷۱ء

۱۲۰- نجات الرشید : عبد القادر بدایونی - مقدمہ و حواشی، ڈاکٹر سید معین الحق - ادارہ تحقیقاتِ پاکستان دانش گاہِ پنجاب، لاہور - ۱۹۷۲ء

۱۲۱- نجوم السماء فی تذکرۃ العلماء : مرزا محمد علی - مطبع جعفری لکھنؤ - چاپ عکسی آفسٹ، طبع قم - ۱۳۹۶ھ

۱۲۲- نزہۃ الخواطر : (جلد پنجم) سید عبد الحی حسنی لکھنوی - دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، دکن - ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء

۱۲۳- نگارستانِ فارس : محمد حسین آزاد - آزاد بک ڈپو، لاہور - ۱۹۲۲ء

۱۲۴- النور السافر فی اخبار القرن العاشر : عبدالقادر بن عبداللہ العیدروس- المکتبۃ العربیہ، بغداد- مطبعۃ الفرات، بغداد- ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۴ء

۱۲۵- واقعاتِ دارالحکومت دہلی : (حصہ اول) بشیر الدین احمد دہلوی- شمسی مشین پریس، آگرہ- ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء

۱۲۶- ہدیۃ العارفین فی اسماء المؤلفین و آثار المصنفین : اسماعیل پاشا بغدادی- مطبع بہیہ، استنبول- ۱۹۵۱ء- ۱۹۵۵ء

۱۲۷- ہفت اقلیم : جلد اول، دوم، سوم- امین احمد رازی- تصحیح و تعلیق: جواد فاضل- مطبوعہ تہران-

۱۲۸- ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر: سید صباح الدین عبدالرحمٰن- دارالمصنفین، اعظم گڑھ- ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء

۱۲۹- یادِ ایام : سید عبدالحی حسنی لکھنوی- مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ- ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء

۱۳۰- الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی : محمد بن یحیٰی المدعو بہ محسن تمیمی ثم بکسری- طبع ہند-

---

اسی مصنف کے قلم سے

فقہائے ہند (جلد اول)

یہ کتاب پہلی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کے فقہائے ہند کے حالات پر مشتمل ہے - اس دور کے سلاطین و ملوک اور علمائے کرام کے درمیان ربط و تعلق کی بھی وضاحت کی گئی ہے -

فقہائے ہند (جلد دوم)

اس میں نویں دسویں ہجری کے فقہائے پاک و ہند کے حالات و سوانح بیان کیے گئے ہیں اور ان کی علمی و فقہی خدمات کی وضاحت کی گئی ہے - نیز اس دور کے ملوک و سلاطین کے علمی و دینی پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے -

فقہائے ہند (جلد سوم)

اس میں بر صغیر پاک و ہند کے دسویں صدی ہجری کے فقہائے کرام کے حالات معرض تحریر میں لائے گئے ہیں - اس صدی کے ان ملوک و سلاطین کے علمی پہلوؤں کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے جو دہلی ، آگرہ ، گجرات ، دکن ، سندھ ، بنگال ، کشمیر اور مالوہ وغیرہ مختلف علاقوں میں داد حکم رانی دیتے رہے - فقہائے کرام اور والیان مملکت کے باہمی تعلقات کی بھی نشان دہی کی گئی ہے -

فقہائے ہند (جلد چہارم ، حصہ اول)

اس میں گیارھویں صدی ہجری کے علما و فقہا کی علمی ، فقہی ، تدریسی اور تصنیفی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے - برصغیر میں یہ شہنشاہ جلال الدین اکبر کا عہد ہے - مقدمہ کتاب میں اکبر کے مذہبی افکار کا تفصیل جائزہ لیا گیا ہے - ہندوستان کا یہ بڑا ہی زرخیز

...ت اسلامیہ

...ور

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام (مرحوم) کی تصانیف

آبِ کوثر

اس کتاب میں سرزمین پاک و ہند میں اسلام کی آمد (۷۱۱ء) اور فتحِ سندھ یعنی محمد بن قاسم سے لے کر خاندان لودھی تک (۱۵۲۶ء) کے عہد بعہد حالات بیان کیے گئے ہیں۔ آٹھ سو سال کے اس طویل عرصے میں برصغیر پاک و ہند میں جو علما و فقہا اور صوفیہ و اولیا پیدا ہوئے اور انھوں نے جو خدمات انجام دیں اس کتاب میں ان کا مفصل تذکرہ ہے۔ پھر ان ادوار کے ملوک و سلاطین سے ان کے تعلقات و مراسم کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

رودِ کوثر

اس میں عہدِ مغلیہ سے لے کر سرزمینِ برصغیر پاک و ہند پر انگریزوں کے قابض ہونے تک کے واقعات معرض تحریر میں لائے گئے ہیں۔ ہر مغل حکم ران کے عہد میں علما و مشائخ اور صوفیہ نے جو خدمات انجام دیں اور ان سے جو نتائج برآمد ہوئے، ان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

موجِ کوثر

اس میں مسلمانانِ برصغیر کی ان علمی اور فکری مساعی کو اُجاگر کیا گیا ہے جو انھوں نے انگریزی حکومت کی گرفت میں آنے کے بعد مختلف انداز میں انجام دیں۔ اس سلسلے میں حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقائے عظام کی تحریک جہاد، سید احمد خاں کی تعلیمی کاوشوں، جامعہ ملیہ کے قیام، ندوۃ العلما کی تاسیس اور دار العلوم دیوبند کے علمی کارناموں کو خصوصیت سے بیان کیا گیا ہے۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور مولانا عبید اللہ سندھی اور دیگر علما و زعما کی علمی تگ و تاز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔